DUE DATE

Cl. No. ____________ *Acc. No.* ____________

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

محکمہ تعلیم ریاست رام پور کا آرگن۔

ماہنامہ

تعلیم جدید

مدیر

مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے۔ بی ٹی (علیگ)

تعلیم جدید رامپور

جلد ۱ ماہ فروری سنہ ۱۹۴۶ء نمبر ۲

فہرست مضامین

استادوں سے خطاب

کتابوں کی دنیا۔

محکمۂ تعلیم کے پیش نظر ایک بچوں کا کتب خانہ قائم کرنے کی تجویز ہے جس کی تکمیل امید ہے بہت جلد ہو جائیگی اس لئے میں تعلیم جدید کی اس اشاعت میں اپنے ایک مضمون کا کچھ حصہ شائع کرتا ہوں جو کتابوں کے متعلق ہے۔ اس میں روئے سخن استادوں کی طرف ہے اور ادب اور زندگی کے رشتے سے بحث کی گئی ہے کسی تعلیم یافتہ شخص کا بھی ادب سے بے بہرہ ہونا ایک سخت محرومی ہے۔ لیکن کسی استاد کا ادب اور کتاب سے (جو ادب کا خزانہ ہے) بے تعلق رہنا ایک ناقابل معافی جرم ہے! کیوں؟ اس مضمون میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

میرے اس مضمون کا عنوان ہے "کتابوں کی دنیا" اور میں چاہتا ہوں کہ استادوں اور ان کے ذریعہ بچوں کی توجہ کتابوں کی اس اہم، دل کش، گوناگوں اور وسیع دنیا کی طرف مبذول کروں جو اُن کے چاروں طرف موجود ہے جس سے استفید ہونے کی صلاحیت بھی ان میں خوابیدہ ہے لیکن وہ اپنی ناواقفیت یا ذہنی سستی یا کم ذوقی کی وجہ سے اس میں داخل نہیں ہوتے۔ مجھے اپنی منصبی حیثیت میں اکثر طلبا سے ملاقات کرنے اور انکی ذہنی زندگی کو ٹٹولنے کا موقع ملتا ہے اور مجھے ہمیشہ اس بات پر از سر نو افسوس اور تعجب ہوا کرتا ہے کہ وہ باوجود سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے کے کتابوں کی دنیا سے کس قدر ناواقف اور بے نیاز رہتے ہیں! ان میں سے اکثر کے نزدیک کتاب امتحان پاس کرنے کا ایک ناگوار لیکن ناگزیر ذریعہ ہے اور بس۔ اس لئے تعلیم کے زمانے میں بھی اس کو منہ لگانا درست نہیں اور جب امتحان کی کٹھن منزل طے ہو جائے تو اس سے رشتہ قطع کر لینا جائز ہے! مجھے بارہا ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایسے سند یافتہ نوجوانوں سے سابقہ پڑا ہے جن کو کالج سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے اقتصادی نظام کی ابتری اور بد نظمی کی وجہ سے کئی کئی سال تک بے کار رہنا پڑا۔ لیکن اُنھوں نے اس جبری فرصت سے اتنا فائدہ بھی نہ اٹھایا کہ وہ اس زمانے میں کتابوں کی دنیا کی سیر کرتے اور اس طرح اپنے دل اور دماغ میں وسعت اور روشنی پیدا کرتے جو شاید ان کی آئندہ زندگی میں مفید ہوتی۔ مگر میرے خیال میں اس میں قصور صرف ان طلبہ کا ہی نہیں۔ بلکہ ہمارے تعلیمی نظام اور نظام اقتصاد و معاشرت کا بھی ہے۔ جب امتحان ذہنی قابلیت اور دماغی جودت کے بجائے بعض مقررہ نصابی معلومات کی جانچ کرتا ہے تو ایک اوسط طالب علم کے لئے

مشکل ہے کہ وہ تخلیقی کتابوں کو بازاری نوٹوں پر ترجیح دے۔ اس کے لئے جس خوش مذاقی اور علمی پیاس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اس کے پاس کہاں؟ جب علم کو نہ علم کی خاطر نہ حاصل کیا جائے۔ نہ زندگی کی خاطر بلکہ محض نوکری حاصل کرنے کے لئے ایک پاسپورٹ بن جائے تو علم و حکمت کا سراغ لگانے کے لئے راتوں کو چراغ کون جلائے گا؟ اس صورت میں زیادہ امکان تو یہی ہے کہ طلبہ امتحان کے قریب چند مہینوں میں دماغ کو ایک گودام کی طرح سطحی معلومات سے بھر لیں گے اور جب امتحان ایک اندھے خریدار کی طرح آئے گا۔ تو یہ اپنے گودام میں سے جو کچھ رطب و یابس ہوگا نکال کر اس کے سامنے پیش کر دیں گے! اور کامیابی کے لئے تقدیر اور امتحان کے معیار کی کمی پر بھروسہ کریں گے! لہٰذا محض طلبہ پر الزام لگانا درست نہیں۔ اس کی ذمہ داری ان تمام چیزوں پر ہے جنہوں نے موجودہ صورت حال کے بنانے میں حصہ لیا ہے۔

کیا ہماری تعلیم یافتہ جماعت کی حالت اس اعتبار سے ہمارے طلبہ سے بہتر ہے؟ کاش میں اس سوال کا جواب اثبات میں دے سکتا! لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتاب نے اس جماعت کی زندگی میں بھی کوئی شایان شان مقام حاصل نہیں کیا۔ اور یہ ہوتا بھی کیسے جب وہ اس ذہنی عادت اور ذوق کے غلام ہیں۔ جو انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں سیکھے تھے۔ ان میں سے بہت بڑی تعداد تو ایسے لوگوں کی ہے جو دنیا کے مکروہات میں اسیر ہو کر کبھی کتاب اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں اور کبھی اس طرف خیال کیا جاتا ہے تو وہ یہ سوچتے ہیں کہ زندگی کی عملی جد و جہد ان کی پوری توجہ اور کوشش کی طالب ہے اور کتابوں کا پڑھنا وقت کا ضائع کرنا ہے! ان کی مثال تو قرآن شریف کے الفاظ میں ایسی ہے کہ "ان کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ دل ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ وہ حیوانوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر"، کیونکہ حیوان کم از کم کفران نعمت کے مرتکب نہیں ہوتے! بعض لوگ ایسے ضرور ہیں، جو کتابیں پڑھتے ہیں لیکن ان کے لئے کتابیں پڑھنا محض دل بہلانے یا وقت گزارنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جس طرح وہ تاش کھیل کر یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ کر کے زندگی کی یکسانیت اور بے رنگی کو بھلانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح عام طور پر گھٹیا قسم کی کتابیں پڑھ کے وہ کتابوں کی دنیا میں واقعی دنیا سے بھاگ کر پناہ لیتے ہیں لیکن ان لوگوں کو در اصل ادب اور ادبی ذوق سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کی مثال تو ایسی ہے گویا وہ سمندر کے کنارے بیٹھے ساحل کے سنگ ریزوں سے کھیل رہے ہیں۔ ان جواہر سے بے خبر جو سمندر کی آغوش میں آسودہ ہیں! بلکہ یہ تشبیہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ یہ مقولہ تو نیوٹن کا ہے جس میں وہ عجز تھا جو علم کی گہرائی سے پیدا ہوتا ہے اور ہمارے طلبہ اور تعلیم یافتہ احباب کی علم و ادب سے بے اعتنائی اور بے نیازی جہالت اور بد ذوقی کا نتیجہ ہے۔ البتہ ایک بہت مختصر سی جماعت ایسے لوگوں کی ہے۔ جنہوں نے ادب کی واقعی اہمیت کو

سمجھا ہے اور اس کی خدمت اور مطالعہ ہی کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیا ہے شاید یہی لوگ ہیں جو ادب کے اصلی لطف سے واقف ہیں اور جو ادب ناشناس بدبختوں کو خطاب کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

لیکن ظاہر ہے کہ اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے اور حجاب میں پردہ ساز کو دیکھنے کے لئے نوا ہائے راز کا محرم ہونا ضروری ہے!

آیئے! اب ذرا دیکھیں کہ ادب کی زندگی میں کیا اہمیت ہے؟ اس کا جواب پہلے ایک انگریز نقاد کی زبان سے سُن لیجئے۔ ادبیں اس کی سند اس وجہ سے پیش کرتا ہوں۔ کہ انگریز طبعاً بہت محتاط واقع ہوئے ہیں اور عموماً اظہار رائے میں شاعرانہ جوش کے بجائے ضبط اور اعتدال پسندی سے کام لیتے ہیں۔ اسکی رائے کو سن کر آپ کو اندازہ ہوگا۔ کہ ادب کو تفریح کا ذریعہ اور ذوقِ ادب کو محض ہمی شائستگی کا لازمہ سمجھنا کتنی بڑی غلطی ہے!

"ادب زندگی میں ایک آرائشی اضافے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ زندگی کی تکمیل اور بڑائی کے لئے ایک شرط لازم ہے یہ کوئی مبالغہ یا استعارہ نہیں۔ بلکہ حقیقت ہے کہ جس شخص کو ادب کی مملکت میں ایک آزاد شہری کے حقوق حاصل نہیں ہیں وہ گویا اپنی پیدائش سے پہلے کی نیند سے بیدار ابھی نہیں ہوا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ دراصل ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ وہ نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے، نہ پوری طرح محسوس کر سکتا ہے وہ تو محض حیوانوں کی طرح دو وقت کھانا کھا سکتا ہے۔ جو لوگ ادب کے صحیح مقام سے واقف ہیں وہ اس کے مطالعہ سے اپنی زندگی کو روشن اور مالا مال کر چکے ہیں ان کو یہ دیکھ کر بے اندازہ کوفت ہوتی ہے کہ لاکھوں ادب سے ناآشنا لوگ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ وہ زندہ ہیں حالانکہ درحقیقت وہ اتنے ہی زندہ ہیں کہ جتنا ایک ریچھ جاڑے کے موسم میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ نقاد اس سوال سے بحث کرتا ہے کہ ادب کے بنانے والے کون لوگ ہوتے ہیں اور ان میں اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہے۔

ادب کے بنانے والے وہ ہیں جنہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ عالم کائنات کس قدر حیرت انگیز دلچسپیوں سے پُر ہے ادب کے سب سے بڑے خلاق وہ ہیں جن کی نظر دوسروں سے زیادہ وسیع اور احساس دوسروں سے زیادہ شدید ہے ان کی تمام زندگی اس الزام کی ایک مسلسل اور وجد آفریں تردید ہے کہ دنیا ایک بے رنگ اور غیر دلچسپ جگہ ہے کیا تمہارے لئے اس حقیقت کا علم کہ دنیا بے رنگ و کیف نہیں کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ کیا تمہارے لئے یہ بات بے معنی ہے کہ تمہیں ایک تنگ و تاریک سرنگ سے نکال کر پہاڑ کی بلندی پر کھڑا کر دیا جائے۔ جہاں تمہارے سب حواس زیادہ حساس ہو جائیں۔ جہاں زندگی کی

حرارت تم میں ایک نیا جوش اور امنگ پیدا کردے اور تمہارے دل کی حرکت زیادہ تیز ہوجائے ؟

ادبی مطالعہ کا مقصد فرصت کے وقت کا بہلانا نہیں۔ بلکہ زندگی کے شعلے کو روشن کرنا، سوئی ہوئی خودی کو بیدار کرنا اور اپنی لطف اندوزی، انسانی ہمدردی اور سمجھداری کی صلاحیت کو تیز کرنا ہے۔ اس کا اثر دن کے ایک خاص گھنٹہ تک محدود نہیں بلکہ پورے چوبیس گھنٹے پر پھیلا ہوتا ہے کیونکہ ادب انسان کا رشتہ اس کی دنیا سے بالکل ہی بدل دیتا ہے اگر ہم میں ادب کا صحیح ذوق پیدا ہوجائے تو اس کی بدولت دنیا کو ایک نئی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے لگتے ہیں اور زندگی جو منتشر ٹکڑوں میں منقسم ہوچکی ہے ایک مربوط اور ہم آہنگ کل بن جاتی ہے۔ ادب کی روح فصل کے وصل پیدا کرتی ہے وہ شے کا تجزیہ کرنے سے جو ترقی ہوتا ہے اور کلی نسخہ ہوتا ہے دنیا میں حقیقت کو منکشف کرتی ہے کہ کل کا حسن جزو میں بھی جلوہ فگن ہے۔ یہ روح ادب ہمیں دو طرح سے تسکین پہنچاتی ہے ایک طرف تو وہ خلاف توقع (فطرت) کے حسن نادیدہ کو بے نقاب کرتی ہے اور دوسری طرف اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ سب انسان ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ادب اول و آخر کمال زندگی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور ذوق ادب کی تربیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس ذریعہ کا بہترین استعمال کر سکیں۔ ہاں جو لوگ "زندگی" کے طالب نہیں اور شدت احساس پر حالت خواب کو ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کے لئے تو یہی مناسب ہوگا کہ وہ ادب کی طرف رُخ نہ کریں۔ بلکہ (بقول شخصے) آرام سے بیٹھے ہوئے بیر کھائیں! (کیونکہ اندیشہ ہے کہ) جب وہ ادب کے آئینے میں ایک معمولی سی جھاڑی کو کوہ طور کی طرح نور خدا سے روشن دیکھیں گے۔ شاید ان کے اعصاب ہی خراب ہوجائیں۔

تعلیمی مضامین

تصویر کا تاریک رُخ

مضمون نمبر ۱

آپ میں اکثر و بیشتر پروفیسر میر تجمل حسین صاحب مرحوم کی ذاتِ گرامی سے واقف ہوں گے مرحوم ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی روح رواں تھے۔ غیر معمولی علمی استعداد کے علاوہ جو صفتیں خداداد تھیں ان میں سے غریب نوازی کی صفت ایسی تھی جو ان کے نام نامی کو عرصہ دراز تک صفحہ ہستی پر قائم رکھیگی۔ کوئی حاجتمند طالب علم ایسا نہیں جو ان کے در سے ناکامیاب واپس ہوا ہو اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ایسے طلبا کی اکثریت ہے۔ حلقۂ احباب کے علاوہ غیروں میں بھی مرحوم کے خلوص، اُن کی جفاکشی اور علم دوستی کا چرچہ رہا۔ "تصویر کا تاریک رُخ" وہ مضمون ہے جو میر صاحب مرحوم نے ۱۸ یا ۱۹ سال قبل لکھا تھا جب موجودہ طرز تعلیم کے اکثر و بیشتر اجزا وجود میں نہ آئے تھے۔ مضمون پڑھتے آپ ہر لفظ میں تازگی پائیں گے آپ کو محسوس ہوگا کہ گویا مصنف ۱۹۴۶ء کے دور سے گزر رہا ہے اور اس کو ان تمام سائنٹفک ضروریات کا احساس ہے

جن کے ہمراہ پر آج کی اقوام نمو دے رہی ہیں۔ محبت سے نہیں بلکہ واقعہ کے طور پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ مرحوم مسائل تعلیم کے سلسلہ میں اعجازی قوت رکھتے تھے۔ جو کہا یا و پتھر کی لکیر ہو کر رہا۔ بہر حال "تصویر کا رُخ" آپ کے پیش نظر ہے ملاحظہ کیجئے اور فیصلہ کیجئے۔

اگر آپ اعلیٰ درجہ کے مدرسین کو چھوڑ کر عام مدرسین کی حالت کو بغور ملاحظہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ بیچارے نہایت ہی مسکین اور جفاکش مزدور ہیں جن کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ ان کے لباس و چہرے سے لاپروائی اور غربت ٹپکتی ہے وہ اکثر اپنی بے ڈھنگی روش اور تھکے لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے عام کاروبار میں ان کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ لوگوں کے مجمعوں میں وہ بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان کے مشاغل اکثر غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ جب ان ہی میں سے بہت سے افراد جب تک وہ اس پیشہ میں داخل نہ ہوئے تھے۔ خوش دل اور خوش باش نوجوان تھے وہ کیا اثرات ہیں جن کی وجہ سے مدرسی اختیار کرنے کے چند ہی سال بعد ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کے چہروں پر خوشی اور صحت کی جگہ غم اور غصہ کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور ان کے رویہ سے مردہ دلی اور بیچارگی ظاہر ہوتی ہے؟ ان کے ساتھی جو دوسرے پیشوں میں شامل ہوئے تھے اب بھی خوش اور زندہ دل نظر آتے ہیں دنیا کے کام کاج میں ان کا حصہ ہے۔ سوسائٹی کی زندگی میں وہ شریک ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسی میں ایسے افسردہ کن حالات کیا ہیں جنہوں نے ان بیچاروں کی زندگی کو ایک حد تک نکما کر دیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں اُس باب پر بحث کروں جو مدرس کی جسمانی صحت۔ مالی حالت اور ذہنی ترقی پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔

ا۔ شروع شروع میں نئے مدرس کو بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ نئے اسباق کی تیاری کرنا۔ مدرسہ میں چار پانچ گھنٹے سبق پڑھانا۔ طلبا کے کام کی نگرانی اور ان کے مضامین کو صحیح کرنا۔ کھیلوں میں شرکت اور ان کے انتظامات کو دیکھنا وغیرہ وغیرہ ایسے فرائض ہیں کہ ان میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے اور مدرس کو اپنے سر و پا تک کی خبر نہیں رہتی۔ اگر آپ جماعت کے کمرہ میں اسکو دیکھیں تو ہمیشہ مصروف پائیں گے۔ اس کی زبان کبھی بند نہیں ہوتی وہ کبھی ایک طرف جاتا ہے کبھی دوسری طرف کبھی لڑکوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کبھی تختہ سیاہ کی طرف دوڑتا ہے علاوہ بریں بعض نئے مدرس تعلیم دینے کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ طلبا کو کام کرنے کی بجائے وہ خود ہی سارا کام کریں چنانچہ وہ خود بہت محنت کرتے ہیں۔ ایک جماعت میں گھنٹہ بھر نہایت ہی جوش و خروش سے تقریر فرماتے ہیں۔ مطالب بیان کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوسرے گھنٹہ میں بھی یہی سلسلہ جاری رہتا ہے اور اکثر گھنٹوں یہی مصروفیت

رہتی ہے۔ خارجی اوقات میں بچوں کو پڑھا کر وہ اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کر لیتا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام دن رات میں اسے کوئی وقت ایسا انہیں ملتا کہ وہ اپنی ذات کی فکر کرے اور ریاضت جسمانی کے لئے کوئی وقت نکالے تاکہ صحت درست رہے لوگوں سے ملے جلے تاکہ ان کے حالات سے واقف ہو اور ان کے خیالات سے فائدہ اٹھائے۔ اخبار اور کتب کا مطالعہ کرے تاکہ اس کے علم میں اضافہ ہو اور زمانہ کی ترقی اور دنیا کے حالات سے آگاہ رہے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اگرچہ بعض اوقات مدرسین کو فرصت کا وقت بھی ملتا ہے۔ لیکن وہ ایسے لوگوں میں کام کرتے ہیں جن کی صحبت سے انہیں بہت کم فائدہ پہنچتا ہے اور زیادہ تر ایسے مقاموں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جہاں باہر کی خبر مشکل سے پہنچتی ہے وہاں نہ اخبار ملتے ہیں اور نہ کوئی لائبریری ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ان فرصت کے اوقات سے بھی جو میسر آتے ہیں پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ شہروں میں جہاں کسی حد تک یہ اسباب مہیا ہیں ان کو گذر اوقات کرنے کے لئے مدرسہ کے علاوہ بہت کام کرنا پڑتا ہے شہری زندگی زیادہ مہنگی ہوتی ہے اس لئے مدرسین کو اپنی قلیل تنخواہ میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کے لئے در در بچے پڑھانے کے لئے جانا ہوتا ہے اور گاؤں میں جہاں کچھ فرصت ہوتی ہے اس قسم کے اسباب موجود نہیں ہوتے اور ان کا وقت لاپروائی اور بیکاری کی نذر ہوتا ہے۔

۲۔ مدرسین سال بسال عموماً ایک ہی جماعت کو ایک مقررہ کتاب پڑھاتے رہتے ہیں۔ اور اس میں انہیں کوئی اعلیٰ قسم کا دماغی کام کرنا نہیں پڑتا۔ اور اگر ایک مضمون کی تکرار کرتے رہنے سے بالفرض طبیعت میں نفرت اور بدمزگی پیدا نہ بھی ہو تو یہ ضرور ہے کہ مدرسین کو اس مضمون میں ذرا بھی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ بچوں کو تعلیم دینے میں بعض خاص خاص باتوں کی تکرار بھی لازمی ہوتی ہے۔ کیونکہ بچوں کا علم محدود اور واقفیت بہت کم ہوتی ہے اور چونکہ ایسا کرنے میں مدرسین شاذ ہی کسی جدت کو دخل دیتے ہیں اس لئے ان کی ذہنی نشو و نما رک جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو باتیں مدرسین کو دہرانی پڑتی ہیں وہ ان کے لئے بہت آسان اور پیش افتادہ ہوتی ہیں اور وہ غلطی سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بچوں کے لئے بھی وہ ایسی ہی آسان ہیں۔ چنانچہ اگر بچے ان کے مطلب کو سمجھنے میں دیر کریں یا کچھ دنوں کے بعد بھول جائیں تو وہ اسے ان کی بے توجہی پر محمول کرنے لگتے ہیں اور خود غصہ کرتے ہیں اور بچوں کو مارنے پیٹنے لگتے ہیں۔ ایسا کرتے رہنے سے کچھ دنوں کے بعد ان کے چہرے پر غصہ اور ناراضگی کی ایک مستقل شکن پڑ جاتی ہے جس سے نہ صرف ان کی صورت ڈراونی بن جاتی ہے بلکہ ان کی جسمانی اور دماغی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

۳۔ اس کے علاوہ مدرسین کو زیادہ تر انہیں الفاظ اور مطالب کی تشریح کرنی پڑتی ہے جن سے وہ بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ ان تشریحات میں انہیں کوئی خاص ذہنی کاوش کرنی نہیں پڑتی اور رفتہ رفتہ انہیں ذہنی سستی کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے وہ دماغی محنت سے کترانے لگتے ہیں۔ اپنی واقفیت اور علم کے پرانے، زنگ آلود سرمایہ پر زندگی بسر کرتے ہیں اور عموماً ایک ہی پامال رستے پر پڑ جاتے ہیں اور یہ عادت ایسی پختہ ہو جاتی ہے کہ اپنے ہمسروں میں بھی ان کا طریق بیان وہی رہتا ہے اور وہ ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں جو بچوں کے مناسب حال ہوتی ہیں۔ چونکہ بچوں میں سدا ان کی بات مانی جاتی ہے اس لئے عادتاً وہ اپنی ہی بات منوانی چاہتے ہیں۔

۴۔ لوگ کہتے ہیں کہ معلمی شریف ترین پیشہ ہے مگر نہایت ہی گھاٹے کا بیوپار ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کاروبار سے کام کرنے والے کی گذر اوقات بھی اچھی طرح نہ ہو سکے تو شرافت ایسے کاروبار سے اٹھ جاتی ہے۔

۵ آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج ؛ احتیاج است احتیاج است احتیاج!

مدرسین کی تنخواہیں عموماً ایسی قلیل ہوتی ہیں کہ ان کا گذارہ بہت مشکل سے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسہ کے باہر بھی اکثر مدرسین کو استادی کرنی پڑتی ہے اور وہ فرصت کا وقت اپنی جسمانی اور ذہنی بہتری کے لئے صرف نہیں کر سکتے اور ہمیشہ کی احتیاج سے پریشاں حالی ان کے چہروں پر برسنے لگتی ہے۔ ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم گورنمنٹ کی طرف سے رائج کی گئی ہے اور چونکہ یہ گورنمنٹ غیروں کی ہے اس لئے لوگ مدرسین کو گورنمنٹ کا ملازم سمجھتے ہیں جو ان کے خیر خواہ نہیں بلکہ سرکار کے ایجنٹ ہیں۔ گورنمنٹ نے مدرسین کی تنخواہیں بہت تھوڑی مقرر کی ہیں۔ اس لئے بھی انہیں ذلیل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا معیار یہی ہے کہ سرکاری کام کی قدر کا اندازہ اس کی تنخواہ ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مدرسین کو سرکار نے جو کچھ بھی دیا ہے وہ اپنے نفع کے لئے بلکہ لوگوں کی بہبودی کی خاطر دیا ہے۔ بہرحال نتیجہ یہ ہے کہ لوگ مدرسین کو اپنے ساتھ نہیں سمجھتے۔ بلکہ تھوڑی سی تنخواہ پانے والا گھٹیا درجہ کا ملازم خیال کرتے ہیں۔ پھر لوگوں کو اس تعلیم کی چنداں قدر بھی نہیں ہے جو یہ مدرسین دیتے ہیں۔ چنانچہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک صاحب تعلیم سے فارغ ہو کر پروفیسر مقرر ہوئے۔ اپنے گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں کے ایک بڈھے نے پوچھا میاں نوکر ہو گئے؟ انھوں نے کہا جی ہاں۔ کیا نوکر ہوئے؟ کہا پروفیسر ہو گیا ہوں۔ بوڑھے نے پوچھا پروفیسر کسے کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بڑے مدرسے میں پڑھانے والے کو کہتے ہیں۔ بوڑھے نے کہا ہائے قسمت کیا پٹواری بھی نہ ہو سکے؟

۵۔ ہندوستان میں لڑکے اور لڑکی کی جلد از جلد شادی کرنا ماں باپ کا بہت ہی اہم فرض خیال کیا جاتا ہے۔ وہ جتنی جلد اس فرض سے سبکدوش ہوں۔ بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر جب بیٹا "نوکر" بھی ہو جائے تو کیوں دیر کی جائے۔ چنانچہ شادی بہت جلد ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ غریب لوگوں کے اولاد بہت جلد جلد ہوتی ہے۔ مدرس کیا کم غریب ہے کہ اس پر خدا کی رحمت نہ ہو! اب مدرس کو اپنی آمدنی بڑھانے کی اور زیادہ فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ آمدنی بڑھانے کا سب سے زیادہ آسان اور زود اثر طریقہ یہی ہے کہ بچوں کو پڑھائے۔ چنانچہ تمام وقت اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ اور لازماً اس کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے

۶۔ تنخواہوں کی قلت کے ساتھ ساتھ اور بھی خطرات لگے رہتے ہیں۔ سرکاری نوکری میں تنخواہ اگر کم ہے تو ہو مگر موسمی تعطیلات سے پہلے جواب ملنے کا ڈر نہیں ہوتا۔ مگر پرائیویٹ سکولوں میں بہت خطرے بھی رہتے ہیں جو اس کا خون خشک کئے دیتے ہیں۔ اگر ان خطرات کے باوجود استاد کامیاب بھی

ہو جائے تو پرائیوٹ سکولوں کی غیر معین آمدنی کی وجہ سے مستقبل کی بابت بے اطمینانی رہتی ہے ۔

۷ ۔ یہ کون نہیں مانتا کہ ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں نے مدرسین کی اور ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ ان تعلیم گاہوں میں استادوں کی شخصیت کی تربیت بہت کم کی گئی ہے ۔ عموماً ہر ایک شخص کو ایک ہی سانچہ میں ڈھالا جاتا ہے ۔ ان مدرسوں کا نظام اکثر کچھ فوجی طرز کا ہوتا ہے ۔ خیال اور عمل کی آزادی بہت کم دی جاتی ہے ۔ وہاں کبھی کوئی طریق تعلیم مرغوب ہوتا ہے کبھی کوئی ۔ اور اسی کو رواج دینے کی کوشش کی جاتی ہے خواہ اساتذہ کی طبیعت اور قابلیت اور مقامی حالات میں کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی طریقہ تعلیم بھی مدرس کا اپنا نہ ہوا بلکہ جس طریقہ کی سرکار سے ہدایت ہوئی وہی اختیار کر لیا ۔

نارمل اسکولوں اور ٹریننگ کالجوں میں خاص طریقے ایسے بتلائے گئے ہیں کہ ان کی پوری پوری پیروی کرائی گئی ہے ۔ اور بس ۔ اس نے نہ ان کے مقصد کو سمجھا نہ خود کسی طریق تعلیم کی بنا ڈالی یا اس کو آزمایا اور نہ قومی عادات و اخلاق اور ملکی رسم و رواج پر غور کیا کہ وہ فیصلہ کر سکے کہ ہمارے مناسب حال کیا چیز ہوگی ۔ جس طرح ٹریننگ کالجوں میں وہ حکم کے ماتحت کام کرتا تھا اسی طرح اب بھی اسے انسپکٹر صاحب کی منشا کے مطابق چلنے میں عافیت اور ترقی دکھائی دیتی ہے ۔ اور وہ ایک لکیر کا فقیر بن کر رہ جاتا ہے ۔ اول تو لائق من چلے اور حوصلہ مند نوجوان اس پیشے میں داخل ہونے سے پرہیز کرتے ہیں ۔ لیکن اگر کوئی شخص معلّمی کی اہمیت اور شرافت کو محسوس کرتے ہوئے اس میں داخل بھی ہو جاتا ہے تو اکثر چند ہی سال میں اس کی حالت ان اسباب کے زیر اثر دگرگوں ہو جاتی ہے اس کی صحت تباہ ۔ مالی حالت خراب اور ذہنی ترقی مسدود ہو جاتی ہے ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ بچوں کی عمدہ تعلیم اور تربیت کے ذریعہ قوم کا مستقبل شاندار بن سکتا ہے ۔ لیکن اگر ہمارے پیشہ کی حالت یہی رہی کہ چند دن کے بعد اپنی ہی صورت بگڑ جاتی ہے تو قوم کے مستقبل کی ذمہ داری لینا بے معنی ہے !

سید تجمل حسین

بچے کی تربیت پر خوف کے اثرات

از شوکت حسین صاحب ہیڈ ماسٹر بیسک ٹیچرس ٹریننگ اسکول رامپور

"ذیل میں ہم شوکت حسن صاحب ہیڈ ماسٹر ٹیچرس ٹریننگ اسکول رام پور کے مقالہ کا ایک حصہ درج کرتے ہیں۔ آپ اپنے شریر بچوں کی تربیت میں اس کا کیونکر تجربہ کریں گے۔ دلائل مضبوط اور قابل غور ہیں۔ طریقہ تعلیم میں چونکہ یہ مسئلہ بھی اچھی خاصی اہمیت رکھتا ہے اسلئے آپ اسے پڑھئے اور اگر اس کے کسی جزو سے اختلاف ہو تو بتلایئے۔"

مضمون نمبر ۲

ہماری جماعتی زندگی کا انداز ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ ہمارے بچوں میں خوف کا جذبہ شروع سے کچھ زیادہ ہوتا ہے جس زمانہ میں بچہ اپنے ہاتھ پیر اور زبان کے استعمال کرنے کے بھی قابل نہیں ہوتا اسی وقت سے ماں باپ بھوت، پلید، اور جن و پری کے خیالی نام لے لے کر اسکو خوف کا شکار بناتے رہتے ہیں۔ کبھی اس کی طفلانہ حرکتوں کو کسی جن کا بھیانک نام لیکر روک دیا جاتا ہے اور کبھی اسکی خواہشات کو کسی خیالی بھوت کا نام لیکر کچلنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ اگر کوئی بچہ فطری طور پر زیادہ دلیر ہوتا ہے تو اسکو خوف دلانے کے لئے بھوت کی مصنوعی شکل دکھائی جاتی ہے اور اس عمل کو اس وقت تک جاری رکھا جاتا ہے جب تک بچے کی فطری دلیری پر خوف کا غلبہ نہ ہوجاتا ہو لہذا جوں جوں بچہ بڑھتا ہے خوف و ہراس کا بیجا اثر اسکی طبیعت پر غالب آتا جاتا ہے۔ اندھیرے میں جانے سے اُسے خوف آتا ہے اور رات کے وقت گھر سے باہر نکلنا اس کے لئے محال ہوجاتا ہے تنہائی میں اپنا سایہ بھی اُسے جن و پری سے مشابہ نظر آتا ہے اور لطف یہ ہے کہ والدین اس خوف کی بیجا نشوونما میں ضرورت سے زیادہ امداد کرتے رہتے ہیں ان کے نزدیک شاید ڈرپوک بچے دلیر بچوں سے بہتر ہوتے ہیں۔

رہے وہ بچے جو فطرتاً دلیر ہوتے ہیں تو وہ نہ صرف ماں باپ کے بنائے ہوئے فرضی بھوت ہی سے مقابلہ کرتے ہیں بلکہ ظالم والدین ان کی پیدائشی جبلتوں اور فطری دلیری کو مار مار کر بھی مردہ کر دیتے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے ہندوستان کے عوام نشوونما اور تربیت اطفال کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہیں۔ وہ اس لئے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس بیجا مار پیٹ کا بچوں کی طبیعت پر کیا اثر ہوتا ہے وہ تو صرف ایک خاص حد تک اپنے بچوں پر ایک مطلق العنان بادشاہ کے مانند حکومت کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے نزدیک خاموشی،

خوف، ہراس، بیجا سادگی، اندھا دھند تقلید، اور ضرورت سے زیادہ انکساری ہی کیرکٹر کے سب سے زیادہ اہم عناصر ہیں۔ اگر کوئی بچہ والدین کی رائے میں اپنی عقل کو دخل دے تو ان کے نزدیک یہ ایک ایسا مذہبی جرم ہے جس کی سزا دنیا اور عاقبت دونوں مقاموں پر ملتی ہے لہذا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ بچوں کی فطرت میں ایسے جذبات ہرگز پیدا نہ ہونے دیں جو خوداعتمادی احترام ذات کی جڑیں مضبوط کرتے ہوں۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُن کے پاس صرف ایک ذریعہ ہوتا ہے جس کو وہ بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ بچوں کا مارنا پیٹنا اُن کے نزدیک کوئی عیب نہیں ہوتا بلکہ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ مارپیٹ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے بچے کا چال چلن سدھارا جاسکتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مارپیٹ کے باعث بچوں کی عملی قوتیں ہمیشہ کے لئے مردہ ہوجاتی ہیں اور ان میں بیجا قناعت شک وشبہ اور اندھی تقلید وغیرہ کی جڑیں ایسی راسخ ہوجاتی ہیں جو آیندہ زندگی میں نہ صرف ان کے لئے مضر ہیں بلکہ جماعتی زندگی کے لئے بھی زہر ہیں۔

ہندوستان میں ابتدائی تعلیم مکتب میں دی جاتی ہے اور گھر کی مارپیٹ کی کمی مکتب میں مولوی صاحب یا پنڈت جی پوری کردیتے ہیں۔ حکومت نے ان ابتدائی مدارس کے استادوں کی تربیت کا بہت کچھ انتظام کردیا ہے لیکن اب بھی ہزاروں مدرسے ایسے ہیں جہاں ان ٹرینڈ اساتذہ کام کرتے ہیں اور اگر تربیت یافتہ ہوں بھی تو سال بھر یا چند مہینے کی تربیت ان کے ذہن سے پرانے نقوش مٹانے کے قابل نہیں ہوتی۔ ادہر عام فضا اور مدرسہ کے ماحول میں بچوں کی مارپیٹ کا چرچہ زیادہ ہوتا ہے اور وہ ذہنی طور پر اتنے اونچے نہیں ہوتے کہ اپنی رائے کا بوجھ دوسروں پر ڈال کر انہیں صحیح رستہ دکھاسکیں۔ دوسرے استاد کی پوزیشن ہندوستانی سماج میں کچھ اتنی نیچی ہے کہ اسکو لکھنے پڑھنے کے متعلق اپنی رائے جو انقلابی ہو دینے کے قابل نہیں سمجھا جاتا اس لئے استاد کی بہتری اس میں ہوتی ہے کہ وہ بھی انجان لوگوں کی رائے پر عامل رہے۔ اور والدین کے حسب منشا، مارپیٹ ہی کو اپنا شعار بنائے رکھے لہذا بچوں کے لئے ابتدائی مدرسہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہوتی جہاں وہ اپنے شوق و ذوق سے جاتا ہے بلکہ اس خوف کی بنا پر جو انہیں اپنے والدین اور استادوں سے ہوتا ہے۔ غرض یہ خوف بچے کی فطرت میں جڑ پکڑتا رہتا ہے جس سے اسکی انفرادی اور جماعتی کارکردگی پر برا اثر پڑتا ہے۔

تربیت کا سوال انفرادی نہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی تربیت کا بندوبست کرکے انکی سیرت کی صحیح تشکیل کرسکیں تاکہ وہ جماعتی زندگی بسر کرنے کے اہل ہوجائیں اگر ہم بچوں کو بے جا خوف دلاکر ایک ڈرپوک نسل پیدا کررہے ہیں تو یہ صرف انفرادی نقصان نہیں بلکہ قومی نقصان ہے۔ قومی سیرت کی تشکیل صرف صحیح تربیت کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر بچپن سے ہم نے بیجا خوف دلا دلاکر خشک و بے کیف تجربات ان کے دماغ میں ٹھونسنے کی

کوشش کی ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے بچے نہ انفرادی بلندی حاصل کرسکیں گے اور اجتماعی فائدہ ہی پیش نظر رکھیں گے۔ ان میں انفرادی یا جماعتی حقوق کی وابستگی و حفاظت کا جذبہ ہی پیدا نہ ہوگا۔ اور وہ بےخوفی سے ملک و قوم کی فلاح وبہبود کے لئے کام کرنے کے بالکل ناقابل ہوں گے۔

خوف دراصل جبلت بچاؤ کا جذبہ ہے جبکی دو صورتیں ہیں۔ ایک اثباتی دوسرے منفی۔ ان میں سے پہلی صورت تعمیری ہے اور دوسری تخریبی۔ ان دونوں صورتوں کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ سگریٹ نوشی کا عادی ہوگیا ہے استاد یا والدین اسے برا سمجھتے ہیں اور بچے کو اس برائی سے بچانا چاہتے ہیں اس کے لئے دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ بچے کو اس برائی سے ڈرایا جائے یہاں تک کہ وہ سگریٹ نوشی سے خوف کھانے لگے اور اس طرح اس برائی سے باز رہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سگریٹ نوشی سے خوف نہ دلایا جائے بلکہ جسمانی سزا کے ذریعہ سگریٹ نوشی چھوڑانے کی کوشش کی جائے اسکا مطلب یہ ہوا کہ بچے نے سگریٹ نوشی کو برا نہ سمجھا بلکہ سزا کو برا سمجھا اور اس نے اس ایک برائی " (یعنی جسمانی سزا) سے بچنے کے لئے کوشش کرتے ہوئے جھوٹ۔ فریب اور مکاری کے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا۔ اور سگریٹ نوشی بھی حسب معمول جاری رکھی اس میں پہلی صورت اثباتی ہے جس کا تعلق انسان کی سیرت کے ان عناصر سے ہے جو پسندیدہ ہیں اور سیرت کی تعمیر کرنیوالے ہیں۔ دوسری صورت تخریبی ہے یعنی نفی ہے جو سیرت کے ایسے عناصر سے تعلق رکھتے ہیں جیسے فریب جھوٹ یا مکاری وغیرہ جو ناپسندیدہ ہیں اور سیرت کی تخریب کا باعث ہو سکتے ہیں اسلئے خوف کے جذبہ سے کام لیتے وقت استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اثباتی صورت سے کام لینے کی کوشش کریں تاکہ بچوں کی سیرت کی صحیح تعمیر ہو سکے جو تعلیم کا سب سے بڑا منشاء ہے۔

خوف سزا ہزاروں قسم کے عیوب پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ انسان کی فطرت میں شک وشبہ یقین کی کمی اور عمل کا کلی فقدان ہو جاتا ہے حقیقتاً جبکہ بچپن کے زمانہ میں تمام تجربات کی تعمیر خوف کی بنیاد پر ہوتی ہو تو اعمال کی صحیح یا غیر صحیح تنظیم ہو تو کس طرح شک وشبہ اندھی تقلید اور یقین کی کمی انسان کے کیرکٹر میں حوصلہ و جستجو کو بالکل مردہ کر دیتے ہیں۔ دوسروں کی خاطر کام کرنا تو درکنار انسان اپنی خاطر بھی عمل کرنے سے گریز کرتا ہے فطرت کے راز ہائے سربستہ اسکے لئے مذہبی معجزے ہوتے ہیں جنکی دریافت وتحقیق اسکے لئے مذہبی جرم ہوتا ہے وہ تدبیر کا قائل نہیں رہتا اور اپنے تمام اعمال وافکار کو تقدیر کے سپرد کر دیتا ہے جس کے باعث عملی جد وجہد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ قومی تنزل اور انفرادی پستی کو وہ تقدیری امور سمجھتا ہے۔ ذاتی رائے اور اپنی قوت فیصلہ پر اسے بالکل بھروسہ نہیں

رہتا اور اسی طرح ایسی نسل آہستہ آہستہ غلامی اور گمراہی کے بھنور میں پھنستی چلی جاتی ہے۔

قوت فیصلہ۔ ذاتی رائے۔ عقیدہ کی پختگی اور یقین واثق جماعتی زندگی کے حقوق و فرائض کی ادائیگی بڑے ضروری صفات ہیں۔ لیکن جہاں یقین کے بجائے شک و شبہ کی افزونی ہو وہاں فیصلہ اور رائے کی کیا اہمیت اور جبکہ ذاتی رائے اور قوت فیصلہ کسی شمار ہی میں نہیں تو عمل کے لئے کونسی اعجازی تحریک پیدا ہوسکتی ہے۔ حقیقتاً انسان کیرکٹر کی تمام و کمال کمزوریوں کی ذمہ داری غلط تربیت کی اس بے رحم چکی پر عائد ہوتی ہے۔ جس میں ہم "فطرت کی محبوب ترین ہستی" کے فطری مادے اندھا دھند پیس دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی پرخوف تربیت اور دہشتناک ماحول میں پرورش پانے سے ہماری نسلیں ناکارہ نہوں تو کیا ہوں۔

ہر شر ہو　　نہاں کہ اندر قلب تست
　　اصل او بیم است اگر بینی درست

آزاد تعلیم ۔ شوکت حسین صاحب کا مندرجہ بالا مضمون ابھی ذہن میں تھا کہ مسٹر رسن ہیڈ ماسٹر برانسٹن اسکول ڈارسٹ کا ایک مقالہ بعنوان "آزاد قوم کا طریقہ تعلیم" نظر سے گذرا۔ اس مقالہ کا آخری حصہ آپ کے مطالعہ کے لئے درج کیا جاتا ہے۔ مسٹر رسن فرماتے ہیں "اگر محبت اور رواداری ہمارے پیشہ کے اصول ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان اصولوں کے پیغام کو ان بچوں تک کس طریقہ سے پہونچائیں جو ہماری نگرانی میں تربیت پا رہے ہیں۔ یہاں علم نفسیات ہماری مدد کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر فرد میں محبت اور نفرت کے جذبات موجود ہیں پہلے کو ابھارنا اور دوسرے کو دبانا یا پہلے کو دوسرے پر فضیلت دینا ہمارا کام ہے۔ بچہ متضاد حرکات کا مجموعہ ہے۔ وہ خوشی اور مسرت کے پیغامات پرہاں سے اظہار محبت اور ایسے مواقع پر جہاں اسکی آزادی میں رکاوٹیں پیدا کیجائیں اظہار برأت بھی کرتا ہے معصوم ضمیر ہمارے استبداد سے خوف زدہ ہوکر اتنا مردہ ہوجاتا ہے کہ بچہ میں چاہ اور پیار کا عنصر جائز مواقع پر بھی اُبھرتے ہوئے لرزتا ہے۔ اس طرح ہمارے ہاتھوں پیدا کیا ہوا خوف معصوموں کے اکثر و بیشتر صحیح و موثر منصوبوں کو رونما ہونے نہیں دیتا.......... تو پھر تعلیم کا اور کیا فرض ہے؟ اس کا منصب اول یہ ہے کہ وہ تمام تعمیری قوتوں کو پیدا کرتا اور ان تخریبی مشاغل کی روک تھام کرتا رہے جن سے بچے کسی جرم کی طرف مائل نظر آئیں۔ اس کے لئے بچوں کو ہر وقت یہی محسوس کرنا چاہئے کہ ان سے محبت کی جاتی ہے اور انکے گرد و پیش محبت ہی کا دور دورہ ہے۔ جو تعلیم محبت کی بنیادوں پر قائم کی جاتی ہے وہی بچوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تکمیل کی علمبردار رہے۔ تخیلات اور احساسات کی آزادی اگر مقصود ہے تو تنفر اور استبداد کے بجائے محبت کے رسیلے نغموں سے مدرسہ کی فضا کو بھر دینا چاہئے"

قومی اتحاد کے لئے غیر ملکوں کا لائحہ عمل

روس کا انقلاب

(مضمون نمبر ۳)

"کوئی مشکل ایسی نہیں جو آسان نہ ہوئی ہو، کوئی مہم ایسی نہیں جو سر نہ کی جاسکی ہو۔ مشکلات کی کہانی زندگی کا دلفریب افسانہ ہے اگر "مشکل" کی سرخی زندگی کے افسانہ سے نکال دی جائے تو وجود بے معنی حیات بے روح اور انسانی تاریخ بے نتیجہ ہے ......

بچپن۔ لڑکپن۔ جوانی اور بڑھاپا ہر دور مشکلات کی ایک منزل ہے جس کو طے کرنے کے طریقے فطرت اپنے عملی مظاہروں سے سکھاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اُن مظاہروں کو اپنی بے اعتنائی سے نظر انداز کرتے رہیں اور عزم کے ایسے چراغوں کو جو مشعل ہدایت ہیں سرد مہری کی پھونکوں سے بجھاتے رہیں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ نظام قدرت کی بنا مشکلات پر ہے اور یہ وہ نظام ہے جس کی تبدیلی ناممکن ہے اور انسان کے لئے جو کائنات کا جزو اعظم ہے کوئی چارہ نہیں بجز اس کے کہ وہ پسینہ بہا کر نباہے زندگی کے لئے اس نظام میں حصہ لیتا رہے آپ فرمائیں گے کہ اس فلسفیانہ تمہید کا یہ کیا موقع ایسی شان و شوکت سے اظہار خیال کی کیا ضرورت۔ تو میں بتا دوں کہ یہ فلسفہ بنی نوع انسان کے وجود کا فلسفہ ہے جس نوع کی فلاح و بہبود کا اہم فریضہ آپ کے ذمہ ہے۔

کیا ہمارا انتشار آپ کے دل کا زخم نہیں جو ناسور بنتا چلا جا رہا ہے آپ سے زیادہ اس امر کا کس کو درد ہوگا کہ ایک ہندوستان کے ملک میں بے شمار قومیں جن کے مذاہب مختلف جن کا تہذیب و تمدن جدا جن کے رسوم الگ حتیٰ کہ بول چال میں فرق۔ رجحانات میں فاصلہ۔ خیالات میں بُعد۔ بنگال سے ابتدا کیجئے۔ بہار۔ ممالک متحدہ پنجاب سے لیکر سرحد تک چلے جائیے۔ اختلافات کا ایک حشر خیز طوفان پائیے گا۔ جنوب کی جانب رجوع کیجئے تو اسی قسم کے ہنگاموں سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ آپ کو صلح و آشتی کے پیغامات پہونچانا ہیں اور یہ جد وجہد کرنی ہے کہ انسانیت کا بول بالا رہے۔ اور تمامی عالم اتحاد و محبت کے رشتوں میں منسلک رہے لیکن یہ کام پہلے گھر سے شروع کرنا ہے اور گھر بھی وہ جسکے خاندانی تنازعات ضرب المثل کیا کوئی آسان کام ہے جس کو زبان سے کہا اور ہو گیا۔ اس کے لئے لہو پانی ایک کرنا ہوگا۔ قربانیاں کرنی ہونگی۔ ایثار نفس اور جرأت عمل سے کام لینا ہوگا۔ رہنمایان قوم کو نہیں آپ کو اور آپکی برادری کے ہر فرد کو جو قومی رہنماؤں اور ملکی نیتاؤں سے ہزار ہا درجہ فوقیت رکھتا ہے۔ آپ کو خود اپنی قدر نہ ہو لیکن اس وقت آپ ہی اور آپ کے مبارک پیشہ ہی کی

بشکر آپ ہی تو وہ ہیں جو جوش عامہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اٹھئے اور اپنے ملک کی اقوام کو اپنے ذہنی پلیٹ فارم پر جمع کر لیجئے انشاء اللہ ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ دل تو نہیں چاہتا کہ اس قسم کی کاوشوں کو بہ روئے کار لانے کے لئے روایات اور اگلے روایتوں کا دامن ہاتھ سے چھوڑا جائے لیکن آئیے ذرا تھوڑی دیر کے لئے ہندوستان سے ہٹ کر روس کے کامیاب انقلاب کا جائزہ لیں ممکن ہے مطلب برابری کے لئے کچھ ایسے وسائل ہاتھ آ جائیں جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن سکیں۔

مسٹر پی نرمین اپنے ایک مقالہ میں جو موصوف نے "سون لیگ اسٹرائڈس ان سویٹ ایجوکیشن" کے عنوان سے لکھا ہے ناقل ہیں کہ "۷ اکتوبر کے سوشلسٹ انقلاب سے لیکر آج تک ستائیس سال کی قلیل مدت میں جو سب سے زیادہ اہم کامیابی حاصل ہوئی وہ ہماری تہذیب و تمدن میں انقلاب ہے۔ یہ انقلاب سویٹ حکومت اور روس کی تمام آبادی کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ وہ روس جس میں متعدد قومیں آباد تھیں جن کے رواسم میں تفاوت جن کی روایات میں اختلاف عظیم تھا سویٹ یونین کے ہاتھوں ایسا بدلا کہ آج تمام ملک میں ایک قوم ہے جس کی نظر ایک، نشا ایک اور مقصد ایک۔

اس نکتہ پر فخر و مباہات کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ ایسے نایاب تمدنی انقلاب کا سبب صرف تعلیمی اصلاح تھی جو خلیج بوتھنیا اور بحر بالٹک سے ابر رحمت بنکر چلی اور بحر الکاہل کے ساحل تک اوسکی تمام اور سرزمین ہموار اور شاداب کر گئی۔ علم کے دروازے کھلتے ہی نہ صرف سماجی ناانصافیاں روشنی میں آ گئیں بلکہ اوس کی تمام پست و بلند اقوام کا معیار زندگی یکساں ہو گیا۔ عام طور پر ہر طبقہ کے آدمیوں کے لئے چاہے وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ شہری ہوں یا کسان جن کو آج سے پچاس برس پہلے حصول علم کی اجازت نہ تھی سائنس۔ انجنیرنگ۔ آرٹس کی تعلیم عام کر دی گئی اور کروروں جاہل روسی بالغوں کو بالخصوص عورتوں اور دیہاتیوں کو پڑھا لکھا دیا گیا۔

ابھی آپ نے تعلیم کے اعجازی اثرات کو کیا دیکھا مزید واقعات ملاحظہ ہوں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ آپکے ہم پیشہ حضرات نے روس میں اور بھی کیا کا یا پلٹ کر دی۔ مسٹر زمن اپنے مقالہ میں بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تعلیم کا ایسا عام چرچہ ہوا کہ سویٹ اسٹیٹ میں جب خانہ جنگیاں ہو رہی تھیں اس وقت بھی سیاسی اختلافات کے باوجود روس کا ہر فرد ملک کی جہالت دور کرنے میں ایک دوسرے کا ہم خیال تھا اور صرف یہی ایک نکتہ تھا جہاں روسی آبادی متحد العمل تھی اس مبارک ابتدا کا سہرا لینن کے سر تھا۔ یہ وہ اقدام تھا جس پر اقوام عالم رشک کرتی رہیں گی اور ایجاد کی تاریخ قیامت تک اس پر فخر کرتی رہیگی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں روس کی ۳۳ فیصدی آبادی تعلیم یافتہ تھی لیکن سنہ ۱۹۳۶ء کی مردم شماری میں ۸۱ فیصدی کی تعداد تعلیم یافتہ پائی گئی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دیگر اقسام کے تعلیمی ادارے بھی جاری کئے گئے مثلاً کتب خانے دیہاتوں میں ریڈنگ روم۔ عجائب خانے۔ تھیٹرس۔ کلب گھر وغیرہ۔ سنہ ۱۹۳۹ء تک کتب خانوں کی تعداد چھ گنی۔ کتابوں کی اٹھارہ گنی اور کلبوں کی پانچ سو گنی ہو گئی تھی۔" حیرت نہ کیجئے گا۔ تعجب نہ کیجئے گا آپ بھی عملی جذبہ میں

روس سے کسی طرح کم نہیں۔ آج سے کوشش کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ملک میں بھی ایک کثیر تعداد انیس سال کی مدت میں جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر علم کی روشنی میں آگئی۔ آپ بھی اس مریز ور دیتے رہئے کہ باقاعدہ مدرسوں کے ہمراہ قریہ قریہ دیہات دیہات کتب خانوں عجائب خانوں کے سے دوسرے تعلیمی ادارے بھی جاری ہوتے رہیں۔ مسٹر زین مزید فرماتے ہیں کہ سویٹ حکومت کے برسر اقتدار آتے ہی اول دن سے مدرسوں نے جمہوری شکل اختیار کرلی۔ اور بلافیس کی تعلیم کا اجرا ہوا۔ قصبوں اور دیہاتوں میں ابتدائی اور شہروں میں ۷ سال کی عمر تک کے لئے تعلیم جبریہ قرار دی گئی۔ مدرسوں کے لئے حکومت کی جانب سے تمام قیمتی تعلیمی آلات مفت مہیا کئے گئے تاکہ جبریہ تعلیم کے نتیجہ خیز ہونے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے "اس مقام پر آپ کو ضرور تھوڑا سا رشک ہوگا۔ لیکن گھبرائیے نہیں حکومت کا میلان آپ کی طرف ہے۔ آپ بھی اپنے عمل میں تیز کشش پیدا کیجئے کہ وہ آپ کی صدا کے لئے خاتمہ پر ہمہ تن گوش ہو جائے۔

واضح ہو کہ اس فاتح قوم کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ سنئے اور غور سے سنئے ملک و قوم کے لئے یہ بیان عبرت خیز ہے اور آپ کے لئے ایک درس کہ "تعلیمی قانون کا نفاذ ہوتے ہی سارے ملک میں لا تعداد مدرسے کھل گئے۔ ۱۹۳۹ء کے شروع میں مردم شماری پر معلوم ہوا کہ تقریباً تین کروڑ بچے سارے روس میں ابتدائی ثانوی اور دوسرے قسم کے اداروں میں تقریباً پانچ کروڑ بچے جوان اور بالغ تعلیم پا رہے تھے۔ دیہاتوں اور قصبوں کے مدرسوں میں شہری ادارہ جات سے دس گنا زیادہ داخلے ہو رہے تھے اور اس وقت سات سال کی عمر کے طالب علموں کی تعداد ۱۹۱۴ء کے مقابلہ میں دو سو گیارہ گنا زیادہ تھی۔ غرض روس کے تمدنی انقلاب اور قوم کے اتحاد کا سب سے بڑا سبب عام تعلیم کا اجراء تھا جس کی بنا پر روسیوں نے کرلی تھی اور اسی لئے ملک کے ہر فرد نے تحریک کے شروع ہوتے ہی پست اقوام کے بازوؤں میں ہاتھ دیکر بلند کر لیا چونکہ ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی تھیں اس لئے مزید سہولتیں بہم پہونچانے کی غرض سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ ہر فرقہ اپنی اپنی مادری زبان میں حصول علم کرے یہاں تک کہ برفستانی روس کی آبادی میں بھی اپنے طریقے پر پڑھنے لکھنے کا چرچہ عام ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہونے سے قبل حکومت روس نے دوسری پانچ سالہ اسکیم مرتب کرلی تھی۔ جس میں اس امر پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا کہ تمدن کی یکسانیت اور تہذیب کی یگانگی برقرار رکھنے کے لئے نظام تعلیم میں مزید اچھے اور موثر طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس اسکیم میں شہروں کے لئے دس سالہ اور قصباتیوں کے لئے سات سالہ ابتدائی تعلیم جبریہ قرار دی گئی تھی۔ اس کے بعد تتمۂ کلام پر مسٹر زمن بلند دعوے کے ساتھ فرماتے ہیں کہ "ہماری اس عظیم الشان فتح کا تفصیلی جائزہ لینے والے یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ صرف ہماری تمدنی حالت کی درستگی تھی۔ جس نے دنیا کے دل پر ہمارے وجود کا

سکھا دیا۔ شکر ہے ہماری تعلیم اور طریقہ تعلیم کا جس کے تصدق میں ہمارے تمدن نے ہٹلر ایسے جابر اور نازیت جیسی طوفانی قوت کے خلاف ایک ایسی آہنی دیوار قائم کر دی جس پر دشمن نے لاکھ سر مارا لیکن جہاں وہ ہمارے تحفظ کے لئے جم گئی تھی وہاں سے ایک انچ نہ ہٹی اور ہماری سُرخ فوج نے ہم کو بڑے بڑے سورماؤں کے مقابلہ میں سرخرو ہی رکھا۔ افسوس ہے کہ جنگ نے ہمارے تعلیمی منصوبوں میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر دیں ورنہ وہ وقت دور نہ تھا جب ہم عالم کی تمام اقوام کو امن و اماں اور محبت و اتفاق کی ایک لڑی میں منسلک کر دیتے۔"

دیکھا آپ نے یہ ہے اس زندہ قوم کا افسانہ جس کی اجتماعی اور انفرادی دونوں آوازوں میں ترقی کے سریلے نغمے موجود ہیں جن کے کیف سے آج بزم عالم سرشار ہے۔ کیا ہے ہم میں اور آپ میں بھی قوم پرستی اور ملک دوستی کا جذبہ کہ ہم سب ملکر ایک بار اپنی تعلیمی کاوشوں سے ایسے طربیہ کردار پیدا کر دیں جو ہندوستان کے اسٹیج پر مدتوں سے ہونے والے حزنیہ ڈرامے کی نوعیت ہی کو بدل ڈالیں......؟

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

(مرزا سجاد علیخاں اختر)

سنگ و خشت

عالم مشکلات:- بیرونی کی طرف سے جو تعلیمی پیغامات پہونچ رہے ہیں وہی ہمارے لئے نورٌ علیٰ نور ٹھہے۔ نہ کہ وہ مبارک پیغام جو دوستوں اور اپنوں کی جانب سے بھیجا جائے۔ اس کا کیا کہنا۔ آنکھوں کی ٹھنڈک، کلیجہ ٹھنڈک۔ خیر کیا جانیں ہمارے دل کا دکھ۔ وہ جب سوچیں گے اپنے ماحول کے مطابق۔ جب بھی کچھ کہیں گے اپنی ضروریات زندگی کو سامنے رکھکر۔ اُن میں اور ہم میں زمین و آسمان کا فرق۔ تہذیب و تمدن میں بیگانگی۔ زبان میں جدائی۔ معاشرت میں دوری گفت و شنید میں تفاوت۔ وہ محلوں کے رہنے والے ہم جھونپڑیوں کے باسی۔ وہ شہری ہم دیہاتی۔ وہ تاجر ہم کسان۔ وہ کرسی نشیں ہم خاک نشیں۔ وہ حاکم ہم محکوم۔ وہ آزاد ہم غلام۔ اُنھوں نے جب کچھ سوچا اُن کا خیال سونے میں تول دیا گیا ہم نے جب کبھی کچھ سوچا تو کوڑیوں کے مول اپنوں میں نہیں بلکہ غیروں میں جا بکا۔

معاف کیجیے گا آپ نے بھی وہی میڈم مانٹسوری اور کنڈر گارٹن کے طریقہائے تعلیم اور ڈالٹن پلان کو تبلیغ کی بنا قرار دے لیا۔ یہ نہ سوچا کہ قدرت نے ان موجدوں کو موقع دیا۔ حکومت نے ہمت افزائی کی اسی لئے امتحانات، تجربات اور عملیات میں دن دونی رات چوگنی ہونے لگی۔ موجد کی ایجاد پرورش پاکر شباب پر آنے لگی۔ یہاں ہم کو کہئے اوّل تو افکار زمانہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتے اور اگر واقعات و اتفاقات سے لڑ بھڑ کر کسی نئے رخ کی طرف میلان طبع نے پرواز بھی کی تو ہماری غیرت نے قدم بڑھا کر اس کا گو رگڑھا کر دیا۔ جہاں تک حکومت کی ہمت افزائیوں کا تعلق ہے تو" نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہی کیا۔

مجھ حقیر کے نزدیک تو بجز چند ممکن العمل اصولوں کے بانی کوئی اصول چاہے وہ مانٹسوری اصول ہو یا کنڈر گارٹن ہم ہندوستانیوں کے لئے موثر اور نتیجہ خیز ہو ہی نہیں سکتا نفسیاتی اثرات میں بھی اختلاف ضروری ہے۔ موجدین مذکور ایسے ممالک کے رہنے والے ہیں جہاں کی آب و ہوا میں ایک گونہ یکسانیت ہے اور ہم ایسے دیس کے بندے ہیں جہاں آب و ہوا کی پیہم تبدیلیاں ہماری دماغی کیفیات کو ایک حالت پر قائم ہی رہنے نہیں دیتیں۔ لہذا ہمارے بچوں اور اُن کے بچوں میں خاص فرق ہے آپ فرمائیں گے یہ گہری گہری باتیں چھوڑیئے۔ ان سطحی باتوں پر جو مفید ہوں عمل کیجئے۔ یعنی بچوں کو آزادی دیجئے۔

ان کے آزاد مشاغل میں رہنمائی کیجئے ....

مہربان بندہ معاف کیجئے۔ آزادی کا پرچار کرنے والوں کے بچوں کو کیسے پانچ سال کے سن تک آزادانہ طور پر حصول تعلیم کے مواقع ہیں۔ ہمارا بچہ تو اگر چودہ پندرہ سال کی عمر میں چھ آنے روزانہ لا سکا تو گھر میں فاقہ ہوگا اور خاندان کے اکثر افراد ننگے ہی رہنے پر مجبور رہیں گے۔ دیکھئے جب میں یہ عرض کر رہا ہوں تو میرے پیش نظر وہ آبادی ہے جس سے ہندوستان صحیح معنوں میں آباد ہے۔

بہرحال مجھکو اس کی خوشی ہے کہ آپ نے تعلیم کے متعلق ایک اچھے رسالہ کے ذریعے سے تبلیغ شروع کر دی ہے۔ امید ہے کہ یہ تبلیغ آپ اپنے ہی لب ولہجہ میں جاری رکھیں گے۔ اگر لب ولہجہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو ہماری ہمت افزائی ہوگی اور ہم کسی غیر معمولی اور نہ جانی ہوئی بات سے مرعوب بھی نہ ہوں گے۔ آپ کے ساتھ "تعلیم جدید" میں کھل کر باتیں بھی کریں گے اور تبادلۂ خیال بھی۔

ان۔ ایم۔ انصاری معلم
۷-۲-۴۶

ذرائع و وسائل کی کوتاہی کا شکوہ

پہلا پرچہ "تعلیم جدید" کا ہمارے سامنے ہے۔ آپ کے اسلوب بیان سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ ہم استادوں کے استفادہ کے لئے ہے۔ ہماری علمی استعداد سے آپ واقف ہیں۔ ہم میں کا ہر ایک اردو مڈل یا زیادہ سے زیادہ میٹرک پاس ہے۔ ہماری ضروریات بھی آپ پر خوب روشن ہیں۔ اور جن بچوں کی تعلیم ہمارے ذمہ ہے ان کی زندگی اور ان کا معیار زندگی دونوں سے آگاہ ہیں پھر اگر آپ ہمارے سامنے بین الاقوامی مسائل کا تذکرہ کریں گے تو ہمارا ہندوستان بلکہ ہمارا مختصر گاؤں چھوڑ کر تمام دنیا کو امن وامان کے کچے دھاگے میں باندھنے کی تعلیم دیں گے تو عبث۔ یہ صحیح ہے کہ ہم بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود کے ذمہ دار ہیں اور آئندہ نسلوں کی صحیح تعلیم وتربیت ہی سے اس مفید مقصد کو پورا کر سکتے ہیں جس کی باگ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ مگر کیا غلامی کی زندگی گذارنے والے چند بے دست وپا افراد کوئی ایسا مستقل لائحہ عمل تیار کر سکتے ہیں جس میں آزادی کارفرما ہو سکے اور امن وامان کے ذرائع پیدا ہو سکیں ....؟

آپ ہی فرمائیے کہ ہمارے پاس وہ وسائل کہاں ہیں جن سے ہم اپنے منصوبوں کو کما حقہٗ انجام دے سکیں کہنے سننے کا میدان وسیع لیکن عمل کا میدان ہمارے غریب ملک اور اس کی غریب آبادی پر تنگ ہے۔ لاکھوں روپیہ کہاں سے آئے جو محتاج دیہاتیوں کے بچوں کے لئے مقرر کردہ قیمتی تعلیمی مواد مہیا کیا جا سکے جس کی بنا پر بڑے بڑے فلسفیانہ منصوبوں کی تکمیل ہو گستاخی معاف ہو۔ اس کو تخریبی تبصرہ نہ تصور فرمائیے گا۔ یہ ہماری مشکلات کا ایک رسمی سا خاکہ ہے جو آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

ہمدانی
۱۲-۲-۴۶

تعلیم جدید کا استقبال

اس گزارش کو مبالغہ نہ تصور کیجئے گا۔ کہ "تعلیم جدید" کا پرچہ رام پور کے اساتذہ کے لئے باعث صد رحمت ہے۔ اس کا اجرا ریاست کے تعلیمی اداروں میں ایک ایسا مفید اضافہ ہے جس کی روشنی میں ہم کو صحیح راستے ملتے جائیں گے۔ اور ہماری جد وجہد بار آور ہوتی رہے گی۔

تشنہ خیر

۴ ار فروری ۱۹۴۶ء

صفحات کی کمی

ماہوار رسالوں کے صفحات کی تعداد کم از کم ساٹھ ہونا چاہئے تاکہ پڑھنے والا اگر ایک ورق روزانہ پڑھے تو اس کو مہینہ کے تیسوں دن رسالہ سے نزدیکی رہے۔ مدرسوں کی مطالعہ کی رفتار ظاہر ہے۔ انھوں نے "تعلیم جدید" کے مختصر چوبیس صفحے اگر ایک ہی نشست میں بیٹھکر پڑھ ڈالے تو اس کے اکثر قیمتی مضامین ضائع ہو جائیں گے۔ کیا آپ ایسے مفید رسالہ کے صفحات میں اضافہ نہیں فرما سکتے؟

(معین)

فرمائیے! آپ کی کیا رائے ہے

ایسے زمانہ میں بھی آپ خاموش ہیں جب آزادی رائے کا دور دورہ اور اظہار خیال کا حق ہر فرد کو مل چکا ہے اگر آپ کچھ نہ کہیں گے تو پھر زبان وقلم کو کب حرکت دیجئے گا۔ لیجئے ہم اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ذیل میں دو تجویزیں درج کرتے ہیں اگر آپ کی جانب سے صدائے لبیک بلند ہوئی تو ہم تجاویز کے اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے تامل کی کوئی وجہ نہیں جرأت سے کام لیجئے اور دل کی گرہ کھولئے

(مدیر)

پہلی تجویز

سرپرستوں کے لئے مدرسہ کی ضرورت

بچوں کی تعلیم پر اقوام عالم نے ایک دھوم مچا رکھی ہے چہار جانب ایک پکار ہے کہ صحیح اور موثر تعلیم ہی سے دنیا کی جدید تعمیر کامیابی کی منزلوں تک پہونچائی جا سکتی ہے گوشہ گوشہ سے بنی نوع انسان کی جہالت دور کرنے کی تجویزیں میدان عمل میں لائی جا رہی ہیں آنیوالی نسلوں کے مستقبل کی درستگی کے لئے کانفرنس کی بھرمار ہے۔ ماہرین فن معلموں اور مدرسوں کو درس دے رہے ہیں۔ در پیہم جد وجہد کر رہے ہیں کہ بچوں کے لئے نئے نئے مدرسے کھولے جائیں اور ان مدرسوں میں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جو تعلیم اور طریقۂ تعلیم سے واقف ہوں مگر یہ تمام کارروائیاں ایک طرفہ ہیں۔ جس طرح بچوں کی صحیح تعلیم کے لئے معلموں اور استادوں کی ٹرننگ ضروری قرار دی جا رہی ہے اسی طرح والدین اور سرپرستوں کے لئے بھی ٹرننگ اسکولوں کا اجرا ضروری قرار دیا جائے۔ کیونکہ تعلیم کا موثر اور نتیجہ خیز ہونا مدرس اور سرپرست کے اتحاد عمل پر مبنی ہے۔ اگر ایک طریقۂ تعلیم سے واقف

اور دوسرا بالکل نا واقف ہے تو تعلیمی توازن کا قیام عملاً ناممکن ہے۔ تجویز مذکور کے پیش کرنیوالے کی نظر میں ہندوستانی والدین کی مصروفیت ان کی بیچارگی اور کم مائیگی کا ہر ممکن پہلو موجود ہے لیکن کسی نیک مقصد کو حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر باقاعدہ ٹریننگ اسکولوں میں والدین اور سرپرستوں کی تدریس کا امکان نہ ہو تو یہ تجویز اس ترمیم کے ساتھ ناخدایان قوم وملت وعمال حکومت کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے کہ بچوں کے سرپرستوں کے لئے ریفریشر کورسز کا انتظام کر دیا جائے تاکہ جس طرح ہم اپنے فرائض سے بہرہ مند کئے جاتے ہیں وہ بھی اپنے منصب سے بااصول طریقے پر مطلع کر دئے جائیں۔

(دوسری تجویز)

اساتذہ کی آسودہ حالی

"دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

اعجاز کہئے یا اتفاقِ وقت۔ ابھی مندرجۂ ذیل تجویز ضبط تحریر میں نہ آنے پائی تھی کہ صوبۂ ممالک متحدہ کے مشہور ماہرفن ڈاکٹر جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کا ایک تازہ بیان محرک کی نظر سے گذرا۔ اول اس بیان کا مطالعہ فرمایئے جو لفظ بہ لفظ تجویز ہٰذا کی تائید میں ہے۔ ڈاکٹر جھا فرماتے ہیں۔

"ہمارے ملک کی تعلیمی ترقیوں میں جہاں بہت سی رکاوٹیں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں ذریعہ تعلیم غیر زبان ہے جس سے استاد اور شاگرد کے درمیان تبادلۂ خیال میں انتہائی مشکلات پیش آتی ہیں یہ امر اس سے زیادہ مضحکہ خیز ہے کہ ہمارے اساتذہ جو قومی تعمیر کے ذمہ دار ہیں اور جن کے سپرد ملک کی ناخدائی ہے اپنی جانفشانیوں کا معاوضہ بھکاریوں سے بھی زیادہ کم پاتے ہیں جس کے باعث ان کو نہ اطمینان زندگی نصیب ہے نہ سکون دل۔ کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس قابل صد عزت فرقہ کے افراد کا ماہوار مشاہرہ ایک معمولی چوکیدار کی تنخواہ کے برابر ہے۔ تعلیم ایسی ہونا چاہئے جو بچوں کی قوت فیصلہ اور قوت ارادی کی تکمیل کر سکے اور ان کو اس قابل بنا سکے کہ وہ انفرادی طور پر معاملہ فہم بن سکیں اور ان میں بلا کسی تاثیر غیرے مسائل زندگی پر غور کرنے کی قوت پیدا ہو۔ لیکن کیا یہ بلند مقاصد ننگے اور بھوکے استادوں کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے؟ میرے نزدیک امر مذکور نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ صحیح تعلیم وہی ہے جو روحانیت کو ابھار سکے۔ ممالک غیر کے طریقہائے تعلیم کی ایک ٹریجڈی یہ ہے کہ اس نے ایسے مفید و موثر نکتہ کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ دوسرا قابل افسوس واقعہ یہ ہے کہ اغیار کے تبلیغ کردہ طریقوں نے ہمارے تعلیمی نصاب

اخلاقی و مذہبی شعبوں کو حذف کر دیا ہے اور ایسی "بے مغز" والی تعلیم ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے نوجوانوں میں نہ صحیح جذبہ حریت ہے نہ درد قومی۔ کیا افکار و حوادث کا شکار ہندوستانی استاد ایسے نازک مسئلہ پر سکون قلب سے کبھی سوچ سکتا یا عمل کر سکتا ہے؟"

ڈاکٹر جھا کی نقطہ بہ نقطہ تائید کرتے ہوئے اس مسئلہ کا حل صرف یہی ہو سکتا ہے کہ استادوں کی تنخواہوں میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ وہ اپنے معیار زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس درجہ مطمئن ہو جائیں کہ وہ اپنے پیشہ کے کار ضروری کو بلا کسی رکاوٹ کے اچھی طرح سوچ سکیں اور عمل کیوقت ان کے ہاتھ اپنی نجی زندگی کی ضرورتوں سے اتنے بے نیاز ہوں کہ آزادانہ طور پر تعلیمی مشکلات کا حل کر سکیں۔ تنخواہوں کے اضافہ پر ہی یہ مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ جس طرح انتظامی اور قانونی حکام کے لئے مختلف قسم کے الاؤنس مقرر ہیں۔ اسی طرح مدرسین کے لئے بھی ایک ایسی اضافی رقم کا تقرر کیا جائے جو ان کے بچوں کی پرورش کا ذریعہ ہو سکے۔

دنیا میں رفتار تعلیم

چین کی پیش قدمی

حال میں چین کے وزیر تعلیمات نے ایک کانفرنس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ حکومت اور رعایا کے درمیان رشتوں کو مضبوط کرنے کا ذریعہ صرف تعلیم ہی ہو سکتی ہے لہذا حکومت چین نے طے کیا ہے کہ وہ ملک میں تعلیم کو وسیع کرنے میں زیادہ سے زیادہ جد و جہد کریگی چونکہ ملکوں کے اندرونی نظام کی کامیابی کا انحصار بھی اچھی اور موثر تعلیم پر ہے اور یہی اچھی اور موثر تعلیم پاس پڑوس کے ممالک میں پرخلوص اتحاد بھی پیدا کرتی ہے اس لئے سب سے پہلے حکومت اسی شعبہ کی جانب توجہ کرے گی جس کے لئے اس نے طے کر لیا ہے کہ وہ چین کے گوشہ گوشہ میں مدرسے جاری کریگی۔ ان استادوں کو معلمی کے پیشہ کی پھر ترغیب دیگی جنہوں نے جنگ کے دوران دوسرے قسم کی ملکی خدمات اپنے ذمہ لے لی تھیں اور ان نوجوانوں کی تعلیم کے لئے ہر قسم کی آسانیاں بہم پہونچائے گی جو لڑائی کے سبب مجبور ہو کر پڑھنا لکھنا چھوڑ چکے تھے۔

آسٹریلیا کی تعلیمی جد و جہد

آسٹریلیا کی حکومت نے طے کیا ہے کہ وہ عنقریب ایک ایسا کمیشن مقرر کرے گی جس کے لئے بیرون ملک سے ماہرین تعلیم بلوائے جائیں گے۔ یہ کمیشن حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد حکومت آسٹریلیا کو یہ مشورہ دیگا کہ ملک میں تعلیم کا کیونکر اور کس

ہمارا نہ پورا خرچ کیا جائے۔ آسٹریلیا کے لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ملکی ترقی اسی پر ہے کہ تعلیم کو وسعت دی جائے۔

ترکی کی بیداری } حال میں ترکی انڈر سکریٹری مسٹر رشتو اوزل جو محکمہ تعلیم ترکی کے افسر اعلیٰ ہیں برطانیہ کی یونیورسٹی۔ مدارس درست کاری کی تعلیم گاہوں کا معائنہ کرنے جزائر برطانیہ گئے تھے۔ موصوف نے اخباری نمایندوں کو اپنا بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ ان کے برطانیہ کے سفر کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان سے تمام ذرائع معلوم کریں جس سے وہ ترکی کے تمدن۔ صنعت و حرفت اور کاشتکاری کو ترقی دے سکیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حکومت ترکی ایک عرصہ سے ابتدائی تعلیم پر زور دیتی چلی آئی ہے۔ اس نے نہ صرف شہری چھوٹے چھوٹے مدرسوں کے لئے ماہر استاد بنانے کی کوشش کی بلکہ دیہات کے ابتدائی اداروں کے لئے بھی تجربہ کار معلم تیار کئے۔ ہر سال کم از کم ایک ہزار نئے مدرسے جاری کئے جاتے تھے اور آج کی رفتار اس سے دو چند ہے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تعلیم کا ہر شعبہ مکمل ہو جائے۔

جرمنی میں اوستادوں کی ٹریننگ } ابتدائی مدرسوں کے اساتذہ کے لئے اولڈن برگ کا ٹریننگ کالج کھل گیا ہے۔ مستقبل قریب میں دوسرے مقامات پر بھی اسی قسم کے اداروں کے اجرا کا امکان ہے۔

اسکینڈی نیویا کا اختراع } اسکینڈی نیویا کے ممالک تعلیم کو بین الاقوامی بنانے کے لئے ایک نیا طریقہ جاری کر رہے ہیں وہ اپنے طالب علم ڈنمارک وغیرہ بھیج رہے ہیں اور وہاں کے طلاب اپنے مدرسوں میں داخل کر رہے ہیں۔ اس طریقۂ تعلیم سے ان کا مقصد یہ ہے کہ طلبا کے ذریعہ سے ممالک میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو۔

انڈین کونسل آف ایجوکیشن } ڈاکٹر ڈی۔ آن۔ شرما جنرل سکریٹری انڈین کونسل آف چائلڈ ایجوکیشن مائی لاپور اطلاع دیتے ہیں کہ آل انڈیا کنڈرگارٹن اینڈ نرسری اسکول ایسوسیشن کا نام انڈین کونسل آف ایجوکیشن ہو گیا ہے۔ کونسل مذکور کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ ہندوستانی بچوں کی صحیح اور موثر تعلیم کی نگرانی کرے اور ان تمام اصولوں کو جو اس سلسلہ میں کسی خاص طریقے پر تجربہ میں آچکے ہوں اور کامیاب بھی ہوں۔ نشر و شائع کرے اور طریقہائے تعلیم کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچانے کی جد وجہد کرے جو سائنس پر مبنی ہوں اور علم نفسیات کے حامل ہوں۔ کونسل ہذا اس مقصد کو بروے کار لانے میں تمام صوبوں اور دیسی ریاستوں سے اتحاد عمل کرے گی۔

اقتباسات

آج ———— (۱و) ———— آج سے بیس سال قبل

بچوں کا کلب گھر

"لوہے یا کوئلہ یا اس سے زیادہ عالم کی قیمتی اشیاء سے بچہ کی قیمت کہیں اہم ہے"

اس عظیم الشان حقیقت کا روس اور امریکہ نے عملاً اعتراف کیا ہے جو اپنے بچوں کے مستقبل کو کارآمد بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں جو ان کی تعلیم و تربیت کو اپنی قومی تعمیر کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بہت سے طریقہائے تعلیم جو ان ممالک نے ایجاد کئے ہیں بچوں کا کلب گھر ان میں سے ایک مفید اور موثر ایجاد ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بچے کے گھر میں اس کے لئے ہر امکانی دلچسپی کا مہیا کیا جانا مشکل ہے اور چونکہ اس کے تفریحی مشاغل کا احاطہ کرنا اس کی آزاد تلاش کو محدود کرنا ہے اس لئے ایسا کوئی گھریلو انتظام جو بلا اس کے احساسات کا جائزہ لئے عمل میں لایا جائے اکثر و بیشتر بے سود ثابت ہوا ہے۔ عام طریقہ پر والدین اپنی تنگدستی کے باعث ان تمام اشیاء کی فراہمی سے معذور بھی ہوتے ہیں جو بچوں کی دلچسپیاں آگے بڑھانے میں معین ہوں۔ بچوں کے کلب گھر سے مدرسہ اور گھر کے درمیان کی خلیج بھی ایک بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ کلب گھر اطلاعات کا مسکن ذہنی ارتقا کا ذریعہ اور تخیلات میں تحریک پیدا کرنے کا آلہ ہیں نو سال سے لیکر گیارہ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے کلب گھر کا ہونا ضروری ہے یہی وہ عمر ہے جب مقابلہ کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی یہ زمانہ بنیادی عادتوں کی تشکیل کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت قوائے ذہنی۔ بصارت اور جسمانی حرکتوں کے اتحاد و اتفاق سے عقل و شعور کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اجتماعی خلقت اور سماجی زندگی کی تکمیل و کھیلوں کے ذریعہ سے ہر قسم کی تعلیم ممکن ہی نہیں بلکہ آسان اور کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ (مرجوزہ ایجوکیشنل ریویو)

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری

مسٹر ایم ایم فروسٹ کا جنیوا کے رسالہ

... طالب علم کی آواز ... سمجھتے ہیں ... آرٹ اور سائنس کے گریجوایٹ اور بی اے فیل سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بیکار ہیں ان کے خاندان والے اس موہوم امید میں رہتے ہیں کہ وہ کسی دن ان کی کفالت کر سکیں گے انھوں نے ہر طرح کی تکلیفیں اٹھائی ہیں تاکہ نوجوان اپنی تعلیم کو مکمل کر سکے لیکن اس تعلیم یافتہ نوجوان کی بازار میں کوئی مانگ اور قیمت نہیں یہ ناقابل اطمینان حالت بہت سی باتوں کا نتیجہ ہے بعض لوگ نصاب تعلیم کو الزام دیتے ہیں کہ وہ ملک کی ضروریات کے لئے مناسب نہیں اور صنعتی تعلیم کی ترقی پر زور دیتے ہیں لیکن ملک کے مخصوص حالات کی وجہ سے یہ نہایت مشکل ہے۔ ہندوستان میں صدیوں سے ہر قسم کی دستکاریاں اور پیشے ذات کی بنا پر منقسم ہیں یہاں کسی قسم کی صنعت و حرفت مثلاً پارچہ بافی وغیرہ کو بطور خود جاری کرنے میں یہ دقت حائل ہوگی کہ پارچہ بافوں کی تمام برادری سے مقابلہ کرنا پڑیگا جو عرصہ سے اپنی ساکھ قائم کر چکے ہیں بلکہ معیار زندگی پست ہونے کی وجہ سے اتنے کم خرچ میں چیز بنا سکتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگ ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یورپ اور امریکہ میں اس امر کے خلاف کوئی رکاوٹ نہیں۔ جو نوجوان چاہے حجام یا سبزی فروش یا معمار بن سکتا ہے کیونکہ وہاں کی ابتدائی تعلیم میں پیشوں دستکاریوں اور صنعتوں کو پیش پیش رکھا ہے۔ یہاں ان کے قیود سے پیشہ کے انتخاب میں زیادہ آزادی نہیں مل سکتی اور نہ دوران تعلیم میں اس کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں شاید ہندوستانی طالب علم میں درحقیقت ایک ایسا فلسفۂ زندگی ودیعت کیا گیا ہے جو اس کے راستہ میں حائل ہے ایک قسم کی تقدیر پرستی جمود، ہمت کا ہار بیٹھنا جو اس پر مغربی لوگوں کی نسبت زیادہ جلدی عادی ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے افلاس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں قوت برداشت تو زیادہ ہوتی ہے لیکن قوت تمیز اور فعالیت کم۔

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

آل احمد صاحب سرور کی رہنمائی میں رضا انٹر کالج کے تعلیمی مشاغل

اس سال ماہ رواں میں رضا انٹر کالج رامپور کا "تعلیمی ہفتہ" منایا گیا جس میں ماورا النصاب مشاغل پر خصوصیت کے ساتھ توجہ مبذول کی گئی۔ طلباء نے علمی مباحثات، تقاریر، مضامین اور کھیل کود میں حصہ لیا۔ تعلیم کا مقصد ہے کہ طلباء کو نہ صرف درسی کتابیں ازبر کرادی جائیں بلکہ صحیح طریقوں پر ان کی سیرت کی تشکیل کی جائے، انہیں اعلیٰ قدروں سے روشناس کرایا جائے اور دماغی اور جسمانی طور پر انہیں سماج کا مفید رکن بنایا جائے تاکہ وہ "اچھے شہری" بن کر انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لئے جد وجہد کرنے کے اہل ہو سکیں۔

اس مقصد کے پیش نظر سال رواں میں علاوہ درسی تعلیم کے طلباء کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی تربیت کے لئے کالج میں یونین اور اسپورٹس کلب کی بنیاد ڈالی گئی۔ طلباء کو یونین سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کے مواقع فراہم کئے گئے۔ وقتاً فوقتاً تعلیمی مباحثے، مشاعرے اور مناظرے وغیرہ منعقد کئے گئے۔ معلومات عامہ کے لئے اساتذہ نے موجودہ دور کے اہم مسائل، سائنس کی ایجادات و انکشافات، ادبی کارناموں اور زمانے کے جدید رجحانات پر سیر حاصل تبصرے کئے۔

طلباء کو ملک کی سربرآوردہ شخصیتوں سے روشناس ہونے اور ان کے خیالات سے بہرہ ور ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔ بیرونی حضرات میں سے جن کو تکلیف دی گئی ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ، عالیمرتبت سید بشیر حسین صاحب بہادر زیدی چیف منسٹر، عالیمرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب بہادر مشیر تعلیمات، لفٹننٹ کرنل میاں عطاء الرحمٰن صاحب بہادر، امتیاز علی خاں صاحب عرشی، عالیمرتبت ڈاکٹر احسان محمد خاں صاحب بہادر اور پروفیسر سعید احمد صاحب اکبرآبادی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

تعلیمی ہفتہ کے موقع پر طلباء کی سال بھر کی کوششوں کا جائزہ لینے اور ہمت افزائی کرنے کے لئے مختلف النوع انعامی مقابلے کئے گئے۔ ان انعامی مقابلوں میں "ذاکر حسین اردو پراونشل ڈبیٹ" اور "سیدین انگلش پراونشل ڈبیٹ" کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اول الذکر میں عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب بہادر مشیر تعلیمات نے صدارت فرمائی اور لفٹننٹ کرنل میاں عطاء الرحمٰن صاحب بہادر اور امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے جج کے فرائض انجام دیئے۔ موخر الذکر مقابلے میں عالی مرتبت بشیر حسین صاحب بہادر زیدی چیف منسٹر نے صدارت فرمائی اور کرنل سی۔ جی اسمائی اور عالی مرتبت معین الدین صاحب بہادر انصاری نے جج کے فرائض انجام دیئے۔ اردو ڈبیٹ میں اس کالج کے طلباء کے بلند معیار کے پیش نظر انہیں مقابلے سے مستثنیٰ کر دیا گیا تاکہ بیرونی ادارے ٹرافی حاصل کر سکیں۔ اس مقابلے میں ٹرافی اسلامیہ انٹر کالج شاہجہانپور نے حاصل کی۔ عجیب اتفاق ہے کہ شاہجہانپور کے انعامی مقابلے میں اس سال ہمارے طلباء ٹرافی جیت کر لائے تھے۔ انگریزی ڈبیٹ میں ٹرافی رضا لٹریری سوسائٹی مسلم اسکول مرادآباد نے جیتی۔ معزز صدر کے ارشاد کے مطابق۔ "کس قدر خوشگوار اتفاق ہے کہ رضا کالج کے انعامی مقابلے میں ٹرافی رضا لٹریری سوسائٹی نے حاصل کی۔"

علاوہ ازیں مقامی اردو، ہندی اور انگریزی کے مضامین اور تقاریر خاص دلچسپ رہیں۔ بیت بازی، مشاعرہ اور کوی سمیلن اور بھی زیادہ مقبول ہوئے۔ ان محافل میں رامپور اور بیرون رامپور کے اصحاب مثلاً جناب ذوق، جناب سجاد علی خاں صاحب اختر لکھنوی، پنڈت مدن موہن دیاس ہی مرادآبادی، عالیمرتبت رگھونندن کشور صاحب رضا شوق، جناب سحر، جناب شکیل، جناب زحمت، جناب اثر، اور جناب حشر رامپوری نے حصہ لیا اور کارکنان کالج کی ہمت افزائی فرمائی۔ اسپورٹس کے ذیل میں دوڑیں، کدائیاں، رسہ کشی، سائیکل کی دوڑ، جیولن تھرو، اور اس نوع کی دیگر جسمانی ورزشوں کا مظاہرہ کیا گیا۔ عالیمرتبت ارشاد اللہ خاں صاحب بہادر وزیر تعلیمات کے سامنے مارچ پاسٹ کیا گیا۔ صاحبزادے محمد یوسف صاحب بہادر نے اساتذہ کی دوڑ میں حصہ لیکر اپنی زندہ دلی، کالج سے دلچسپی اور وابستگی کی قابل قدر مثال قائم کی۔ اس ہفتہ کی ابتدا میلاد النبی کی مبارک تقریب سے ہوئی اور انتہا دو یوم کی چھٹی کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ طلباء کے لئے دونوں باتیں نہایت درجہ خوش کن تھیں۔

ٹریننگ اسکول میں سیرت النبی کا جلسہ

۲۰ فروری ۱۹۶۳ء بوقت ۳ ½ بجے سہ پہر زیر صدارت عالی مرتبت جناب صاحب ہوم منسٹر بہادر جلسہ عید میلاد منایا گیا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد چار بچوں نے نظمیں اور تین بچوں نے نثر کے مضامین پڑھے۔ مختار صاحب۔ سحر صاحب۔ رام بھروسے لال صاحب اور جمن لال صاحب نے بھی اپنی نظمیں اور نثر کا مضمون پڑھا۔ جناب صدر نے مختصر تقریر فرمائی اور جلسہ ختم ہوگیا۔ بعد میں بہانا ناشتے شام تک بچوں اور سوپا ٹیچران کی اشیا کی نمائش ملاحظہ کی۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔

ماڈل اسکول خسرو باغ میں میلاد النبی۔

زیر صدارت عالی مرتبت جناب صاحب ہوم منسٹر بہادر ۱۲ ربیع الاول یوم جمعہ مدرسہ میں میلاد النبی کا جلسہ ہوا۔ بچوں کے پروگرام کے بعد جناب حشر صاحب رامپوری نے مدح میں ایک نظم پڑھی جس کے بعد عالی مرتبت جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات نے بچوں کو مخاطب فرماتے ہوئے اخلاقِ محمدی پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی اور جلسہ جناب صدر کی تقریر پر ختم ہوا۔

دنیا سے تعلقات قائم رکھنے کا منصوبہ

ریاست رامپور کے اکثر و بیشتر ابتدائی مدرسے اس ماہ میں سیرت النبی کے منصوبے تیار کرتے رہے اور ان درسگاہوں کے اساتذہ بھی کافی دلچسپی سے ان منصوبوں کو کامیاب بنانے میں منہمک رہے۔ وقت اور موقع کی موزونیت پیش نظر رکھتے ہوئے دل چاہتا ہے کہ شفیلڈ کے ایک ابتدائی مدرسہ کا منصوبہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اس منصوبہ سے ترقی یافتہ قوموں کا بلند معیار اور ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسٹر گلور نے "دنیا کی کثیر آبادی" کے عنوان سے ایک تحقیقاتی بیان تحریر کیا اور شفیلڈ جونیر اسکول کے بچوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ گیارہ سال سے لیکر ۱۴ سال تک کے تقریباً ستر بچے اور بچیاں منصوبہ کی تکمیل میں لگ گئے۔ نقشہ اوقات میں ان طلباء کے لئے کوئی خاص وقت منصوبہ کی تیاری کا نہیں رکھا گیا۔ ہفتہ میں صرف ایک یوم اس کام کے لئے مخصوص تھا ابتدا میں بچوں کے ہمراہ اس بحث میں زیادہ وقت صرف ہوا کہ وہ اچھے شہری کیونکر بن سکتے ہیں۔ تین جلسوں کے بعد یہ طے پایا کہ سب سے پہلے تمامی عالم کے لوگوں کی عام ضروریات مثلاً ان کی غذا۔ پوشاک، تعلیم۔ قوانین۔ ذرائع آمد و رفت اور زندگی کے متعلق معلومات بہم پہونچائی جائے۔ چنانچہ ان ہی عنوانات کے ماتحت موضوعات مقرر کر دیئے گئے اور بچوں نے ہدایات خود اپنی پسند کے مطابق فرداً فرداً ایک موضوع اپنے لئے چن لیا مثلاً غذا پر تحقیقات کرنے والے جتھے نے دنیا کی پیداوار اور اس کے طریقہ تقسیم پر کام شروع کرتے ہی مختلف مقامات پر ایجنٹوں اور غلہ کے کاروبار کرنے والوں سے خط و کتابت جاری کر دی اور اسی طرح دوسرے جتھے بھی اپنے متعلق کئے ہوئے کاموں پر لگ گئے۔

بہت قلیل وقت میں بچے اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ دنیا کے لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اگر صحیح ذرائع و وسائل بہم پہونچائے جا سکیں۔ بچوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ غربت۔ جہالت، بیماری دور ہو سکتی ہے بشرطیکہ صحیح زندگی کا احساس انسانوں میں پیدا کرایا جا سکے اس منصوبہ میں وہ مسائل پیش پیش تھے جن سے نوجوانوں کو اپنی آنیوالی زندگی میں دوچار ہونا ہے اور جن بچوں نے اس میں حصہ لیا وہ بحیثیت دنیا کے شہری ہونے کے اپنی ذمہ داریوں سے کماحقہٗ آگاہ ہو گئے۔

محکمۂ تعلیم ریاست رامپور کا آرگن



تعلیم جدید



عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات حکومت رامپور

تعلیم جدید

چندۂ سالانہ .... پانچ روپے
فی پرچہ .... آٹھ آنے

مدیر - مرزا امجاد علی خاں اختر بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی (علیگ)

جلد ۱	رام پور - اپریل ۱۹۴۶ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

استادوں سے خطاب

عوام کا کالج

ریاست رامپور کے دارالحکومت میں ایک نئی قسم کا ادارہ قائم کرنے کی تجویز کچھ عرصے سے محکمۂ تعلیم کے پیش نظر تھی جس کو حکومت نے ازراہِ معارف پروری منظور کر لیا ہے۔ امید ہے کہ یہ ادارہ نہ صرف اس ریاست میں بلکہ غالباً ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا۔ اور اگر اس کو کامیابی اور معقولیت کے ساتھ چلایا جا سکا اور اس نیک کام میں پبلک کا تعاون حاصل ہوا تو ہم نہ صرف ریاست کی ایک مفید تہذیبی خدمت انجام دیں گے۔ بلکہ ہندوستان کے تعلیمی مستقبل کی تشکیل میں بھی تھوڑا سا حصہ لے سکیں گے

ہندوستان میں تعلیم کی پس ماندگی

اس ادارے کا نام اور کام بتانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر اور مقاصد کو واضح کر دیا جائے۔ تاکہ آپ اس کی واقعی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے اس ملک ہندوستان میں، جو صدیوں سے تہذیب کا ایک زبردست مرکز، بلکہ بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ تعلیم کس قدر پس ماندہ حالت میں ہے۔ یہاں خواندگی کی شرح اس قدر کم ہے کہ اس کو بیان کرتے ہوئے قومی خودداری کو دھکا لگتا ہے بس اتنا سمجھ لیجئے کہ افریقہ کے چند نیم وحشی قبیلوں کو چھوڑ کر غالباً دنیا میں کہیں **جہالت اور ناخواندگی کی لعنت اس قدر عام نہیں ہے جس قدر ہمارے ملک میں**۔ لہٰذا ملک کے سامنے ایک نہایت اہم اور فوری مسئلہ یہ ہے کہ جہالت کی لعنت کو دور کر کے تعلیم کو کس طرح عام کیا جائے۔ اس کے بغیر ملک میں کسی قسم کی مستقل اور دیرپا ترقی کا امکان ہی نہیں کیونکہ جب تک عام لوگ معمولی نوشت وخواند تک سے ناواقف ہوں گے۔ اور علم حاصل کرنے

کے دروازے ان پر بند ہوں گے، وہ نہ آج کل کی پیچیدہ اور مشکل زندگی کے مسئلوں کو سمجھ سکیں گے نہ اس بھول بھلیاں میں اپنا راستہ تلاش کر سکیں گے آپ کوئی مفید کام کرنا چاہیں خواہ سیاسی ہو یا سماجی، مذہبی ہو یا علمی، صنعتی ہو یا اقتصادی، اس کے لئے پڑھے لکھے سمجھدار اور اچھے خیالات اور جذبات رکھنے والے لوگوں کی ضرورت ہے جو اس کو چلا سکیں ورنہ بہترین تجویزیں اور پروگرام بھی ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دراصل کسی ملک یا قوم یا ریاست کی ترقی کا اصل مفہوم ہی یہ ہے کہ اس کے عوام بیدار، باخبر، خوش حال اور آزادی اور صلح و آشتی کے ساتھ مختلف قسم کے مفید مشاغل میں مصروف ہوں۔ ان میں سے بعض مشاغل انفرادی ہوں گے بعض اجتماعی لیکن اب ان کا مجموعی اثر قومی زندگی پر بہت خوشگوار پڑے گا تعلیم کا مقصد ملک میں اسی قسم کی ترقی کے امکانات پیدا کرنا ہے۔

صورت حال کی اصلاح کے دو طریقے

تعلیم کی اس اشاعت کے لئے دو ممکن طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بچوں کے لئے ایک ہمہ گیر نظام قائم کیا جائے۔ تاکہ رفتہ رفتہ نئی نسل کے تمام افراد تعلیم حاصل کر لیں۔ اس کے لئے لازمی ابتدائی تعلیم کا اجرا ضروری ہے جو دنیا کے تقریباً تمام متمدن ملکوں میں ہو چکا ہے لیکن ہندوستان میں ابھی اس کی ابتدا بہت چھوٹے پیمانے پر ہوئی ہے ہماری ریاست میں بھی بہت جلد اس کی داغ بیل پڑنے والی ہے لیکن ہندوستان میں جو تعلیمی صورت حال اس وقت ہے (اور وہی زیادہ شدت کے ساتھ ریاست میں پائی جاتی ہے) اس میں صرف بچوں کی تعلیم کا انتظام کر دینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور اگر ہوا بھی تو مدتوں میں جا کر ہوگا۔ اس لئے ابتدائی تعلیم کے ساتھ اس قومی تعلیم کے جہاد میں تعلیم بالغان کی تحریک کو بھی بہت بڑے پیمانہ پر اور نہایت مستحکم صورت میں رائج کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف چھوٹی عمر کے بچے کو جہالت سے محفوظ رکھا جائے اور دوسری طرف ناخواندہ بالغوں کی مناسب تعلیم کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ اپنے برے بھلے کو، اپنے حقوق و فرائض کو، اپنی ضرورتوں اور مقاصد کو پہچان سکیں اس دو طرفہ حملے کے بغیر قومی جہالت کا قلعہ سر نہیں ہو سکتا

ہندوستان میں تعلیم بالغاں کا آغاز اور ضرورت

ہندوستان میں گزشتہ چند سال سے تعلیم بالغاں کی تحریکیں کہیں کہیں شروع کی گئی ہیں لیکن بہت منظم اور مستقل طور پر نہیں، اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کہ تمام ملک اس کی زد میں آجائے لیکن بہرحال اِن سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچا ہے اور لوگوں میں ایک عام احساس پیدا ہو گیا ہے جو اپنی جگہ پر ایک مفید چیز ہے۔ سیاسی اور اقتصادی حالات اور بین الاقوامی واقعات نے حال میں اس احساس کو زیادہ شدید کر دیا ہے اور اب ایک ایسا موقع آپہونچا ہے کہ اگر حکومتیں اور رفاہِ عام کا کام کرنے والی تمام جماعتیں خلوص اور اشتراکِ عمل اور نظم و ترتیب کے ساتھ اس کام کو ہاتھ میں لیں تو امید ہوتی ہے کہ عوام پہلے کی نسبت زیادہ آمادگی سے اس تحریک کا خیر مقدم کریں گے اور اس میں کامیابی ہو گی۔ حکومت ہند نے بعد جنگ کی جو بڑی تعلیمی اسکیم بنائی ہے اس میں تعلیم بالغاں کی مقدم اہمیت کو صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اور بیس سال میں نو کروڑ لوگوں کو خواندہ بنانے کی ایک تجویز اس میں شامل کی گئی ہے جس پر اس مدت میں ساٹھ کروڑ روپے صرف ہوں گے یعنی حکومت کو بھی صورت حال کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی ہے کہ اس بڑے پیمانے پر کام کئے بغیر ہندوستان کا تعلیمی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

ریاست میں تعلیم بالغاں اور اس کے مسائل

تمام ملک کی طرح ہماری ریاست میں بھی چند سال ہوئے تعلیم بالغاں کی تحریک شروع کی گئی ہے۔ ابتدا میں یہ کام بہت جوش اور تیزی کے ساتھ چلا لیکن بعد میں دھیما پڑ گیا۔ ہندوستانی سیرت کی ایک عام کمزوری ہے کہ ہم ابتدا میں ہر تحریک کا نہایت جوش کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں لیکن بعد میں استقلال اور صبر کے ساتھ اس کو نہیں چلاتے جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ چراغ کی لو نیچی ہوتی جاتی ہے اور روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ اس کمزوری کا علاج کرنا تعلیمی اور قومی

کارکنوں کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ بہرحال اس سال سے اس کو دوبارہ باقاعدہ طور پر منظم کیا گیا ہے اور کوشش یہ ہے کہ کام اس انداز سے کیا جائے کہ اس میں نمائش کا عنصر نہ ہو بلکہ ٹھوس اور عملی نتائج مرتب ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آثار اور قرائن اچھے ہیں اور کم سے کم شہر رامپور میں حکومت کے بعض محکموں نے، پبلک نے اور با اثر اور سربرآوردہ حضرات نے کشادہ دلی کے ساتھ اس کام میں مدد دی ہے اگر یہ صورت حال قائم رہی (اور محکمے کی ہر ممکن کوشش یہ ہے کہ ایسا ہی ہو) تو امید ہے کہ چند سال کے اندر ہم ناخواندگی کے بوجھ کو بہت کچھ ہلکا کر سکیں گے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ان مرکزوں میں جو بالغوں کی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ انہیں نہ صرف لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے (یہ ضروری ہیں لیکن محض علم حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ بجائے خود علم کا بدل نہیں) بلکہ دلچسپ طریقوں سے صحیح اور مفید معلومات بھی ان تک پہونچائی جائیں اور انہیں حفظانِ صحت، شہریت اور دور حاضر کے بڑے بڑے اور ضروری مسائل سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان میں ذہنی بیداری اور دلچسپی پیدا ہو اور ان کی زندگی میں، جو گھٹ کر ایک "جوئے کم آب" بن گئی ہے، کچھ وسعت، اور فراخی راہ پائے۔ کس قدر تکلیف دہ اور عبرتناک ہے یہ خیال (ہر کسی کے لئے نہیں، صرف ان لوگوں کے لئے جن کے پہلو میں دلِ دردمند ہے) کہ ہمارے بیشتر ہم جنسوں اور ہم وطنوں کی زندگی ایسی تنگ اور محدود اور روکھی پھیکی ہے کہ ان کے لئے سوائے تلاش معاش، یا چند ناگزیر فرائض حیات کی ادائیگی کے اور کچھ کرنے کا امکان نہیں اور انہیں علم اور ادب اور سائنس اور ترقی و تہذیب کے خزانوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملتا! اس سماجی اور تمدنی ناانصافی کو دور کرنا نہ صرف حکومت کا فرض ہے بلکہ ان تمام جماعتوں اور افراد کا فرض بھی ہے جن کو حسن اتفاق سے اس مادی اور تہذیبی دولت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ اگر ہم علم اور تہذیب کی دولت میں محروموں کو شریک نہ کریں۔ تو اس اہم فرض کو پورا نہ کریں گے جو سماج کی طرف سے ہم پر واجب الادا ہے۔ اس لئے محکمۂ تعلیمات کی فی الحال ایک بڑی کوشش یہ ہے کہ ان تعلیمی مرکزوں کو عوام کی علمی اور ذہنی اور سماجی دلچسپیوں کا مرکز

بھی بنایا جائے۔ یہ کام آسان نہیں ہے کیونکہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ان شوقوں کی چنگاری ہر شخص کے دل و دماغ میں موجود ہوتی ہے لیکن کشمکش حیات کے بوجھ نے اس کو افسردگی اور بے اعتنائی کی راکھ میں دبا دیا ہے۔ اسے کرید کر نکالنا بہت صبر طلب کام ہے لیکن اس کو نکالے بغیر انسان کی زندگی نہ مکمل ہو سکتی ہے نہ روشن۔ بلکہ وہ حیوانوں کی سی زندگی پر قناعت کر لیتا ہے لہٰذا محکمۂ تعلیم کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں سے میری یہ درخواست ہے کہ جس طرح ممکن ہو سکے وہ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے جد و جہد کریں۔ اس کام کی بنیاد ڈالی جا چکی ہے لیکن اس کی تکمیل صرف محکمۂ تعلیم کے بس کی چیز نہیں۔ یہ ذمہ داری سب کو مل جل کر اٹھانی ہے۔

خواندہ لوگوں کی مزید تعلیم کا مسئلہ

یہ مرکز زیادہ تر ان بالغوں کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں جو معمولی نوشت و خواند بھی نہیں جانتے، کیونکہ انہیں بچپن میں کسی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن ظاہر ہے کہ ان بالغوں کے علاوہ ہر شہر اور قصبے میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو بچپن میں ابتدائی یا ثانوی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد کوئی ملازمت یا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں، لیکن مدرسہ یا کالج چھوڑنے کے بعد وہ مکروہات دنیا میں اس طرح گرفتار ہو جاتے ہیں کہ باوجود لکھنا پڑھنا جاننے کے ان کا مطالعے سے یا علوم و فنون سے بلکہ تہذیب کے کسی شعبے سے بھی کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تعلیم ان کی شخصیت اور ان کے قلب و دماغ پر کوئی گہرا تشکیلی اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس کی بدولت نہ ان کے دماغ میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔ نہ قلب میں گداز نہ معلومات میں وسعت۔ سوائے روزی کمانے کے اور انہیں تعلیم سے کوئی مستقل فائدہ نہیں پہنچا۔ چونکہ ان لوگوں کو سوسائٹی میں اچھا خاصا اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے اس لئے قومی تہذیب اور تمدن کا معیار بلند کرنے کی کوشش میں ان کی مزید تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے اور ان کی علمی اور ادبی ذوق کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے لیکن اس وقت بدقسمتی سے یہ انتظام نہ ہماری ریاست میں ہے نہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں۔ بے شک بعض لوگوں نے کہیں کہیں علمی اور ادبی

انجمنیں وغیرہ قائم کی ہیں لیکن اول تو ان کی تعداد اور ان کا دائرہ محدود ہے اور ان سے ملک کے عالم گیر مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا، دوسرے اس قسم کی انجمنیں بالعموم زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کی پذیرائی کرتی ہیں جن کو خاص خاص علوم و فنون میں دلچسپی ہوتی ہے، وہ بہت بڑا طبقہ جس نے تھوڑی سی تعلیم پائی ہے اور جس کے افراد میں علمی اور ادبی ذوق اور دنیائے فکر کی دلچسپیاں پختہ نہیں ہو سکیں، اس قسم کے اداروں سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور شاید نہیں اٹھا سکتا۔ ہمارے ملک اور ہماری ریاست کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے ایک ایسا موزوں اور سازگار تعلیمی ماحول مہیا کیا جائے جہاں وہ اپنی خوشی اور شوق سے آئیں اور تہذیب کے اس سرمائے سے مستفید ہوں جس سے وہ محروم رہے ہیں لیکن اس کی ضرورت خود محسوس کرتے ہیں یا انہیں یہ ضرورت محسوس کرائی گئی ہے۔ ہم لوگوں کی طرح ان کا بھی یقیناً یہ حق ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور اپنی صلاحیتوں کی تربیت کریں اور جو امکانات ان میں پوشیدہ ہیں ان کو بروئے کار لائیں۔ جدید نفسیات اور عمرانیات نے اس اہم حقیقت کو پوری طرح تسلیم کر لیا ہے کہ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے جو زندگی بھر جاری رہتا ہے، دس یا بیس بائیس سال کی عمر میں ختم نہیں ہو جاتا۔ دراصل وہی شخص زندہ کہلانے کا مستحق ہے جس میں درسی اور رسمی تعلیم کے ختم ہو جانے کے بعد اپنی تعلیم کو خود جاری رکھنے کی صلاحیت ہو۔ اور وہی قوم زندہ اور ترقی یافتہ کہلانے کی مستحق ہے جس نے اپنے تمام افراد کے لئے ایسا انتظام کر دیا ہو کہ وہ اپنے تمدنی ورثے مثلاً ادب، آرٹ، سائنس، سماجی علوم وغیرہ میں سے اپنے جائز حقوق حاصل کر سکیں اور اس طرح اپنے ذہنی ارتقاء کے سلسلے کو جاری رکھیں۔

دوسرے ملکوں کے تعلیمی تجربے

اس طبقے کی تعلیمی اور تہذیبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف ملکوں میں مختلف قسم کے ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ مقامی حالات کے اختلاف کی وجہ سے ان کی تنظیم مختلف ہے لیکن سب کا مشترک مقصد یہی ہے کہ عام لوگوں کے تہذیبی معیار اور علمی کارکردگی

کو بہتر بنایا جائے۔ اس ضمن میں ڈنمارک کے (Folk Schools.) لوگوں کے مدرسے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں ایسے لوگوں کو چند ماہ یا چند سال تک علوم و فنون کی تعلیم دینے کا انتظام کیا جاتا ہے جو اسکول کی مروجہ تعلیم ختم کرنے کے بعد زراعت، تجارت یا کارخانوں وغیرہ کے کام میں لگ جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے شوق سے کام چھوڑ کر کچھ عرصے کے لئے ان رہائشی مدرسوں میں آکر رہتے ہیں اور ان کے استادوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ڈینش تہذیب کے خزانے بہ اسلوبِ مناسب ان طلبہ کے سامنے پیش کریں۔ یہ طلبہ جو زندگی کے عملی تجربوں کی بھٹی میں سے گزر کر آتے ہیں۔ عام طلبہ کی نسبت اس نعمت کی زیادہ قدر کر سکتے ہیں۔ ان مدرسوں کا اصول کار یہ ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے زبردستی کوئی مضامین نہ پڑھائیں، بلکہ جن چیزوں کی طلبہ خود خواہش ظاہر کریں وہی ان کو دی جائیں، خواہ وہ ادب اور تاریخ ہو یا آرٹ اور دستکاری یا فلسفہ اور مذہب،۔۔ تعلیم میں گفت و شنید، بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیالات کا طریقہ اختیار کیا جائے تاکہ وہ جو کچھ حاصل کریں ان کے دل و دماغ کی ملکیت بنے محض حافظے پر بار نہ ہو اس قسم کے اداروں نے ڈنمارک کے لوگوں میں نہ صرف ایک غیر معمولی تہذیبی بیداری پیدا کر دی ہے بلکہ ان کی عملی کارکردگی، ان کی زرعی صلاحیت، ان کی امداد باہمی کی تنظیم وغیرہ پر بھی بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔ اسی طرح بہت سے دوسرے ملکوں، خصوصاً روس اور امریکہ میں پڑھے لکھے بالغوں کی مزید تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر مستقل انتظامات کئے گئے ہیں تاکہ افراد یا سوسائٹی کی غفلت کی وجہ سے انفرادی صلاحیتوں کا خون نہ ہونے پائے۔ انگلستان میں جو نیا تعلیمی ایکٹ ۱۹۴۴ء میں پاس ہوا ہے اس میں ایسے اداروں کے قیام کی ایک مکمل تجویز شامل ہے جس کی رو سے وہاں ملک کے ہر حصے میں (County Colleges.) قائم کئے جائیں گے جن میں مقامی حالات اور لوگوں کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی ذہنی، عملی اور شہری تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے گا۔ دوکانوں اور کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے والے تمام مزدوروں کو اس مقصد کے لئے قانوناً چھٹی مع تنخواہ کے دی جائے گی تاکہ وہ مقررہ مدت کے لئے تعلیم حاصل کریں۔ پڑھنے والوں کی سہولت کا خیال کر کے شہروں میں بالعموم ہفتے میں ایک پورے دن یا دو آدھے دنوں کی حاضری لازمی ہوگی اور دیہات میں جہاں زراعت کے مشاغل

نوعیت کا لحاظ ضروری ہے، سال میں آٹھ ہفتے مسلسل یا دو مرتبہ چار چار ہفتے اِن کالجوں میں حاضری دینی ہوگی۔ یہ قانون فی الحال ان تمام بالغوں پر عائد ہوگا جن کی عمر ۱۵-اور ۱۸ سال کے درمیان ہے اور جو لازمی ابتدائی تعلیم کی مدت ختم کرنے کے بعد کسی باقاعدہ ثانوی مدرسے میں تعلیم نہیں پا رہے ہیں۔ اس ایکٹ کے مطالعے سے اور جو مشاہدہ میں نے حال ہی میں خود انگلستان جا کر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب حکومت اور پبلک اس بات پر قانع نہ ہوگی کہ عوام کو بہلانے کے لیے چند گھٹیا قسم کے ادارے قائم کر دئے جائیں جو مختصر اور مستعار عمارتوں میں قائم ہوں، جہاں معمولی قابلیت اور شخصیت کے تھکے ہوئے استاد تعلیم دیں اور جہاں بالغوں کے لیے محض چند رسمی مضامین یا مفید ہنر سکھانے کا انتظام ہو اور ادب، آرٹ، شاعری، سیاسی، اور معاشی مضامین اور سائینس کی انقلاب آفریں تعلیم سے انہیں محروم رکھا جائے، میں نے بعض وہ عمارتیں دیکھی ہیں جو اس مقصد کے لئے حاصل کی جا رہی ہیں۔ ان کی وسعت، ساز و سامان، اور امکانات کو دیکھ کر رشک آتا ہے!

حکومت کے اس اقدام سے پہلے ہی بعض مقامی جماعتوں نے اس قسم کے ادارے قائم کئے تھے جن میں سے سب سے زیادہ قابل ذکر کیمبرج کے قریب گاؤں کے کالج ہیں جن کو ایک صاحب نظر معلم ولیم موریس (William Morris) نے قائم کیا ہے اور جن کے ذریعے ان دیہاتوں میں ایک ایسی متنوع اور حیات آفریں تعلیمی فضا پیدا ہو گئی ہے جس نے گاؤں والوں کی زندگی کو مالا مال کر دیا ہے۔

انگلستان کی وزارت معارف نے ان جدید کالجوں کے جو مقاصد اپنے شائع کردہ پمفلٹ (County Colleges) میں بیان کئے ہیں ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

۱- نوجوانوں اور بالغوں کو اصول صحت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم دینا اور باقاعدہ جسمانی ورزش اور تربیت کے لئے سہولتیں بہم پہونچانا۔

۲- ان کی سمجھ اور معلومات میں اضافہ کرنا تاکہ اٹھارہ سال کی عمر تک ان میں مندرجۂ ذیل صلاحیتیں پیدا ہو جائیں۔

(الف) کسی کام کو شروع کر کے اس کو توجہ، دلجمعی اور باقاعدگی کے ساتھ تکمیل تک پہونچانا۔

(ب) اپنی فرصت کے وقت کو اس طرح استعمال کرنا کہ ان مضامین سے بہتر واقفیت حاصل ہو جن میں انہیں

دلچسپی ہے اور نئے علوم و فنون سیکھنے کا شوق پیدا ہو۔
ج ۔ موسیقی، ڈراما، آرٹ، ادب اور علمی تحقیق کے ذوق کے ذریعے تخیل کی تربیت ۔
د ۔ زبان انگریزی سے اچھی واقفیت اور اس کے صحیح استعمال پر قدرت ۔
ہ ۔ صالح سماجی زندگی میں خاندان کی اہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کا صحیح احساس ۔
و ۔ اپنے ملک کے عام حالات اور ان کو بہتر بنانے کے طریقوں سے واقفیت ۔
ز ۔ دوسرے ملک کے باشندوں کے متعلق صحیح معلومات کی فراہمی ۔
ح ۔ اس بات کا سچا احساس کہ ایک جمہوری جماعت میں کامیاب شہری بننے کے لئے قیادت اور مل جل کر خدمت کرنے کی صلاحیت دونوں ضروری ہیں ۔
۴ ۔ ان کی سیرت کی اس طرح تربیت کرنا کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رواداری اور مہربانی کا سلوک کریں ۔ عزت نفس کا خیال رکھیں اور زندگی کے مسائل کے متعلق ان کا ایک آزاد اور متوازن نقطۂ نظر ہو ۔

رام پور میں عوام کی تعلیم کے لئے کالج

جو کام ریاست میں شروع کرنے کا خیال ہے اس کا تعلیمی اور بین الاقوامی پس منظر ضروری تھا تاکہ آپ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اس قسم کی تحریک کی اہمیت کیا ہے ۔ اور اس ضمن میں دوسرے ملکوں میں کیا کام کیا جا رہا ہے ۔ اس موازنے سے یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب ان ملکوں میں، جہاں مدتوں سے لازمی تعلیم جاری ہے اور عام تہذیبی وسائل مثلاً کتابیں اور رسالے، کلب اور انجمنیں، تصویر خانے اور عجائب خانے وغیرہ، بہت زیادہ وافر ہیں، اس قسم کے اداروں کا قیام ضروری ہے ۔ تو ہمارے ملک میں ان کی کتنی زیادہ ضرورت ہے جہاں بیشتر لوگوں کی زندگی تاریکی میں بسر ہو رہی ہے اور جو لوگ تعلیم پاتے بھی ہیں وہ بھی مدرسے اور کالج کو چھوڑنے کے بعد دنیائے علم و ادب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں! لہذا اس ضرورت کا احساس کر کے حکومت رام پور نے طے کیا ہے کہ اس تحریک کے پیش خیمے کے طور پر سب سے پہلے خاص شہر رام پور میں ایک (**عوام کا کالج**) قائم کیا جائے جس کو شہر کے عام لوگوں کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی کا مرکز بنایا جائے ۔ اس میں ایسا انتظام پیش نظر

ہے کہ مختلف قسم کی دلچسپیاں اور ذوق رکھنے والے حضرات یہاں آکر کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کر سکیں، مختلف مباحث کے متعلق تقریریں سن سکیں، خاص خاص مضامین اور مسائل کا مطالعہ کرنے اور ان پر بحث و مباحثے کے لئے چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہوں، جن میں ہم خیال لوگ جمع ہو کر تبادلہ خیال کر سکیں، لیکن یہ کالج کا ایک مقصد ہے، اس کے علاوہ ایسی تقریبوں کا انتظام بھی کیا جائے گا جو تربیتِ ذوق میں معین ہو سکیں، مثلاً تصویروں کی نمائش، مشاعرہ، افسانہ گوئی وغیرہ۔ بشرطِ امکان آرٹ اور مناسب قسم کی دستکاریاں سکھانے کا اہتمام بھی ہوگا تاکہ مختلف قابلیت اور مزاج کے لوگ کالج سے فائدہ اٹھا سکیں، علاوہ ان لوگوں کے جو محکمۂ تعلیمات سے تعلق رکھتے ہیں اور باقاعدہ کالج کے کام میں شریک ہوں گے، یہ کوشش بھی ہوگی کہ اندرونِ ریاست اور بیرونِ ریاست کے دوسرے ایسے اشخاص کا تعاون بھی حاصل کیا جائے۔ جو کسی خاص علم یا فن یا ہنر میں مہارت رکھتے ہیں۔ اور وہ دوسروں کے سامنے اپنے خاص مضمون کو قابلیت اور دلچسپی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ غرض ہر وہ علمی، ادبی اور مجلسی تحریک اور شغل جو لوگوں کے تہذیبی معیار کو بلند کر سکے اور ان کی ذہنی محرومیوں کی تلافی کر سکے۔ اس کالج کے "نصاب" میں شامل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ لوگوں کا شوق اس کی طرف توجہ کرے اور اُن کی آمادگی اور تعاون کارکنوں کی ہمت بڑھائے اور ہمارے مادی وسائل ہمیں اس کو شامل کرنے کی توفیق دیں۔

کالج کے اصول

اس تعارفی پمفلٹ میں میرا مقصد کالج کے نصاب کی تفصیل دینا نہیں ہے۔ کیونکہ ایک نیا کام ہے جس کے لئے کوئی بنا بنایا نصاب نہ موجود ہے نہ اس کو عائد کرنا مناسب ہوگا۔ یہ نصاب تو تجربے، بحث و مباحثے اور تبادلۂ خیال کے بعد مرتب ہو سکتا ہے اور اس میں پڑھنے والے اور پڑھانے والے، سیکھنے والے اور سکھانے والے برابر کے شریک ہوں گے، بلکہ شاید بالغ طلبہ کی رائے اس میں زیادہ اہمیت رکھے گی۔ کیونکہ

ہمیں ان کے رجحانِ طبع اور ان کی ضروریات کو اپنا راہبر بنانا ہے۔ کام کو شروع کرنے کے لئے کچھ عرصے کے واسطے ہمیں ایک مختصر سا پروگرام بنانا ہوگا۔ لیکن اسی کی ترمیم اور توسیع اور آئندہ کے لئے پروگرام کی ترتیب کے لئے باہمی مشورے اور مل جل کر غور کی ضرورت ہوگی۔ کارکنوں کو بچوں اور بالغوں کی تعلیم کے اس فرق کو واضح طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

بچوں کے لئے ایک حد تک وہ نصاب مقرر کیا جاتا ہے جو استاد اور ماہرین تعلیم اپنی عقل اور تجربے کی بنا پر ان کی تربیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ طریقۂ تعلیم کے تعین میں یقیناً بچوں کے رجحانات اور ردِّ عمل کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن یہ طے کرنا استاد کا فرض ہے کہ بچوں سے کس کس قسم کا کام کرانا چاہیئے اور انہیں کیا کیا مضامین پڑھائے جائیں۔ اس میں وہ ان کی فطری ضرورتوں اور جبلتوں کا احترام کرتا ہے۔ اور جدید تعلیم کا مطالبہ بھی یہ ہے کہ وہ ان کا پورا لحاظ رکھے لیکن انتخاب کا حق استاد ہی کا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے تعلیم بالغان میں خصوصاً اس اعلیٰ سطح پر جو اس وقت پیش نظر ہے، حق انتخاب استاد سے زیادہ پڑھنے والوں کو حاصل ہونا چاہیئے۔ وہ بتائیں گے کہ انہیں کون سے مضامین اور مسائل میں یا آرٹ میں یا دستکاریوں میں خاص دلچسپی ہے۔ اور کالج جہاں تک ممکن ہوسکے گا۔ ان کی ذہنی اور ذوقی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی معلموں کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور علمی شوقوں کے اثر سے طلبہ میں نئی علمی دلچسپیاں پیدا کریں اور بغیر محسوس طور پر ان کی رہنمائی اس "ملک معنی" کی طرف کریں جس میں داخل ہوئے بغیر کوئی شخص اپنی انسانی میراث کا حق دار نہیں بنتا۔ اس فرض کو ادا کرنے میں انہیں بہت صبر، خلوص، عیب پسندی اور انسان دوستی سے کام لینا ہوگا۔ صبر اس لئے کہ ان خوابیدہ یا افسردہ قوتوں کو جگانا، جن کو زمانے کے ناسازگار حالات نے دبا دیا ہے، بہت مشکل کام ہے اور اس میں اکثر انہیں لوگوں کی بے اعتنائی اور سرد مہری بلکہ مخالفت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ خلوص اس لئے کہ اس کے بغیر محنت اور کوشش ابتدائی جوش اور طبع کی منزلوں سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ عیب پسندی کا اور انسان دوستی

اس لئے کہ جب تک ان کی شمع کسی شخص کے دل میں روشن نہ ہو اُسے کیا پڑی ہے کہ وہ بلا معاوضہ یا کسی برائے نام معاوضے کی خاطر اپنی فرصت اور اپنا آرام دوسروں کی خدمت کے لئے قربان کرے جبکہ اُس کو ان سے محض زبانی اعتراف اور ستائش تک کی توقع نہ ہو؟ لہٰذا اس میدان میں وہی شخص قدم رکھے جس میں یہ صفات موجود ہوں اور جو بہت جلد مشکلات سے گھبرا نہ جاتا ہو۔

اشتراکِ عمل کی اپیل

یہ ایک بہت مشکل اور بڑا کام ہے جس طرف میں نے توجہ دلائی ہے۔ لیکن اس کی جو ابتدا اس وقت محکمۂ تعلیم کر رہا ہے وہ بہت مختصر اور محدود ہے۔ اس کی ایک وجہ تو عمارت کی تنگی ہے (فی الحال رضا اکیڈمی کی عمارت باجازت ارکین استعمال کی جائے گی) اور دوسری زیادہ بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک نیا کام ہے جس کا پہلے سے کارکنوں کو تجربہ نہیں ہے اس لئے اسے کر کے سیکھنا ہے۔ جوں جوں تجربہ ان کی رہنمائی کرے گا اور پبلک کا تعاون اُن کی ہمت بڑھائے گا۔ کام کا حلقہ وسیع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لہٰذا اس کام کے آغاز کے وقت میں تمام پبلک سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس نئے ادارے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ تمام ذی اثر حضرات سے اپیل کرتا ہوں، خواہ ان کا تعلق حکومت سے ہو یا اسمبلی سے یا میونسپل بورڈ سے یا رائے عامہ کی رہبری سے، کہ وہ اس کام میں محکمے کا ہاتھ بٹائیں۔ اور لوگوں کو اس طرف توجہ دلائیں اور محکمۂ تعلیم کے کارکنوں اور دوسرے تعلیم یافتہ حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کالج میں ایک متنوع اور موزوں نصاب کی ترتیب وتنظیم میں مدد دیں۔ یہ اپیل محض محکمۂ تعلیم کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اس میں اعلیٰ حضرت اور ان کی حکومت بھی شامل ہے۔ جن کو ریاست کی تعلیمی ترقی اور عوام کا تعلیمی مفاد دل سے عزیز ہے اور جن کی زبردست خواہش ہے کہ ریاست کے لوگوں کا تعلیمی اور تہذیبی معیار بہتر ہو اور ہم ملک کے سامنے اس میدان میں سرخرو ہو سکیں۔

خواجہ غلام السیدین

تعلیمی مضامین

ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم

ذیل میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کا وہ صدارتی خطبہ درج کیا جاتا ہے، جو صاحب موصوف نے نیو ایجوکیشنل فیلوشپ لاہور کے جلسہ میں پڑھ کر سنایا تھا۔ (مدیر)

بھائیو! اور بہنو! سب سے پہلے، آپ کا شکریہ ادا کرنے سے بھی پہلے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ عام دستور کے خلاف آپ کی خدمت میں یہ خطبہ اپنی مادری زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ اس کے کرنے پر معافی مانگ رہا ہوں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اگر کسی دوسری زبان میں آپ کو مخاطب کرتا تو عذر خواہ ہوتا۔ لیکن ہماری مجلسوں کے عام دستور نے صورتِ حال کو بالکل الٹا کر دیا ہے۔ انگریزی ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بن گئی ہے، وہ اسی میں پڑھتے ہیں، اسی میں لکھتے ہیں۔ اور اگر کبھی سوچتے ہیں تو شاید اسی میں سوچتے ہیں۔ جب اہلِ علم کی کسی مجلس میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو اپنے افکار انگریزی الفاظ ہی کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا، اس سے مجھے اس وقت بحث نہیں۔ اچھا ہوا یا برا، اس پر بھی کچھ عرض کرنا نہیں، صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں تعلیم کسی ایک چھوٹی سی ذات کے ساتھ مخصوص رہنے والی نہیں ہے۔ اگر اس ملک کے بسنے والے جانوروں کے گلوں کی طرح نہیں بلکہ آدمیوں کی جمعیتوں کی طرح زندگی گذارنے پر مصر ہیں، اگر یہاں کی حکومت کسی چھوٹے سے طاقتور یا چالاک گروہ کا اجارہ نہیں بلکہ یہاں کے جمہور کی مرضی کے مطابق ہونے والی ہے، تو علمی زبان کے معاملے میں صورتِ حال بدلے گی اور جلد بدلے گی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں انگریزی زبان کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم نے انگریزی زبان کی معرفت بہت کچھ سیکھا ہے، جانتا ہوں کہ بہت کچھ اس سے ابھی سیکھنا ہے، اس نے ہمارے خیالات کے جمود میں حرکت پیدا کی۔ اس نے ہمیں مغرب کے علوم و فنون، صنعت و حرفت، تمدن و افکار سے آشنا کیا۔ اس نے سیاست اور معیشت کے نئے اسلوبوں سے ہمیں آگاہ کیا۔ اس کی

ہم پر بڑا احسان ہے اور اس سے ابھی اور بہت کام لینا ہے کہ ہم ہیں اور مغربی تمدن میں یہی ایک واسطہ شاید
دیر تک قایم رہنے والا ہے۔ لیکن جہاں میں یہ سب جانتا ہوں، وہاں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم انگریزی
جاننے والوں نے جو ایک نئی ذات اس ملک میں بنالی ہے، اس نے غیر شعوری خود غرضی سے ہر ذات
کی طرح اپنے مخصوص فوائد کو اپنے تک محدود رکھنے کی بھی کوشش کی ہے، اس نے اپنے علم کو اپنے
تفوق کا ذریعہ بنایا ہے۔ جو سیکھا وہ سکھایا نہیں۔ خواص کو جو حاصل ہوا عوام تک نہیں پہنچایا گیا، اپنے
کو سیراب کیا ہے اور قوم کو پیاسا رکھا ہے، اور چونکہ علم و حکمت کے خزانے بانٹنے سے گھٹتے ہیں اور لٹانے
سے بڑھتے ہیں، اس لئے اس طبقے کی خود غرضی نے اسے بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی قوم کی حقیقی
زندگی سے بے تعلقی نے انھیں اپنے دیس میں پردیسی بنا دیا۔ وطن میں جلا وطن کر دیا۔ ان کے افکار
میں جودت پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کے کردار کو خلوص سے بہرہ یاب نہیں ہونے دیا۔ ان کی زبان
کو مانگے کی گفتگوئیں اور ان کے دلوں کو مانگے کی آرزوئیں اقبال نے سچ کہا ہے ؎

بر زبانش گفتگوہا مستعار
در دلِ او آرزوہا مستعار

خیر، یہ جو ہوا سو ہوا، ہمیں اب جلد سے جلد اسے بدلنا چاہئے۔ خصوصاً تعلیم کا کام کرنے والوں کو اس
میں ذرا دیر نہ کرنی چاہئے۔ اپنی راہ سے ایک پردیسی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی مصیبت کو ہٹائیں اور
ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لئے جو کانفرنس یہاں جمع ہے، اس کے
ارکین کو تو جاننا چاہئے کہ ان کا سارا کام بچوں میں اور بچوں کے والدین کے ساتھ مادری زبان ہی کے
ذریعہ ممکن ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں یہ خطبہ دینے پر معافی مانگنا کچھ بہت ضروری تو نہیں ہے لیکن
رسم و رواج کے مطالبے سخت ہوتے ہیں، ہماری علمی مجلسوں میں مادری زبان کو راہ ملنا ابھی نئی بات
ہے۔ میں آپ سے اجازت لئے بغیر اسے یہاں لے آیا ہوں۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں، اگرچہ اس
عذرخواہی میں تھوڑا سا گلہ، اور تھوڑی سی تنبیہ ضرور شامل ہے۔

آپ اس مجلس میں ابتدائی تعلیم اور اس سے پہلے کی تعلیم دونوں کے متعلق غور و بحث کرنے والے ہیں۔
میں نے ابتدائی تعلیم کے مسائل پر سوچنے اور کام کرنے میں کچھ وقت ضرور صرف کیا ہے لیکن اس سے پہلے کی تعلیم
کے متعلق اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ اس سے ذاتی تجربے سے اس پر کچھ عرض نہیں کر سکوں گا، البتہ لازمی
بنیادی تعلیم کی حمایت کی وجہ سے بعض احباب نے مجھ پر یہ شبہ کیا ہے کہ میں اس سے پہلے کی تعلیم و تربیت کو

شاید کچھ اہمیت نہیں دیتا اور اس کے مسائل کو قابل توجہ نہیں سمجھتا، وہ درست نہیں ہے، انفرادی عملی زندگی میں ایک وقت میں ایک چیز کا اصول اکثر کارآمد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی دوسری سب چیزوں سے غفلت یا بے تعلقی نہیں ہوتے ۔ بنیادی تعلیم کی ضرورت پر اسے مفت اور لازمی بنانے پر پچھلے چند سال میں بجا طور پر ہر جگہ زور دیا جاتا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس بنیادی تعلیم کی منزل سے پہلے کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اب تک اس ابتدائی عمر میں تربیت کے مسئلے کو زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ زندگی کی بعض بنیادی عمارتوں کے بننے بگڑنے میں یہ زمانہ بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ چاہے جسمانی نشو ونما کو دیکھئے کہ عمر کے پہلے ہی سال میں بچہ کا وزن پیدائش کے وقت سے کوئی تگنا ہو جاتا ہے اور پھر ساری عمر کبھی اس تیز نسبت سے نہیں بڑھتا۔ یا پہلے ۱۸ مہینے میں دماغ کے وزن میں جتنا اضافہ ہوتا ہے پھر کبھی اتنی مدت میں اتنا نہیں ہوتا۔ نظام اعصابی اور حسی اعضا کا بھی یہی حال ہے، بدن کے اس تیز بڑھاؤ کی وجہ سے ہی یہ زمانہ تندرستی کے لئے خطروں سے پر زمانہ ہے۔

ہمارے ملک کا تو کہنا ہی کیا، یہاں کی فضا میں جو ہزار بچے پہلا سانس لیتے ہیں ان میں سے پونے دو سو کے قریب تو طفلی کی منزل سے آگے ہی نہیں بڑھ پاتے ۔ دوسرے ممالک میں بھی جہاں زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے اور بچے زندگی کے دسترخوان پر ناخواندہ مہمان کی حیثیت نہیں رکھتے وہاں بھی یہ خطرے ننھی ننھی جانوں کو انگیزنے پڑتے ہیں، امریکہ میں بھی ساری اموات کا ایک تہائی ۶ سال سے کم عمر والوں کے حصہ میں آتا ہے۔ انگلستان میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۹۰ فیصدی بچے تندرست پیدا ہوتے ہیں مگر جب ۵ سال کی عمر میں مدرسہ جاتے ہیں اور وہاں طبی معائنہ ہوتا ہے تو ایک تہائی سے زیادہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں، کہیں غذا کی وجہ سے، چاہے کمی سے، چاہے زیادتی سے، کہیں متعدی امراض کے نتیجہ کے طور پر، کہیں گھر کے مضر صحت طبعی ماحول کی بدولت کہیں گھر کی نفسیاتی الجھنوں کے کھینچ تان کے اثرات سے۔ اور جہاں ان حالات کو بدلا گیا ہے وہاں یہ صورت بھی بدل جاتی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اچھی تربیت گاہوں میں جاکر بچوں کی صحتیں درست ہو جاتی ہیں، بیماریاں بھاگ جاتی ہیں، دانتوں کی حالت بہتر ہو جاتی ہے اور پہلے کے مقابلہ میں قد اور وزن تیزی سے بڑھتا ہے پھر یہی نہیں کہ یہ زمانہ بچہ کی جسمانی نشو ونما ہی کے

اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہو، سیکھنے کی رفتار بھی جسمانی بڑھاؤ کی رفتار سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ اسی زمانہ میں بچہ حواس کا استعمال سیکھتا ہے، ان کی مدد سے اپنے ماحول کی پہچان حاصل کرتا ہے جسم کے پٹھوں پر قابو حاصل کرتا ہے حسی اور حرکتی تجربہ میں تطابق پیدا کرتا ہے۔ چلنا سیکھتا ہے، بولنا سیکھتا ہے ۲½ -۳ سال کی عمر میں اپنی مادری زبان کو کام چلانے کے لایق سیکھ چکتا ہے۔ چیزوں کے روابط باہمی کا درک اسے ہونے لگتا ہے، تعقل کی راہ پر اسی عمر میں گامزنی شروع کر چکتا ہے اور تجربہ کے جذباتی پہلو میں تو اس کے نشو ونما کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے کہ جاننے والے کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں اس کی سیرت کی بنیادیں پڑ چکتی ہیں۔ زندگی کا اور کونسا زمانہ اتنی اور ایسی بنیادی اہمیت رکھنے والی تحصیلات سے پر ہوگا۔ ؟

نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہماری قومی زندگی کی تشکیل اور تنظیم کے ذمہ دار واقعی عہدہ برا ہونا چاہتے ہیں تو انھیں اس عمر کے بچوں کی تربیت کو پہلے سے زیادہ اپنے منصوبوں میں جگہ دینی ہوگی، میں نہیں جانتا کہ بنیادی تعلیم ۶ سال کی عمر سے لازمی کی جائے گی جیسا کہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی تجویز ہے، یا ۷ سال کی عمر سے جیسا کہ بنیادی قومی تعلیم کی تجویز کا مطالبہ ہے، بہرحال (یا جو عمر آپ کی کانفرنس غور و بحث کے بعد طے کرے) ۶ یا ۷ سال کی عمر تک بچوں کی دیکھ بھال اور مناسب علاج، ان کے لئے کھلی ہوا میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ دن کا ایک معتد بہ حصہ گذارنے کا انتظام، اس عمر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو جاننے والوں کی مشفقانہ نگرانی میں صحت اور صفائی کی زندگی کی، اپنے ننھے ننھے پیروں پر کھڑے ہو سکنے کی، دوسرے ننھے اور نازک ساتھیوں کو سہارا دینے کی انفرادی اور اجتماعی عادتیں پیدا کرنے کا اہتمام ضرور کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں اس عمر کے بچوں کو (لڑکیوں) باڑیوں اور ننھوں کی تربیت گاہوں میں بھیجنا ابھی والدین پر لازم تو نہیں کرنا چاہئے [illegible] کی بڑی تعداد کے لئے، خصوصاً جہاں گھر معاشی یا دوسری مجبوریوں کی وجہ سے [illegible] نہیں دے سکتا۔ ان تربیت گاہوں کا انتظام حکومت کی طرف سے ضرور ہونا چاہئے انتظام میں ایسی تربیت گاہیں کھولی جائیں تو فیاضی سے ان کی [illegible] حکومت [illegible] چھوٹی عمر کے بچوں کو گھر سے علیحدہ کرنا بہت نازک بات ہے، اور بہت سے گھر [illegible] دینے کے قابل بھی ہوں، اس لئے فی الحال اگر اس عمر کے بچوں میں دس میں [illegible]

میں لے آئے جاتیں تو حساب کے اعتبار سے تو کم ہی ہے مگر عملی لحاظ سے کافی ہوگا ان کے لئے علیحدہ تربیت گاہیں کھولی جائیں یا بنیادی مدرسوں کے ساتھ ان چھوٹے بچوں کے لئے علیحدہ خاص انتظام کرکے حکومت اپنے فرض سے سبکدوش ہوسکتی ہے، بشرطیکہ مدرسے کے اس حصہ کی دیکھ بھال کے لئے الگ تربیت یافتہ استاد بلکہ استانیاں فراہم کی جائیں اور بچوں کو صاف کھلی ہوا میں ایک اچھے باغیچے کے اندر گھر سے بہتر ماحول میں رکھنے کا انتظام ہوسکے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ننھے بچوں کی یہ تربیت گاہیں یا بالک باڑیاں اس لئے درکار ہیں کہ بہتیرے بچوں کو اچھا گھر نصیب نہیں، افلاس اور جہالت ہمارے دیس کے بچوں کو اکثر گھر کی حقیقی نعمتوں سے محروم رکھتے ہیں، اس لئے بھی ان تربیت گاہوں کی ضرورت ہے، لیکن حق یہ ہے کہ اگر گھر وہ سب کچھ ہو جو اسے ہونا چاہئے تب بھی وہ سب کچھ فراہم نہیں کرسکتا جس کا مطالبہ ننھے بچے کی نشو پذیر اور تیزی سے نت نئی شکلیں اختیار کرنے والی طبیعت کرتی ہے۔ اس لئے ان نئی تربیت گاہوں کے بناتے وقت یہ بات سامنے رکھنی چاہئے کہ یہ گھر کا بدل بھی ہیں اور گھر کی کمیوں کو پورا کرنے والے بھی۔ بچے کی تربیت میں گھر کا وہ اثر ہے کہ اگر ان تربیت گاہوں نے گھر سے اپنا رشتہ مضبوط نہ کیا تو یہ اپنا کام کبھی خوبی سے انجام نہ دینے پائیں گے۔ ایک طرف ان کی واقفیت سے کام لینا ہوگا، اور دوسری طرف ماں کو بچے کی خدمت کی راہیں سُجھانی اور سمجھانی ہوں گی، اس کا کچھ بوجھ اپنے کندھوں پر لینا ہوگا تاکہ جو بوجھ اس کے ذمہ رہے وہ اسے زیادہ خوبی سے اٹھا سکے۔ ان تربیت گاہوں کو طبی معائنہ کا انتظام کرنا ہوگا اور وہ طبی امداد پہنچانی ہوگی جس کی بچہ کو ضرورت رہتی ہے۔ انھیں بچہ میں اچھی عادتیں ڈالنی ہوں گی اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں وہ عمر کے تقاضوں کے اعتبار سے دیکھ سکیں، جو فطرت چاہتی ہے کہ وہ سیکھ جائیں۔ وہاں طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کرنا ہوگا۔ تعمیری بھی، تخلیقی بھی، تخئیلی بھی، اور بچے کو اپنی بدنی نشو ونما کے لئے جس عمل اور حرکت کی ضرورت ہے اس کے مواقع بھی فراہم کرنے ہوں گے یا آس پاس کی چیزوں کے خواص سے آگاہی کا سامان کرنا ہوگا، ان کے برتنے میں جو ہنرمندی درکار ہے اس کی بنیاد ڈالنی ہوگی؟ اور بات چیت کرنے، اپنے ساتھیوں سے اور اپنے بڑوں سے اپنی کہنے اور ان کی سمجھنے کا خوگر بنانا ہوگا۔ پھر ۳-۴ سال کی عمر ہی سے بچے کو ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے، خالی ماں کی رفاقت کافی نہیں ہوتی وہ اپنے برابر کے اور بچے چاہتا ہے، ان سے

سہارا لینا، اُنہیں سہارا دینا چاہتا ہے اور جماعتی زندگی کا تمدن آفرین بنیادی لین دین شروع ہو جاتا ہے اس لئے بچے کو دوسرے بچوں کی صحبت اور رفاقت ملنی چاہئے اور یہ چیز تربیت گاہیں اکثر گھروں سے زیادہ خوبی سے فراہم کر سکتی ہیں۔ البتہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ساتھیوں کا یہ حلقہ کہیں بہت بڑا نہ ہو جائے۔ جب رفیق بہت زیادہ ہو جائیں تو وہ بھائی بہن نہیں رہتے انبوہ بن جاتے ہیں جس میں بچہ کھو سا جاتا ہے اور جس سے اُسے کبھی کوئی داخلی لگاؤ پیدا نہیں ہو پاتا، وہ اس انبوہ میں یا تو اندر کو کھنچ جاتا ہے، شرمیلا اور جھینپو بن جاتا ہے یا پھر لڑتا جھگڑتا ہے اور ہر ایک پر دھونس جمانے کی کوشش کرتا ہے، یا دب جاتا ہے، یا دبانا چاہتا ہے، تعداد کے بڑھانے میں ننھے بچوں کے لئے متعدی امراض کا خطرہ بھی سخت خطرہ ہے اس لئے تعداد کو کم ہی رکھنا ٹھیک ہے، اور اس کا خیال اس وجہ سے اور بھی ضروری ہے کہ ہم کہیں اپنی مالی دشواریوں کے پیش نظر یا کام کو جلد جلد پھیلانے کی خاطر یہ نہ کر بیٹھیں کہ ان تربیت گاہوں میں بہت بہت سے بچوں کو یکجا کر دیں، میری رائے میں تو ایک تربیت گاہ میں ۳۰-۴۰ سے زیادہ بچے نہیں ہونے چاہئیں۔

ان نئی تربیت گاہوں کو اگر واقعی گھر کا نعم البدل اور گھر کی کمیوں کا پورا کرنے والا بنانا ہے تو اس کی عمارت، اس کے باغیچے، اس کے کھیل کے انتظام، اس میں کھانا تیار کرنے اور کھانا کھلانے کا ستھرا اہتمام اس میں بچوں کے پالتو جانوروں کی گنجائش، بچوں کے لئے صفائی اور طہارت کے مواقع، ان کے لئے نیچے اور ہلکے ساز و سامان، غرض بہت سی باتوں کو سامنے رکھ کر ہر چیز کی جگہ نکالنی ہوگی، ہمارے ملک میں ابھی تعلیمی عمارتوں میں تعلیمی ضرورتوں کا خیال ذرا کم ہی رکھا جاتا ہے، ہر قسم کی عمارت ہر قسم کے کام میں لائی جا سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ملک کے اچھے ماہرین تعمیر اور ماہرین تعلیمات باہمی مشورہ سے ان تربیت گاہوں کے لئے نمونے کے نقشے بنائیں جنہیں مقامی خصوصیات کے پیش نظر کچھ بدل کر ہر جگہ کام میں لایا جا سکے، برطانیہ کی نرسری اسکول ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کے پارلیمنٹ میں پاس ہونے سے پہلے ہی اپنی ایک کمیٹی بٹھا دی تھی جس نے برطانیہ کے حالات سامنے رکھ کر ایک رپورٹ بھی شائع کر دی ہے جس میں ان نئی تربیت گاہوں کے لئے جو اس قانون کے تحت سارے ملک میں بننے والی ہیں، مکانات اور ساز و سامان سے متعلق تمام ضروری امور پر ماہرین کے مشورہ سے کا خاکہ درج کر دیا ہے کاش ہم بھی اپنے کاموں میں اس پیش بینی کا ثبوت دے سکیں، کیونکہ نہ آپ کی فلوشپ اس قسم

کے کام اپنے ذمے لے لے۔؟

آپ کی کانفرنس کے سامنے دوسرا بحث طلب مسئلہ ابتدائی تعلیم کا ہے، جسے اب کل ملک کی تعلیمی اصطلاح میں بنیادی تعلیم کہنے لگے ہیں، یہ ۵-۶ سال سے اوپر کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے، اس عمر کے لڑکے اور لڑکیوں میں سے کچھ کی تعلیم تو ہمیشہ جیسی تیسی ہوتی ہی رہی ہے، لیکن جب تک تعلیم کا یہ کام نجی کام رہتا ہے بچوں کے سرپرست اپنی مرضی و رجحان سے متعلق اپنے منصوبوں کے پیش نظر جس قسم کی اور جتنی تعلیم کا انتظام چاہتے ہیں کرتے ہیں یا استاد اپنی مرضی سے شاگرد کو جو چاہتا ہے سکھاتا ہے اور جیسا چاہتا ہے بناتا ہے، اس سے تعلیم کے مقاصد اور اس کے طریق کار کے متعلق بہت اختلاف رہتا ہے، جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے ... اتنی راہیں، لیکن جب تعلیم جماعت کا وظیفہ بن جاتی ہے تو جماعت قدرتی طور پر ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ تعلیم سے متعلم کو اپنا کارآمد بنائے، اس کارآمد بنانے میں جماعت کی طرف سے بڑی زیادتیاں ہوسکتی ہیں اور برابر ہوتی رہتی ہیں۔ کارآمد بنانے کی خاطر آدمیت کے حق چھین لئے جاتے ہیں۔ سانچوں پر کس کر ہر انفرادی خصوصیت کا جھول مٹا دیا جاتا ہے اور ایک سے نرشے ترشائے ڈھلے ڈھلائے شہری بنانے کی خواہش کو بے روک ٹوک پورا کیا جاتا ہے، پھر اگر جماعت کا نظام جمہوری ہو تو چونکہ جمہوریت انسان کی بہ حیثیت انسان قدر کرتی ہے، اس لئے اس کی انفرادیت کا پاس کرنے پر بھی مجبور رہتی ہے۔ مگر کارآمد آدمی تو اسے بھی درکار ہوتے ہیں بلکہ اس کا تو وجود ہی اپنے شہریوں کی صحیح تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسرے اگر اپنے لئے کارآمد اور مطیع رعایا بنانے کی فکر میں رہتے ہیں تو اسے اپنے حقیقی آقاؤں کی تربیت کا کام انجام دینا ہوتا ہے، چنانچہ جہاں بھی جمہوری سیاسی ادارے فروغ پاتے ہیں تعلیم کو عام کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مفت انتظام کرنا ہوتا ہے اور چونکہ معاملہ جماعت کے اچھی یا بری جماعت بننے کا ہوتا ہے بلکہ اس کی موت و زیست کا ہوتا ہے اس لئے تعلیم کو بخت و اتفاق پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ لازمی بھی کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جوں جوں سیاسی ارتقاء جمہوریت کی طرف بڑھا ہے تعلیمی مسئلہ جماعتی زندگی کا اہم تر ین مسئلہ بنتا گیا ہے اور اس وقت کہ ہم کسی جمہوری حکومت سے بہت قریب ہیں، چاہے ایک متحدہ ہندوستان میں چاہے علیحدہ علیحدہ پاکستان اور ہندوستان میں، اس لئے اس بات پر شاید سب ہی متفق ہوں گے کہ ہمیں اتنی مدت کے لئے جتنی جماعتی مقاصد کے پیش نظر ضروری نظر آئے اپنے تمام لڑکے لڑکیوں کے لئے عام اور مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بھی سب کو اتفاق ہوگا کہ یہ مدت اگر ۴ یا ۵ ہی سال کی

ہوگی تو کام نہ چلے گا اور خود مختاری اور جمہوری آزادی کا بوجھ اٹھانے والے شہریوں کی تیاری کے لئے فی الحال کم سے کم ۱۰ یا ۱۲ سال کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا، اور آگے چل کر اس مدت کو شاید اور بڑھانا پڑے۔

لیکن یہ چیزیں جن پر میں نے کہا ہے کہ اتفاق ہے، بس خارجی ڈھانچے ہیں، اصل سوال تو یہ ہے کہ تعلیم ہو کیسی؟ اس کے جواب کا سوچنا اور اسے ہمت سے برابر قریب تر لانے کی کوشش جمہوری جماعت میں یوں تو سب کا کام ہے، خصوصیت کے ساتھ اس کے تعلیمی کام کرنے والوں کا فرض ہے ہمیں اس کانفرنس میں بھی اس پر ضرور غور کرنا چاہئے۔ اس کا جواب تلاش کرنے میں ہم یا جماعت کے اغراض کو پہلی جگہ دے سکتے ہیں یا فرد کی تعلیم پذیری کے امکانات کو جماعت کی طرف سے تعلیم کا انتظام ہو، اس کی غایت جماعت کا استحکام اور اس کی ترقی ہو تو آسانی سے یہ ہو سکتا ہے کہ ہم جماعت کی ضرورتوں ہی کو سامنے رکھ کر اس سوال کا جواب دیں، لیکن یاد رہے کہ اس میں بڑے خطرے ہیں، جمہوری جماعت بھی کوتاہ اندیشی سے بالکل پاک نہیں ہوتی۔ باوجود انفرادیت کے احترام کے دعووں کے جماعتی زندگی کی ضرورتیں عملاً اس انفرادیت کا انکار کر سکتی ہیں اور جمہوری تعلیم نظام بھی آخری نظاموں کی طرح انسان کی انسانیت کو فنا کر کے اپنے شہریوں میں مشینوں کی سی کارکردگی پیدا کرنے کی تدبیریں کیا کر سکتا ہے۔ وقتی فائدوں کے لئے مستقل مقاصد کو پس پشت ڈال سکتا ہے۔ حال پر مستقبل کو دنیا پر آخرت کو قربان کر سکتا ہے۔ اس لئے صحیح راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم فرد کے نقطہ نظر سے بھی تعلیم کی اہمیت پر غور کریں اور جماعت کے نقطہ نظر سے بھی اور دیکھیں کہ اگر دونوں میں کوئی تضاد ہے تو وہ کیسے حل ہو اگر نہ ہو تو اسی صورت کو اختیار کیا جائے۔

تعلیم کے عمل میں فرد اور جماعت کے درمیان پہلے دن سے چولی دامن کا ساتھ ہے، آپ تعلیم کا کام کرنے والے ہیں آپ سے تو یہ پوشیدہ نہ ہوگا کہ تعلیم یعنی دفعی ذہنی تربیت کیسے ہوتی ہے؟ ذہن بھی اپنی نمو کے لئے جسم کی طرح غذا چاہتا ہے۔ یہ غذا اسے کہاں ملتی ہے؟ جماعت کے تمدن سے اس کی مادی اور غیر مادی تحصیلات سے، اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے، اس کی صنعت و دستکاری سے، اس کے نظام اخلاق سے، اس کی موسیقی سے، اس کی مصوری سے، اس کی تعمیرات سے، اس کی دکانوں سے، اس کے کارخانوں سے، اس کی حکومت کے انتظامات سے، اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے، غرض اس کی رنگارنگ تخلیقات سے، جماعتی تمدن کی یہ ساری مادی اور غیر مادی چیزیں جو نشو پذیر دماغ کے لئے غذا کا کام دیتی ہیں، خود بھی کسی نہ کسی ذہن انسانی ہی کی پیداوار ہوتی ہیں، کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں یہ روپ لیا ہے، کسی انسانی ذہن ہی نے

ان میں اپنی توانائی کو محفوظ کر دیا ہے، ان میں انسانی ذہنوں کی بصیرتیں اور آرزوئیں اور کاوشیں ہی تو مضمر ہیں، یہ سب کسی متاع ذہنی رکھنے والے کا چھپا خزینہ ہیں، یا کسی سرشوریدہ کی بالین آسایش غرض سب ذہن انسانی کی رہین منت ہیں اور اس لئے سب کی اپنی اپنی ذہنی ساخت ہے۔

جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کی چھپی ہوئی قوتیں آشکار ہوتی ہیں ان میں سوئی ہوئی توانیاں اس نئے ذہن میں جاکر بیدار ہوتی ہیں اس کے لئے یہ دفینے اپنا منہ کھول دیتے ہیں اور پرسکون بالینوں سے اس کے لئے پھر شور ہائے دہر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر تربیت خواہ ذہن کے لئے ہر تمدنی چیز اپنی مخفی قوتیں پیش نہیں کرتی جسمانی غذاؤں کی طرح ذہنی غذائیں بھی سب کو ایک ہی سی نہیں راس آتیں۔ کسی کو کوئی بھاتی ہے کسی کو کوئی، اور راز اس کا یہ ہے کہ ہر ذہن کو وہی چیز بھاتی ہے جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو، یہی تعلیم کا بنیادی گر ہے اس کو بھولنا یا اس کے خلاف چلنا ایسا ہے جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش جس دماغ کی ساخت ادبی کاوشوں کے نتیجوں سے مطابق ہو اسے صنعتی اشیاء تمدن سے جس کی ساخت علمی اور نظری چیزوں سے مناسبت رکھتی ہو اسے عملی چیزوں سے تعلیم دینا، یا اس کے برعکس سب تعلیم کی اہمیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اصلی ذہنی تربیت کے دروازوں کو بند کرکے آدمیوں کو طوطوں اور سرکس کے جانوروں کا مرتبہ دینا ہے۔

اچھا تو اس اصول کا تقاضا ۷-۷ سال کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے لئے کیا ہے؟ اگر ایسا ہو کہ ہر لڑکے لڑکی کی تربیت ذہنی الگ الگ تمدنی اشیاء ہی سے ہو سکتی تو پھر کسی عام نظام کے بنانے کی دشواریاں ناممکن کی سرحد تک پہنچ جاتیں۔ عمومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کی خوش بختی ہے کہ اس عمر میں تفریق ذہنی پیدا ہونے سے پہلے عملی رجحان بچوں میں بہت عام بلکہ یوں کہئے کہ عالمگیر ہوتا ہے۔ اس عمر میں بچے چاہتے ہیں کہ کچھ بنائیں بگاڑیں، توڑیں جوڑیں۔ ان کے ہاتھ کام کے لئے بے چین ہوتے ہیں ان کی تربیت ذہنی کے لئے اس عمر میں فطرت کا منصوبہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھوں کی مدد سے سوچیں چیزوں کو برت کر پہچانیں اور کام کرکے سیکھیں۔ یہ بڑی ہی گمراہی ہے کہ ہم دس عمر کے بچوں کے لئے ذہنی تربیت کے اس امکان کو یعنی عملی کام کو ان کی تعلیم میں جگہ نہیں دیتے، اور فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرا کر اپنی من مانی تدبیر سے اصلی تربیت کی جگہ خالی ملمع کاری پر زور دیتے رہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں دو رائی کی گنجائش نہیں ہے

کہ اس منزل میں عملی کام کو تعلیمی سعی کا مرکز بنانا چاہیئے۔

تعلیم پانے والے اور ذریعہ تعلیم میں مطابقت کے علاوہ اس منزل میں ہاتھ کا کام خود ذہنی کام کی ذہنی ورزش، اور ذہنی ورزش۔ سے ذہنی نمو کی مفید ترین شکل ہے، اس کے ذریعہ جو ہنرمندی اور واقفیت پیدا ہوتی ہے وہ ذہن کو جلا دیتی ہے، جو خالی کتابوں سے حاصل ہو وہ اکثر و بیشتر اس غرض کے لئے بیکار ثابت ہوتی ہے، ہم تعلیم کا کام کرنے والوں کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہر ہنرمندی اور ہر واقفیت ذہنی تربیت کی وجہ نہیں ہوتی نہ اس کی علامت ہے، نہ اس کا پیمانہ واقفیت بھی دو طرح کی ہوتی ہے اور ہنرمندی بھی دو طرح کی، ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جس کے لئے دوسرے کام کرتے ہیں ہمیں بیٹھے بٹھلائے مل جاتی ہے خبر کی حیثیت سے۔ ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربہ سے حاصل ہوتی ہے، جزو ذہن بنتی، ذہن کو روشن کرتی، اس میں نظر پیدا کرتی ہے، اسی طرح ہنرمندی، میکانکی، ہنرمندی ہوتی ہے۔ اس میں سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں مشقت درکار ہے، کچھ پہلے سے مقرر ہے اس کی تکرار کرنی ہے پہلے سے کچھ دوسرے نے معین کر دیا ہے اسے پیدا کرتی ہے۔ ایک ہنرمندی میکانکی نہیں ہوتی، ذاتی قصد کی بنا پر نئی اقدار پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اسے تخلیقی ہنرمندی کہہ سکتے ہیں، دو اَتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے نہ روح کو بالیدگی، اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لئے ایک خوشنما پردہ ہوتا ہے، یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا، آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربہ سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار، ذہن کو تربیت دیتا ہے، روح کو روشن کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے۔ یہی حال میکانکی ہنرمندی کے مقابلہ میں تخلیقی ہنرمندی دونوں کی خاطر اپنے بنیادی مدرسوں میں ہاتھ کے کام کو داخل کرنا اور اس سے صحیح تعلیمی کام لینا ضروری ہے۔

یہ جو عمل تعلیم کی ماہیت تعلیمی کام، تجربی علم اور تخلیقی ہنرمندی کی تربیتی قوت کے تقاضوں سے ہم فرد کی پوری ذہنی نشو و نما کی خاطر ہاتھ کے کام کو بنیادی مدرسوں میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ جماعت کے مفاد کا مطالبہ بھی یہی ہے جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنی زندگی کا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے۔ اس کی تعلیم گاہیں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا، کہاں کی دانشمندی ہے۔ سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی

وقت ممکن ہے جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سوادِ اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں، کہیں اور یہ جائز ہو کہ نہ ہو لیکن ایک جمہوری جماعت میں تو یہ ایک ناقابل تصور اقدام ہے، ہاتھ کے کام کو مدرسہ میں جگہ دے کر یہ جمہوری جماعت دراصل وہ کام انجام دیگی جو اس کا پہلا تعلیمی مقصد ہو سکتا ہے، یعنی کارآمد شہری پیدا کرنا اور اس طرح پیدا کرنا کہ جمہوریت کی روح فرد کا احترام باقی رہے۔ فرد اس طرح کارآمد بنے کہ اپنی انفرادیت کو بھی اسے تجنا نہ پڑے اور اپنے انفرادی تربیتی امکانات سے بھی محروم نہ کیا جائے۔

اچھا اگر ہم نے فرد اور جماعت کے تعلیمی مطالبوں میں یہ ہم آہنگی پاکر اپنے بنیادی مدرسوں کو کام کا مدرسہ بنا دیا اور ان میں تجربی علم اور تخلیقی کام اور ان کے معاون بلکہ خادم کی حیثیت سے کتابی علم اور میکانکی کام کا ایک ایسا آمیزہ تیار کر لیا جس سے ۶-۷ سے ۱۴ سال کے لڑکے لڑکیوں کی ذہنی و جسمانی بڑھ کا کام اچھی طرح انجام پا سکے، تو کیا ہم نے تو شاید ابھی اپنا سب سے اہم کام نہیں کیا ہے ہم نے اگر ذہنی قوتوں کو نشو و نما دینے کا انتظام کر دیا۔ اگر ہنرمندیاں پیدا کر دیں تو تعلیم کا کام ختم نہیں ہو گیا صلاحیتیں اور ہنرمندیاں نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بری، وہ اچھی اور بری بنتی ہیں۔ ان مقاصد سے جن کی خدمت میں وہ لگائی جاتی ہیں۔ آپ کی عدالتوں میں جھوٹ کو سچ بنا کر روپیہ بٹورنے والے، آپ کی تجارتی فرموں میں کالی منڈی کے شکاری اور جماعتی محاصل کے چور، آپ کے عہدہ داروں میں رشوت کا بازار گرم کرنے والے۔ آپ کے پبلک کام کرنے والوں میں ذاتی غرض پر عام مفاد کو چٹکی بجاتے میں قربان کرنے والے آپ کے عالموں اور پنڈتوں، آپ کے جوگیوں اور صوفیوں میں عام مخلوق کے جہل اور توہم پرستی سے بے دریغ ناجائز فائدے اٹھانے والے، آپ کے جھوٹے گواہوں کو کامیاب فوج، آپ کے جعل سازی کے بامراد دل، یہ سب کچھ ذہنی صلاحیتوں اور مہارتوں میں کسی سے پیچھے تو نہیں ہیں کیا ہم اپنے مدرسوں کو ذہنی صلاحیتوں کے چمکانے اور مہارتوں کے پیدا کرنے کے ادارے بنا کر ان میں انھیں فوجوں کے لئے رنگروٹ حاصل کرنا چاہیں گے؟ نہیں تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی، مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے۔ جمہوری جماعت میں اس حقیقت کو نظرانداز کرنا جماعت کی زندگی کی شرائط سے غفلت برتنا ہے۔ جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت کے لئے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس کی ہنرمندی جماعتی انتشار کا باعث بن سکتی ہے۔ اور خصوصیت سے جمہوری ریاست میں جو تحقیق و تفتیش کی آزادی ہے۔ جماعت

سازی کی آزادی ہے، تقریر و تحریر کی آزادی ہے، مشاغل کے انتخاب کی آزادی ہے، ان سب سے انفرادیت کی انتشاری قوتیں اُبھرتی ہیں، جو ان اداروں کی قدر کرتے ہیں اور جمعیۃ کی خاطر انھیں ہاتھ سے دینے کو بہت گراں سودا جانتے ہیں۔ لیکن جنہیں جماعتی زندگی کا انتشار بھی گوارا نہیں۔ انہیں ان آزادیوں کے ساتھ ساتھ ذہن جماعتی کے نشو و نما اور جمعیتہ قومی کے استحکام کی تدبیریں بھی سوچنی چاہئیں، انھیں دیکھنا چاہئے کہ مدرسہ ایک جماعتی ادارہ کی حیثیت سے اس باب میں ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ آج تو وہ تعلیم سے انفرادیت کو کچلتا ہے اس لئے کہ سب کے واسطے وہ راہ متعین کرتا ہے جو بہت کم کی صحیح راہ ہو سکتی ہے۔ تیرا ور تخلیق کیلئے بے چین بچوں کو کتابوں پر جھکاتا ہے، ان اوزاروں کی جگہ جن کی طرف بچوں کی للچائی نظریں تکتی ہیں۔ انھیں قلم دوات دیتا ہے۔ اچھلنے کودنے کے لئے بے تاب بچوں کو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک طرف تو انفرادیت کے ساتھ یہ بے اعتنائی، دوسری طرف خود غرضی کی راہوں پر انھیں چلانے کے لئے وہ اہتمام کہ الامان۔ اپنے مدرسوں کے نصاب کو، ان کے کاموں کو ذرا غور سے دیکھئے اور ان کی تحلیل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں شاید ایک ہی کاروبار ہوتا ہے وہ یہ کہ افراد کی ذہانت، ان کی قوتِ ارادی، ان کی ہنرمندی، سب بس فرد ہی کے لئے نشو و نما پائیں۔ جماعتی محرکات کو نہ جاگنے کا موقع ملتا ہے، نہ وہ اُبھرتے ہیں۔ نہ تربیت پاتے ہیں، ذہن کو بیدار کیا جاتا ہے، دل کو سُلایا جاتا ہے، حقوق یاد رہتے ہیں۔ فرائض بھلائے جاتے ہیں، انفرادی غرض طلبی کی ڈھلوان شاہراہ پر بچے ڈھکیلے جاتے ہیں۔ جماعتی بے غرضی اور خدمت کے دروازے بند رہتے ہیں دوسرے کو کہنی مار کر آگے بڑھ جانے کی ہر دم مشق مہیا ہے، ساتھی کو سہارا دیکر آگے بڑھانے کا کہیں نام نہیں سب اپنے اپنے لئے ہیں، سب کے لئے کوئی نہیں، ہاں زبان سے کبھی کبھی قومی خدمت، پڑوس کے حقوق، باہمی تعاون کی تلقین ہو جاتی ہے۔ لیکن کرنے کے کام باتوں سے انجام نہیں پاتے، کردار کی عادتیں گفتار سے پختہ نہیں ہوتیں زندگی سے حقیقی تعلق خیال اور احساس کے علاوہ عمل کا طالب بھی ہے جماعت کے لئے اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ خدمت انجام دینے میں اس کی نشو و نما کا راز ہے۔ اچھی جماعت اپنے افراد کو اس کا موقع دیتی ہے کہ وہ مل کر اس کے لئے کچھ کریں اور اس پر خوش ہو سکیں، اچھا مدرسہ بھی جماعتی کام کی مشترک خوشی کے مواقع نکالتا ہے۔ کام کے کامیابی سے انجام پانے پر خوشی تو انفرادی سعی میں بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ جماعتی مقاصد سے بے تعلق ہوتی ہے۔ کام کی اس انفرادی مسرت کو ترک

خود غرضانہ عمل کا انجن ہے، جماعتی مقاصد کی پٹری پر ڈال دینا چاہئے۔ انفرادی عمل کی خوشی کو جماعتی کام کی لگن اور بس پر سرور اور فخر میں بدل دینا ہے، یوں جماعت سے فرد کا تعلق خود کے لئے وجہ مسرت و افتخار بن جاتا ہے اور فرد اور جماعت کی گتھی فلسفیانہ بحثوں کے بغیر کھل جاتی ہے،

اب دیکھنا یہ ہے کہ مشترکہ کام کو یہ مسرت کس قسم کے کام سے حاصل ہو سکتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسی وقت نصیب ہوتی ہے کہ جب کام، کام کرنے والے کی صلاحیت، اس کے رجحانات اس کی طبیعت کے جھکاؤ کے مطابق ہو۔ اور صاحبو! آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ یہ صلاحیت کیا ہوتی ہے، اور یہ جھکاؤ کدھر ہوتا ہے۔ کتابوں کی طرف ہوتا ہے، یا عملی کام کی طرف، چنانچہ انفرادی رجحان اور قومی مصالح دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے کتابی مدرسے عملی کام کے مدرسے بن جائیں، اس پہلے قدم سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے دوسرا قدم یہ ضروری ہے کہ عملی کام کی انفرادی خواہش کو مشترک جماعتی کاموں میں لگانے کا انتظام کیا جائے۔ اور مدرسہ کو کام کی جمعیتہ دے دی جائے، اور جب خود غرضانہ عمل کا جذبہ جماعتی خدمت میں منتقل ہو جائے ایک نظم کے ماتحت اپنے کو لانے، دوسرے کی مدد کرنے دوسرے سے مدد لینے کی عادت پڑنے لگے اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے تو تیسرا اقدام یہ ہے کہ عادتوں کو بصیرتوں میں بدلا جائے، اس مشترک عمل کے جماعتی محاسن اجاگر کئے جائیں، اور شخصی اور جماعتی اغراض کے ساتھ ساتھ پورا ہو سکنے کے امکانات واضح کئے جائیں، اور چوتھا قدم یہ ہے کہ مشغلین کے اکثر انتظامات خود ان کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں، ذمہ داری کا احساس اور اپنے کام کو اپنے بس بھر بہترین طور پر انجام دینے کی عادت آزاد اور پیہم عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے، مدرسہ کی ہم آہنگ فضائیں مشفقانہ نگرانی اور مشورہ کے ساتھ یہ سب منزلیں خوبی سے طے ہو سکتی ہیں اور مدرسہ اس خود مختار جمہوری ریاست کا جو اسے چلاتی ہے سب سے مفید ادارہ بن سکتا ہے اور اس ریاست کو بہتر ریاست بنانے میں سب سے زیادہ موثر قوت ثابت ہو سکتا ہے۔۔

صاحبو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بنیادی مدرسوں میں بھی اپنی قومی تعلیم کے سب سے اہم حصہ میں اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو بس کرنے کی چیز یہی ہے کہ ان مدرسوں کو خبری علم کے مرکزوں کی جگہ تجربی علم کے مدرسے بنانا چاہئے۔ کتابوں کے مدرسے کی جگہ کام کا مدرسہ بنانا چاہئے۔ انفرادی خود غرضی کی جگہ بے غرض جماعتی خدمت کی تربیت گاہ بنانا چاہئے، اور بی نظری

یک طرفہ پن کی جگہ ان میں زندگی کے عمل تنوع کو جگہ دینی چاہیے، یہ مشکل کام ہے، مگر ضروری کام ہے ہمارا مستقبل اس منصوبہ کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہے، اس کام میں آپ کے بہت سے مددگار ہوں گے اور اس سے زیادہ رکاوٹ ڈالنے والے، لیکن یہ کام انجام اسی وقت پا سکتا ہے جب استاد اپنے فرض کو جانیں اور تعلیم کے معاملہ میں اپنے منصب کو پہچانیں مجھے یقین ہے کہ نیو ایجوکیشن فلوشپ کے اراکین اس میدان میں اور سب سے آگے ہوں گے۔

(ماخوذ)

نیو ایجوکیشن فیلوشپ رامپور

کی

ممبری تعلیمی فرائض انجام دینے کے احساس کو پیدا کرتی ہے

ہر مدرس کا فرض ہے کہ اس برادری میں

شریک ہو

زرنوجی

کا نظامِ تعلیم و تعلم

"جبکہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم سے متعلق ایجادات کا دور دورہ ہے اور اس کے موثر بنانے کے ذرائع تلاش کرنے میں دنیائے تحقیق پیہم کاوشیں کر رہی ہے، ادارہ تعلیم جدید نے کوشش کی ہے کہ قدیم نظامِ تعلیم کا جائزہ لیا جائے اور اس کا باقاعدہ نئے طرزِ تعلیم سے موازنہ کیا جائے ممکن ہے کہ اس طریقۂ کار سے کوئی ایسا مفید نتیجہ نکل سکے جو ملک کی تعلیمی جد و جہد میں معین ہو۔ اس لئے مندرجۂ ذیل مقالہ آپ کے ملاحظہ کے لئے درج کیا جاتا ہے۔ مقالۂ ہذا جس گہری تلاش کے بعد لکھا گیا ہے اس سے آپ مؤلف کی قوت تحقیق کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اسے آپ غائر نظر سے پڑھئے اور اپنے روزنامچہ میں فی الحال وہ نکات درج کرلیجئے جو زمانۂ حال کے مبلغین تعلیم کے رائج کئے ہوئے نکات سے ملتے جلتے ہیں۔"

مدیر

علم، ابتدائے آفرینش ہی سے انسان کا رفیق ہے، آغازِ کار میں اس سے انسان زیادہ فائدہ اس بنا پر نہ اٹھا سکا، کہ معلومات کو نقوش اور اشکال کی زنجیروں میں قید کرلینے کا طریقہ ایجاد نہ ہوا تھا۔ جب خیالات نے مادی شکل اختیار کرلینے کی ہامی بھرلی، تو علم کے فوائد کیفیت اور کمیت دونوں میں روز افزوں ترقی کرنے لگے چنانچہ آج جو کچھ ہم جانتے، اور برتتے ہیں، اسی لفظی کھیل کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں نے علم کی باگ ہاتھ میں لی، تو اسے خداوندی فریضہ مانا، اور مقدس امانت کی طرح صرف محفوظ کرکے نہیں، اس میں عظیم الشان اضافہ کرکے آنیوالی نسلوں کے آگے پیش کردیا۔ کوئی علم اور کسی طرح کی صنعت ہو، اس کی تاریخِ ترقی میں سے اسلامی عہد کا حذف، باہم علم کی اہم سیڑھی توڑ دینا ہے۔

چونکہ علم تحصیلی چیز تھی، مسلمانوں نے اس کے حصول کے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے، اس راہ کے گامزنوں کے لیے آداب اور شرطیں قرار دیں، اور رفتہ رفتہ ایک زبردست نظامِ تعلیم و تربیت مرتب کردیا۔ اس نظام سے دنیائے علم کو کیا فائدہ پہنچا، اس کا اندازہ کرنے کے لیے تاریخِ علوم و فنون کے

صفحات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہاں صرف اس کا ذکر ضروری ہے کہ تعلیمی مسائل سے بحث کرنے والے علم کا نام "آداب الدرس" رکھ کر مسلمانوں نے اس پر بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ ذیل میں اُن کی سرسری فہرست پیش کی جاتی ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اسلامی عہدِ ترقی میں اس فن کی طرف کتنی توجہ کی گئی تھی۔

۱۔ کتاب العلم، ابو خیثمہ شیبانی، متوفی ۲۳۴ھ / ۸۴۸ء

۲۔ کتاب ترغیب العلم، اسمٰعیل بن یحییٰ مزنی، متوفی سنہ ۲۶۴ھ / ۸۷۷ء

۳۔ ریاضۃ المتعلم، زبیر بن احمد الزبیری، متوفی سنہ ۳۱۷ھ / ۹۲۹ء

۴۔ کتاب العلم والتعلیم، ابو زید بلخی، متوفی سنہ ۳۴۰ھ / ۹۵۱ء

۵۔ ریاضۃ المتعلم، ابن السنی، متوفی سنہ ۳۶۴ھ / ۹۷۴ء

۶۔ المدرا التعلیم فی احوال العلوم والتعلیم، ابن سینا، متوفی سنہ ۴۲۸ھ / ۱۰۳۶ء

۷۔ ریاضۃ المتعلم، ابو نعیم اصفہانی متوفی سنہ ۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء

۸۔ کتاب العالم والمتعلم، ابن سیدہ، متوفی سنہ ۴۵۸ھ / ۱۰۶۶ء

۹۔ کتاب فضل العلم وآدابہ، ابن عبد البر اندلسی سنہ ۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء

۱۰۔ شفاء المسترشدین، الکیا الہراسی، متوفی سنہ ۵۰۴ھ / ۱۱۱۰ء

۱۱۔ طراز الذہب، ابو سعید سمعانی، متوفی سنہ ۵۶۲ھ / ۱۱۶۶ء

۱۲۔ کتاب الاملاء والاستملاء ابو سعید مذکور

۱۳۔ الرسالۃ العلمیہ، علی شستری، متوفی سنہ ۶۶۸ھ / ۱۲۶۹ء

۱۴۔ زینۃ المتعلمین، حمزہ بن یوسف حموی متوفی سنہ ۶۷۰ھ / ۱۲۷۱ء

۱۵۔ اخبار الربط والمدارس، ابن الساعی بغدادی، متوفی سنہ ۶۷۴ھ / ۱۲۷۵ء

۱۶۔ تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم، ابن جماعہ متوفی سنہ ۷۳۳ھ / ۱۳۳۲ء

۱۷۔ احیاء النفوس فی صنعۃ القاء الدروس، تقی سبکی متوفی سنہ ۷۵۶ھ / ۱۳۵۵ء

۱۸۔ شفاء المتألم فی آداب العالم والمتعلم، ابن نباتہ قدسی، متوفی سنہ ۸۵۶ھ / ۱۴۵۲ء

۱۹۔ کتاب فی آداب العلماء والمتعلمین، حسین بن الامام قاسم الیمنی، متوفی سنہ ۱۰۵۰ھ / ۱۶۴۰ء

یہ فہرست انتہائی مختصر ہے لیکن افسوس کہ اس کی بھی صرف چند کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں، بقیہ اسلامی حکومتوں کے

تغیر و تبدل اور مسلمانوں کی غفلت و بے توجہی کے ہاتھوں ضائع ہو گئیں۔

ہندوستان کے مسلمان، عرصے سے ایسے نظام کے ماتحت تعلیم پا رہے ہیں جو اُن کی روایاتِ تہذیب و تمدن سے بڑی حد تک مغایرت رکھتا ہے۔ لیکن اب دنیا تباہی کے عمیق سمندر میں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، اگر اُس نے آرام و اطمینان کی سانس لے کر کوئی نئی انتظامی کروٹ بدلی، تو ہندوستان کو بھی ساتھ دینا ہوگا، اور یہاں کا ہر نظامِ عمل نئی راہوں پر گامزنی کا تقاضا کرے گا۔

ان امور میں سب سے اہم نظامِ تعلیم ہے۔ اس کی عمدگی اور برتری آیندہ نسلوں کی ترقی کی ضامن ہے، اور نقائص مستقبل کی تمام تر تمناؤں پر پانی پھیر سکتے ہیں۔ کچھ عرصے سے اس سلسلے میں نئے نئے منصوبے قائم کیے جا رہے ہیں، اور ماہرانِ تعلیم بحث و نظر، غور و فکر اور پس و پیش کی دو چار منزلیں طے بھی کر چکے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی کشتی کے ناخداؤں کے سامنے قدیم اسلامی نظامِ تعلیم کی دورِ بدور ترقی کا خاکہ پیش کیا جاے، تاکہ اُن تعلیمی اقدار کو جن کے پیشِ نظر علم زمان و مکان کی فانی قیود سے نکل کر مقدس الٰہی فریضہ قرار پاتا ہے، ازسرِنو رواج دینے کی کوشش کی جا سکے۔ مسائلِ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے اس طرف توجہ فرمائی، تو یقین ہے کہ ہمارے بہت سے مشکل مسئلے کسی نہ کسی حد تک مفید شکل میں طے ہو جائیں گے۔

زرنوجی کا تعارف

چھٹی صدی ہجری (۱۳ ویں ع) کے ایک فاضل نے طریقِ تعلیم و تعلم پر چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے۔ اس کا نام "تعلیمُ المتعلم طریقَ التعلم" ہے، یعنی طالبِ علم کو پڑھنے لکھنے کے طریقے کی تعلیم۔

مورخوں نے اس کا نام "برہان الدین (یا برہان الاسلام) زرنوجی" بتایا ہے، جو حقیقتاً نام نہیں، لقب اور نسبت سے مرکب ہے۔ زرنوج، ماوراءُ النہر (ترکستان) کا ایک شہر تھا، جواب ناپید ہے۔ ساتویں صدی ہجری (۱۴ ویں صدی ع) تک یہ شہر شہرت و ناموری کا مالک تھا، اور عام طور پر زرنوق کہلاتا تھا۔ برہان الدین اسی کے باشندے تھے۔

۱۔ معجم البلدان یاقوتِ حموی، ۴، ۳۸۷؛ الجواہر المضیئہ ۱، ۲۰۰۔ کاتب کی غلطی سے زرنوج کی جگہ زرنوخ درج ہو گیا ہے

زرنوجی کے حالات پردۂ خفا میں مستور رہے۔ تذکروں میں جتنا کچھ ملتا ہے وہ یہ کہ مشہور اسلامی مقنن، برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی (متوفی ۵۹۳ھ، ۱۱۹۷ء) کے شاگرد تھے، جو شہرۂ آفاق کتاب "الہدایہ" کے مصنف ہیں۔

مورخین کی اتنی مختصر اطلاع بھی کسی ذاتی کدوکاوش کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود زرنوجی کے ایک بیان کی نقل ہے، جو اسی رسالے میں کئی جگہ نظر آتا ہے۔[۱] اگر اساتذہ کے تذکرے سے زرنوجی کی علمی زندگی پر روشنی پڑ سکتی ہے، تو اسی رسالے میں حسبِ ذیل فضلا کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ قوام الدین حماد بن ابراہیم بن اسمٰعیل صفار بخاری۔ یہ بخارا کے ایک مشہور علمی خاندان کے فرد تھے علمِ کلام، فقہ اور ادب میں مہارتِ تام رکھتے تھے، اور اس لیے جامعِ بخارا میں جمعے کی نماز پڑھایا کرتے تھے کہ ان سے بڑا عالم شہر میں موجود نہ تھا۔ سمرقند میں ۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں انتقال کیا۔[۲]

۲۔ فخر الدین حسن بن منصور بن محمود اوزجندی معروف بہ قاضی خان۔[۳] یہ اسلامی قانون کے بڑے ماہر اور مفتی مشرق مانے جاتے ہیں۔ کفوی کی رائے ہے کہ انھیں علم و فضل کا عمیق سمندر کہنا زیب دیتا ہے قانون کے ماہرین ان کی رائے کو ہمیشہ ترجیح دیتے رہے ہیں اور انھیں ابن کمال پاشا نے مجتہد فی المسائل شمار کیا ہے۔ فتاویٰ قاضی خاں، ان کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور اور آج تک اسلامی قانون کا دستور العمل تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۵۹۲ھ (۱۱۹۶ء) میں ان کی وفات ہے۔[۴]

۳۔ ظہیر الدین حسن بن علی مرغینانی۔[۵] یہ بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ اپنی تصنیف و تالیف سے گویا دنیا پاٹ دی تھی۔ چھٹی صدی کے اکثر بڑے ائمہ ان کے شاگرد ہیں، جن میں مذکورۂ بالا مقنن اسلام صاحب ہدایہ بھی شامل ہیں۔[۶]

۴۔ رکن الدین محمد بن ابی بکر معروف بہ امام زادہ مفتی۔[۷] یہ سمرقند کے ایک گانو، چرغ کے باشندے

---

(۱) الجواہر ۲: ۱۲۰، ۳۰۳ و ۳۰۴، اعلام الاخیار کفوی، الفوائد البہیہ ۱۵۱ - (۲) ملاحظہ ہو شرح تعلیم المتعلم ۱۴، ۱۸، ۲۳، ۳۵، ۴۶، ۴۹، ۶۱، ۹۸ - (۳) ایضاً ۱۰، ۱۸، ۲۵، ۱۰۰، ۱۲۱، ۳ (۴) الجواہر ۱: ۲۰۵، ۲۲۴ (الفوائد ۳۲۱) (۵) شرح تعلیم المتعلم ۳۳، ۳۳..

(۶) الجواہر ۱: ۲۰۵، ۲۵۱، الفوائد ۳۰ (۷) شرح تعلیم المتعلم: ۴۵ (۸) الجواہر ۱: ۲۰۹، ۱۰۹، الفوائد ۲۹

(۹) شرح تعلیم المتعلم: ۶۵

تھے، شریعت وطریقت دونوں میں یدطولیٰ حاصل تھا - بے بدل نثر اور بڑے فصیح اور شیریں زبان مقرر تھے، بخارا میں افتاء اور وعظ کا کام انھیں کے سپرد تھا - ادب و شعر میں بھی مہارت حاصل تھی - مشہور مورخ سمعانی کے استاد ہیں اور شرعۃ الاسلام نام کی ایک کتاب ان کی تصنیف ہے، جسے صاحب الجواہر نے بڑی نفیس تالیف بتایا ہے - ۵۷۳ھ (۱۱۷۷ء) میں ان کا انتقال ہوا ہے [۴]۔

(۵) سدیدالدین شیرازی [۲]۔

(۶) فخرالدین الکشانی - غالبًا یہ محمد بن مسعود بن حسین ہیں، جو بخارا کے قاضی اور بڑے ظریف فاضل تھے ۵۵۲ھ (۱۱۵۷ء) میں ان کا انتقال ہوا ہے [۳]۔

(۷) رکن الاسلام معروف بہ ادیب مختار [۴]۔

استادوں کے، سوا رسالے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ زرنوجی کے والد بھی صاحب علم اور قاضی عمر بن بکر الزرنجری (متوفی ۵۸۴ھ / ۱۱۸۸ء) کے جلیس تھے [۵]۔

دوران بحث میں زرنوجی نے ادیبوں کے مبنی اقوال اور شعرا کے لطیف شعر بھی جگہ جگہ نقل کئے ہیں یوں تو اشعار کا انتخاب ہی زرنوجی کے ادبی ذوق کی غمازی کرتا ہے، لیکن بعض نے دو تین موقعوں پر خود اپنے اشعار بھی لکھے ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے [۶]۔

ماہر تعلیم کی حیثیت سے زرنوجی کا درجہ کیا ہے، اسکی شہادت آئندہ صفحات بہم پہنچائیں گے -

---

(۱) الجواہر: ۲/ ۳۶، ۳۶۲، الفوائد: ۶۶ (۲) شرح تعلیم المتعلم: ۳۰، ۳۷ (۳) ایضًا ۵۵ تاریخ وفات کے لیے الجواہر: ۲/ ۱۳۲، ملاحظہ ہو تعلیم المتعلم کے قلمی نسخے میں کشانی اور شرح کے مطبوعہ نسخے میں کاشانی درج ہے انسائیکلوپیڈیا ۴/ ۱۸، کے مقالہ نگار نے اس سے مسعود بن احمد الکاسانی ملقب بعلاء الدین متوفی ۵۸۷ھ مراد لیے ہیں جسکی ظاہری وجہ بعض نسخوں میں الکاشانی یا الکاسانی کا درج ہو جانا ہے - (۴) شرح تعلیم المتعلم: ۲۶، ۵۱ (۵) ایضًا ۵۰ شرح کے مطبوعہ نسخے میں "الزرنجی" اور رسالے کے قلمی نسخے میں "الزانی" درج ہوگیا - اسی طرح دونوں میں قاضی صاحب کے والد کا نام "ابی بکر" ملتا ہے دیکھئے الجواہر المضیۃ: ۱/ ۲۷۱، ۳۸۸، اور ۲/ ۳۱۲، ۳۶۲ سے تصحیح کرکے لکھا ہے - شرح میں ایک غلطی یہ ہوئی ہے کہ مصنف کے الفاظ "وکان ابی" کو "کان ابوحنیفہ" سے بدل دیا ہے، امام ابوحنیفہ دوسری صدی ہجری کے بزرگ ہیں - وہ چھٹی صدی کے کسی شخص سے کس طرح روایت کرسکتے ہیں قلمی نسخے میں صاف طور پر "فکان ابی" تحریر ہے، اس لیئے میں نے انھیں لفظوں کے پیش نظر مصنف کے والد کے متعلق عالم ہونے کا قیاس قائم کیا ہے۔

(۶) شرح تعلیم المتعلم: ۴۰، ۴۴، ۵۱۔

تصنیفات ان کی تصنیفات میں سے اسی ایک رسالے کا ہمیں علم ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ان کی علمی زندگی کی بقا کے لیے یہی کافی ہے۔ اس کی واقعی تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا چونکہ صاحب ہدایہ متوفی ۵۹۳ھ (۱۱۹۷ء) کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا گیا ہے جن سے ان کی وفات ثابت ہوتی ہے، قیاس یہ کیا گیا ہے کہ زرنوجی نے سنہ مذکورہ کے بعد اس رسالے کو مرتب کیا ہے۔

رسالے کی شہرت اپنے اختصار، حسن انتخاب، اور خوبی طرز ادا کی بدولت اس نے مشرق و مغرب میں بڑی قبولیت اور شہرت پیدا کی ہے [۱]۔

ابن ابی الوفا متوفی ۷۷۵ھ (۱۳۷۳ء) نے تذکرہ فقہاء احناف میں لکھا ہے کہ مصر میں یہ رسالہ کمیاب ہے مگر میں نے بحمد للہ مہیا کر لیا [۲]۔ طاش کوپری زادہ، متوفی ۹۶۲ھ، اور اس کے اتباع میں حاجی خلیفہ نے اسے مسائل مہمہ پر حاوی قرار دیا ہے۔ محمود کفوی متوفی ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) نے اعلام الاخیار میں اس کی نفاست کی تعریف کے بعد لکھا ہے کہ یہاں (ترکی میں) آسانی سے مل جاتا ہے اور میں نے اس کتاب میں جگہ جگہ اس کی عبارتیں نقل کی ہیں [۴]۔

شارحین متعدد علماء نے اس کی شرحیں بھی لکھیں۔ ان میں غالباً پہلا شارح نوعی ہے، گو اس کی شخصیت مجہول ہے۔ اس کے بعد عبد الوہاب شعرانی مصری متوفی ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) نے شرح لکھی۔ شعرانی کے بعد ابراہیم بن اسمٰعیل رومی نے ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں سلطان ترکی مراد خاں ثالث کے لیے اس کی شرح کی۔ یہ شرح چھپ چکی ہے۔ اسحٰق بن ابراہیم رومی نے مراۃ الطالبین کے نام سے اور عثمان بازاری نے تفہیم المتفہم نام سے شرحیں لکھیں۔

قاضی زکریا انصاری مصری متوفی ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) نے اس کا خلاصہ کر کے اللؤلؤ المنظیم نام رکھا یہ خلاصہ ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا خلاصہ کسی نامعلوم شخص نے کیا ہے، اس کا نام برلین کے نسخے میں طریق التعلم اور ہمارے یہاں کے قلمی نسخے میں آداب المتعلمین درج ہے [۵]۔ ایک مجموعہ رسائل کے ساتھ یہی آداب المتعلمین کے نام سے ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) میں ایران سے شائع ہو چکا ہے۔

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۱/۴، ۱۲۱۸/۱۲۱۸ (۲) الجواہر ۱: ۳۶۲، ۲ (۳) مفتاح السعادہ ۱: ۲۵۰، وکشف الظنون ۱: ۲۱۲، طبع یورپ (۴) اعلام الاخیار ۱: ۲۵۱ الف تکمیلی

(۵) کتاب خانہ رامپور کے ایک قلمی نسخے میں جو ۱۱۵۲ھ کا نوشتہ ہے، کاتب نے غلطی سے آداب المتعلمین کو نصیر الدین طوسی کی طرف منسوب کر دیا اس دھوکے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے کئی جگہ محمد بن الحسن کے اقوال نقل کئے ہیں۔ یہ نام طوسی کا بھی ہے، اور مشہور حنفی فقیہ امام محمد بن الحسن شیبانی کا بھی وہاں شیبانی نسبت مذکور نہیں، کاتب نے غلط فہمی سے متن میں طوسی کا اضافہ کر کے خاتمے میں طوسی کو بحیثیت مصنف کے کر دیا۔

بروکلمان نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا کہ حسن بن علی الفقیر نے تعلیم المتعلم کے مباحث کو نظم کیا تھا۔

عالمِ مغرب میں اس رسالے کے تعارف کی تاریخ کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ طباعت سب سے پہلے ۱۷۰۹ء میں رلینڈس (H. Relandus) کے اہتمام سے جرمنی میں ہوئی، اس کے بعد ۱۸۳۸ء میں کیسپری (Caspari) نے لاطینی ترجمے، ابراہیم رومی کی شرح عربی اور فلیشر ([illegible]) کے مقدمے کے ساتھ لائپزگ سے شائع کیا۔

مشرق میں رسالے کی طباعت سب سے پہلے مرشد آباد بنگال میں ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء اور قازان میں ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ ایک مختصر شرح کے ساتھ تیونس میں ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء استنبول میں ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء اور قازان میں ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء اور مصر میں ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں چھاپا گیا۔ ان تاریخوں کے بعد بھی مصر وغیرہ میں کئی بار طبع ہو چکا ہے۔[۲]

دیباچہ

رسالے کے مباحث کا خلاصہ پیش کر کے زرنوجی کے اصولِ تعلیم و تعلم پر نقد و تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند سطری دیباچے کا بامحاورہ ترجمہ لکھ دیا جائے تاکہ مصنف کی غرضِ تصنیف سے آئندہ مباحث کی اہمیت کا قدرے اندازہ لگایا جا سکے۔

"میں نے اپنے زمانے کے اکثر طلبا کو دیکھا، بیچارے سعی و کوشش کے باوجود یا تو علم تک رسائی نہیں پاتے یا اس کے پھل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس محرومی کا باعث یہ ہے کہ انھیں تحصیل علم کے شرائط و آداب سے آگاہی نہیں، غلط راستے پر گامزن ہو کر گمراہ اور مقصد سے دور رہ جاتے ہیں، یہ دیکھ کر میں نے ارادہ کیا کہ طریقِ تعلم کے متعلق جو کچھ میں نے کتابوں میں پڑھا اور اپنے دانا استادوں سے سنا ہے، اُسے کتابی صورت میں جمع کر دوں۔ چنانچہ اس مجموعے کا نام "متعلم کو تحصیلِ علم کے طریقے کی تعلیم" رکھتا ہوں

مباحث کتاب۔ علم کی حقیقت اور فضیلت

علم اس صفت کا نام ہے، جس کے ذریعے سے ذکر و بیان میں آ سکنے والی اشیا منکشف ہوتی ہیں۔[۳]

انسان کی بیشتر صفات حیوان کی دوسری انواع میں بھی پائی جاتی ہیں۔ صرف صفتِ علم انسان کے ساتھ خاص ہے۔[۴] اس لیے انسان کو چاہیے اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش پر غور کرے، اور جو چیزیں حال و مآل

(۱) قلمی نسخوں کے لئے بروکلمان کی تاریخ آداب عربیہ ج ۱ ص ۶۰۶ اور اس کا ضمیمہ ج ۱ ص ۸۳۷ اور مطبوعہ کے لئے معجم المطبوعات ۹۶۱، اور الاکتفاء [illegible] القنوع: ۱۹۰ ملاحظہ ہوں۔ (۲) ملاحظہ ہو معجم المطبوعات: ۹۶۹
(۳) شرح تعلیم المتعلم: ۵-۶ (۴) شرح تعلیم المتعلم: ۵ (۵) ایضاً: ۸

دونوں میں اس کے لئے مفید ہیں، اُنھیں حاصل کرنے اور مضر اشیا سے اجتناب کی کوشش کرے[1]۔ اسی کا نام تقویٰ ہے جس پر دینی و دنیوی سربلندی اور ابدی سعادت کا انحصار ہے[2]۔

چونکہ ابدی سعادت ہر انسان کی بلندترین تمنا ہے، اس لیے شریعتِ اسلامیہ نے ہر مسلم مرد اور عورت کے لیے طلب علم کو فرض قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے[3]:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ»[4]

لیکن ہر فرد پر ہر علم کی تحصیل فرض نہیں ہے، اس لیے کہ باعتبارِ معلومات، علم کی تین قسمیں ہیں:-

(الف) اُن امور کا علم جن کی احتیاج ہر حالت میں ہر شخص کو ہوا کرتی ہے،

(ب) اُن امور کا علم جن کی حاجت کبھی کبھی یا کسی کسی کو ہوتی ہے۔

(ج) اُن امور کا علم جن کی قوم کو کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔

پہلی شق کی تحصیل ہر فردِ امت پر لازم ہے، اس لیے کہ اس علم کی مثال غذا کی سی ہے، جس کے حصول بغیر زندگی کی بقا ممکن نہیں۔

دوسری شق کی طلب فرضِ کفایہ ہے، یعنی آبادی کے مناسب افراد اُن علوم کو حاصل کرلیں، تو ساری جماعت اس فرض کی ادا سے سبکدوش ہو جائے گی، اور کوئی توجہ نہ کرے، تو سب مجرم قرار پائیں گے۔ اس علم کی تمثیل دوا سے دی جاسکتی ہے، جس کی ضرورت کبھی کبھی پیش آتی ہے، مگر بوقتِ ضرورت استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

تیسری شق کی تعلیم ممنوع ہے، یہ وہ علوم ہیں جن کی تحصیل اخلاق و اعمالِ صالحہ پر بُرا اثر ڈالتی ہے اور ان کی مثال مرض کی سی ہے جس سے بچنا ہر انسان کا فرض ہے۔

حکومت کا فرض ہے کہ قسمِ اول کی تعلیم بہرحال جبری طور پر دے، دوسری قسم کی تعلیم پر موزوں افراد کو صرف اُس وقت مجبور کرے جب پوری جماعت اُس کی طرف سے غفلت برت رہی ہو، اور تیسری قسم سے قوم کو بہرحال باز رکھے۔

خالص مذہبی علوم، یعنی علومِ قرآن، علمِ حدیث، علمِ فقہ، علمِ عقائد و کلام، علمِ اخلاق وغیرہ اور خالص دنیوی فنون یعنی تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، فلسفہ، منطق، ہئیت، ریاضی، طب وغیرہ مذکورۂ بالا تقسیم میں شامل ہیں۔ یعنی ان میں سے کچھ علم یا کسی ایک علم کا کچھ حصہ جبری تعلیم میں اور بقیہ اختیاری میں شامل کیا جائے گا۔ اس لیے کہ علم کا فائدہ جلبِ نفع اور دفعِ ضرر ہے[1]۔ اور یہ دونوں باتیں مذکورۂ بالا فہرستِ علوم سے یکساں متعلق ہیں۔

(۱) شرح تعلیم المتعلم: ۱۶ (۲) ایضاً: ۱۰ (۳) ایضاً: ۶ (۴) ایضاً: ۱۶

مقصد تعلیم | عمل کے لئے دعزم کا مدار نیت پر ہے متعلم کا دلی منشا تعلیم سے رضاء الٰہی کا حصول، اپنی ذات اور دوسرے ان پڑھوں سے جہالت کا ازالہ، اور احیاء دین ہونا چاہیے! دنیوی جاہ و منصب اور شہرت و عظمت وغیرہ کی خاطر تحصیل علم نازیبا ہے۔

بالفاظ دیگر متعلم کا مقصد و مدعا خالص روحانی ہونا چاہیے، مادی ہرگز نہ ہو، ورنہ مادی جذبات کے اثر سے ایک طرف اس کا افادہ محدود ہو جائے گا۔ اور دوسری طرف دنیا کی ہر مادی تکلیف راہِ علم میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جائے گی اور انسان اس راہ میں ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لیے مشکل آمادہ ہو سکے گا۔

اس بلند مقصد کے پیش نظر متعلم کے لیے لازم ہوگا کہ طمع، ذلت اور تکبر سے پرہیز کرے، اور تواضع اور عفت اختیار کرے، جو تکبر اور ذلت کا درمیانی درجہ ہے! ورنہ خود اُس کی اور اُس کے ساتھ علم اور اہلِ علم کی بھی ذلت ہوگی، جو دراصل بلند ترین مقصد کی توہین و تذلیل کے مترادف ہے۔

فن، استاد، اور ہم سبق کا انتخاب | دینیات کی تعلیم کو پہلی جگہ دی جائے اور دینیات میں سے علم توحید کو مقدم رکھا جائے۔ اس کے حسب ضرورت درجہ بدرجہ دوسرے علم حاصل کئے جائیں۔[۲]

مناظرانہ علوم قابلِ ترک ہیں۔ ان سے دانائی اور تفقہ گھٹتا اور عداوت و وحشت بڑھتی ہے۔ اسی لیے متقدمین نے جدل و خلاف سے ہمیشہ احتراز، اور اس قسم کے علوم کے رواج کو "علم کے اٹھ جانے" سے تعبیر کیا ہے۔[۲]

کتابوں کے انتخاب میں اس کا لحاظ رکھا جائے کہ پہلے مختصر کتابیں پڑھی جائیں، بعد ازاں مطول؛ اور جو کتاب پڑھی جائے، پوری پڑھی جائے، ادھوری نہ چھوڑی جائے۔ یہی صورت علم و فن میں بھی اختیار کی جائے گی، یعنی ایک فن کی پوری تحصیل سے پہلے اُسے چھوڑ کر دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہیے۔ کسی اسکول کالج یا یونیورسٹی کو بھی اُس وقت تک نہ چھوڑے، جب تک وہاں تعلیم ختم نہ کرلے۔ نہ بلا ضرورت استاد بدلے، اس سے استاد کو اذیت پہنچتی ہے۔

مذکورۂ بالا صورتیں تضیعِ اوقات، انتشارِ قلب اور تشتتِ امور کا موجب ہوتی ہیں۔[۵]

---

(۱) شرح تعلیم المتعلم: ۱۵ (۲) ایضاً: ۲۰-۲۲ (۳) ایضاً ۲۲ (۴) ایضاً: ۲۳- (۵) ایضاً: ۲۶

استاد کے انتخاب میں علم، نیکوکاری اور سن کا لحاظ ضروری ہے۔ کم عمر، بداخلاق، بدکردار اور کم علم استاد مضر ہوتا ہے۔

ہم سبق بنانے وقت ہی یہ دیکھ لینا چاہیے کہ محنتی، پاک دامن، فہیم اور مستقیم الطبع ہے یا نہیں سست، نکمے، بکواسی، اور مفسد ساتھی سے دور بھاگنا چاہیے۔

تعظیم علم علم، علما اور استاد کی تعظیم بہت ضروری ہے جس طالب علم کے دل میں علم کی عظمت، علما کا احترام اور استاد کی تعظیم و توقیر نہیں، وہ یا تو مطلقاً علم سے محروم رہتا ہے، یا اس کی برکتوں سے نفع اندوز نہیں ہوتا۔[1]

استاد کی تعظیم دراصل علم کی تعظیم ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ

اَنَا عَبْدُ مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفًا وَاحِدًا۔ اِنْ شَاءَ بَاعَ وَاِنْ شَاءَ اَعْتَقَ وَاِنْ شَاءَ اسْتَرَقَّ

یعنی میں اُس شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف سکھایا۔ اُسے پورا اختیار ہے کہ مجھے بیچ ڈالے یا آزاد کر دے یا غلام بنائے رکھے![2]

ارشادِ نبوی ہے کہ خَیْرُ الْآبَاءِ مَنْ عَلَّمَکَ یعنی معلم بہترین باپ ہوتا ہے۔

استاد کی تعظیم کے سلسلے میں حسبِ ذیل آداب کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

۱۔ استاد سے آگے نہ چلے،

۲۔ استاد کی جگہ نہ بیٹھے، نہ سبق کے وقت بے ضرورت استاد سے لگ کر بیٹھے، بلکہ استاد و شاگرد میں کمان بھر فاصلہ مناسب ہے۔

۳۔ بے اجازت گفتگو نہ کرے۔

۴۔ زیادہ گفتگو نہ کرے۔

۵۔ ملالِ طبع کے وقت سوالات نہ کرے۔

۶۔ استاد کے مقرر کیے ہوئے وقت کی پابندی کرے۔

۷۔ استاد کے مکان پر جائے، تو دروازہ نہ کھٹکھٹائے، از خود برآمد ہونے کا منتظر رہے۔

۸۔ خوشنودی استاد کا متمنی رہے اور خفگی سے بچے،

(۱) شرح تعلیم المتعلم: ۲۷-۳۲ (۲) ایضاً: ۲۹۔

۹۔ استاد کے تمام حکموں کی تعمیل کرے، بجز اُن حکموں کے جو خدا کے احکام کے خلاف ہوں، کیونکہ ارشاد نبوی یہ ہے کہ
لَاطَاعَةَ لِلْمَخْلُوقِ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ۔ یعنی خدا کی نافرمانی میں بندوں کی اطاعت نہ کی جائے،
۱۰۔ استاد کی اولاد اور متعلقین کی بھی توقیر کرے[۱]
ہارون الرشید نے اپنے صاحبزادے کو اس عہد کے مشہور فاضل اصمعی کے پاس تعلیم کیلیے بھیجنا شروع کیا تھا۔ ایک دن ہارون درس گاہ میں خود تشریف لے گئے، دیکھا کہ استاد وضو کر رہے ہیں اور مرشد زادہ پانوں پر پانی ڈال رہا ہے۔ ہارون بہت ناراض ہوئے اور کہا میں نے اس بچے کو علم و ادب سیکھنے کے لیے یہاں بھیجا تھا۔ آپ نے اسے یہ حکم کیوں نہ دیا کہ ایک ہاتھ سے پانوں دھوئے اور دوسرے سے اس پر پانی ڈالتا جائے"[۲]۔
کتاب کی تعظیم بھی علم کی تعظیم ہے۔ اس لیے طالب علم کو چاہیے کہ بحالت طہارت کتاب کو ہاتھ لگائے کتاب کی طرف پانوں پھیلا کر نہ بیٹھے، اور نہ کتاب پر کچھ رکھے۔ کتاب کی نقل کرے، تو نہایت اچھے خط میں اور حاشیے خوب چھوڑ کر اسی طرح جلی قلم سے لکھے، باریک باریک نہ لکھے، حاشیوں پر کچھ نہ لکھے مگر مجبوری ہو تو بضرورت باریک قلم سے بھی لکھا جائے
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کاتب کو خفی لکھتے دیکھ کر فرمایا تھا کہ خفی نہ لکھو، ورنہ جیتے رہے تو ندامت ہوگی، اور مرجاؤگے تو مذمت کی جائے گی۔
کتاب کی تقطیع مربع ہونا چاہیے۔ اس کے اٹھانے، رکھنے اور پڑھنے میں سہولت ہوتی ہے۔
روشنائی کالی ہونا چاہیے۔ لال رنگ کا استعمال سلف کو پسند نہ تھا۔ یہ فلسفیوں کی اختراع ہے۔
ہم سبقوں کا احترام بھی علم کی تعظیم ہے۔ اُن کے ساتھ محبت اور لطف سے پیش آنا چاہیے۔
چاپلوسی ہر جگہ مذموم ہے، سوائے راہ علم کے۔ استفادے کے خیال سے استاد اور ہم سبقوں کی چاپلوسی ہر حال مناسب ہے[۳]۔
طالب علم کا یہ بھی فرض ہے کہ لکچر انتہائی عظمت و احترام سے سنے، خواہ مسائل زیر بحث کو ہزار بار سن چکا ہو۔ جو متعلم بے پروائی سے لکچر سنتا ہے، وہ علم کا اہل نہیں[۵]
طالب علم کو یہ بھی لازم ہے کہ اپنے لیے مضامین کا انتخاب استاد سے کرائے۔ خود رائی سے فیصلہ

(۱) شرح تعلیم المتعلم: ۳۰، (۲) ایضاً: ۳۲ (۳) ایضاً: ۳۳ (۴) ایضاً: ۳۳-۳۴ (۵) ایضاً: ۳۴۔

نہ کرے۔ استاد کو اس نوع کا کافی تجربہ ہوتا ہے، اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طالب علم کی طبیعت کس علم سے مناسبت رکھتی ہے، اور کس شاگرد کو کون سا فن مفید ہوگا۔ شیخ الاسلام مرغینانی کا قول ہے، سلف کا دستور تھا کہ تعلیمی امور یکسر استاد کے سپرد کر دیتے تھے، جس کا نتیجہ حصولِ مراد نکلتا تھا۔ اب خود مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نامراد رہ جاتے ہیں[1]

متعلم کو بد اخلاقیوں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ علم روشنی ہے، نور ہے، الٰہی صفت و قوت ہے اور اخلاقِ ذمیمہ معنوی کتے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس گھر میں کتا موجود ہو، وہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے پس علم و بد اخلاقی ان دونوں کا اجتماع بھی ناممکن ہے۔

کوشش، استقلال، ہمت

متعلم کے لیے کوشش، استقلال اور بلند ہمتی لازمی صفات ہیں۔ جب کوڑی پیسہ بغیر محنت مشقت ہاتھ نہیں آتا، تو علم جیسی بیش بہا دولت کس طرح مل سکتی ہے

کوشش میں، طلباء، اساتذہ اور سرپرستوں کا اتحادِ عمل ضروری ہے۔ ورنہ خاطر خواہ کامیابی نہ ہوگی[2]

کوشش کا بہترین زمانہ آغاز و عنفوانِ شباب ہے۔ یہ زمانہ پائدار نہیں ہے، اس لیے اسے غنیمت شمار کرنا چاہیے۔

کوشش حدِ اعتدال تک رہے، ورنہ طبیعت میں ضعف اور علم سے نفرت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے نرمی اور ملائمت عظیم الشان اصول ہے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ نفس تمہاری سواری ہے اس کے ساتھ نرم سلوک کرو۔[4]

بلاناغہ پڑھنا اور آموختے کی تکرار اور اعادہ لازم ہے۔ اوقاتِ درس کے علاوہ پڑھنے کا بہترین وقت رات کا ابتدائی اور آخری حصہ ہے۔ دانا رات کے مطالعے کو کامیابی کی کنجی بتلاتے ہیں[5]

متعلم کو بلند ہمت بھی ہونا چاہیے۔ انسان ہمت ہی کے پروں سے اڑتا ہے۔ پست ہمت کے مقاصد ہمیشہ پست ہوتے ہیں اور بلند ہمت کے بلند۔ کوشش اور استقلال کے ساتھ ہمت کی مدد نہ ہو، تو کمالِ علم میسر نہیں آسکتا!

سستی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ بڑی نحوست اور بلائے عظیم ہے سست ہمیشہ محروم اور پشیمان رہتا ہے

جو متعلم، طلبِ علم میں چست و چالاک نہیں، وہ دراصل علم کی خوبیوں سے ناواقف ہے۔ جاہل زندگی میں بھی مردہ اور عالم مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔

بیشتر اوقات سستی کا باعث پرخوری ہوتی ہے، متعلم کو تقلیلِ غذا پر کاربند رہنا چاہیے، تاکہ کسل دور ہو

(۱) شرح تعلیم المتعلم: ۳۴ (۲) ایضاً: ۳۵ (۳) ایضاً: ۳۷ (۴) ایضاً: ۳۸ (۵) ایضاً: ۴۰ (۶) ایضاً: ۴۴۔

اور صحت، عفت، اور ایثار یہ سب خوبیاں پیدا ہو جائیں، یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ آدمی غذا کی خاطر جسمانی امراض اور روحانی شقاوت و بدبختی میں مبتلا ہو[1]۔

تقلیلِ غذا کی ایک تدبیر یہ ہے کہ مرغن کھانا کھائے، اور اگر دسترخوان پر اچھے کھانے بھی ہوں تو پہلے انھیں کھالے۔

لیکن تقلیلِ غذا ہر حالت میں مناسب نہیں، قوت و طاقت پیدا کرنے کے لیے پیٹ بھر کر کھانا ہی بہتر ہے[2]۔

سبق، مقدار اور ترتیب | سبق کی مقدار، بندی کے لیے، اتنی ہو کہ وہ دہرا کر یاد کر سکے۔ مقدار میں اضافہ تدریجی ہونا چاہیے۔

اگر شروع میں سبق لمبا ہوا، اور استاد نے دس مرتبہ پڑھا کر یاد بھی کرا دیا، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر تک متعلم کی یہی عادت پڑی رہے گی۔ آزاد مطالعے کی مشکل نوبت آئے گی۔

سبق کا اعادہ اور تکرار بے حد ضروری ہے، ایک مشہور مقولہ ہے۔ اَلسَّبَقُ حَرْفٌ، وَالتِّكْرَارُ اَلْفٌ۔ یعنی ایک حرف پڑھ کر ہزار بار دہرانا چاہیے۔

شروع میں وہ علم پڑھایا جائے، جو مبتدی کے عقل و فہم سے زیادہ قریب ہو۔

ابتدائی کتابوں کو مختصر ہونا چاہیے۔ ان کو سمجھنا اور یاد کر لینا آسان ہوتا ہے۔

سبق زبانی پڑھایا جائے، اور متعلم استاد کے پڑھاتے ہوئے سبق کو ضبط و اعادے کے بعد خود لکھے۔ اسے تعلیق کہتے ہیں، اور یہ بہت مفید کام ہے۔

متعلم وہی لکھے، جسے خوب سمجھ چکا ہے۔ بے سمجھے بوجھے کچھ لکھ لینے سے طبیعت کند ہو جاتی ہے، ذکاوت گھٹتی ہے اور وقت اکارت جاتا ہے[3]۔

سبق کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ خواہ استاد سے سمجھے، خواہ غور و فکر کرنے اور بار بار پڑھنے سے۔ دو حرف یاد کرنا سیکڑوں باتیں سن لینے سے، اور دو حرفوں کا سمجھ لینا سیکڑوں کے یاد کرنے سے بہتر مانا گیا ہے۔

جو طالب علم شروع سے غور و فکر کی عادت نہیں ڈالتے، وہ آیندہ معمولی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتے۔

طلبا کے لیے یہ بھی مناسب ہے کہ باہم بحث و مباحثہ کرتے رہیں، مگر یہ شرط ہے کہ انصاف،

(۱) شرح تعلیم المتعلم ۴۴ (۲) ایضاً ۵۰ (۳) ایضاً ۵۱

طمانیت اور تامل و فکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور شور و شر سے اجتناب رہے، طلبا کا مذاکرہ و مباحثہ ایک قسم کا باہم مشورہ ہے اور مشورے میں شور و شر اور غم و غصہ مقصد سے دور کر دیتا ہے۔[1]

مدمقابل کو قائل کرنے اور ہرا دینے کی نیت سے مباحثہ ممنوع ہے۔ اسی طرح بحث میں فریب اور حیلہ بھی ناجائز ہے، بحث کی خوبی یہ ہے کہ جہاں لاجواب ہو، اقرار کر کے آئندہ سوچنے سمجھنے کی مہلت مانگ لے اس طالب علم سے مباحثہ جو منصف اور سلیم الطبع ہو، معلومات میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے گھڑی بھر کے مباحثے کو مہینہ بھر کے اعادہ و تکرار سے بہتر تسلیم کیا گیا ہے۔[2]

دقیق مسائل میں غور و تامل کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ تامل و تفکر، گفتگو اور بحث سے پہلے ہونا چاہیے تاکہ رائے میں غلطی نہ ہو تیر جب تک سیدھا نہ ہو، نشانے پر نہیں لگ سکتا۔ تامل و وقار سے گفتگو کرنا اصل دانائی ہے۔[3]

متعلم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر وقت اور ہر شخص سے علمی فائدہ اٹھانے کے درپے رہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ۔ اَیْنَمَا وَجَدَھَا، اَخَذَھَا۔ یعنی دانائی مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں کہیں اُسے پائے لے لے۔ ہاں "خُذْ مَا صَفَا، دَعْ مَا کَدِر" (ستھرا لو، گدلا چھوڑ دو) پر عمل کرتا رہے۔[4]

امام ابو یوسف سے سوال کیا گیا تھا کہ "آپ نے یہ علمی درجہ کیسے پایا؟" انھوں نے جواب میں کہا "میں نے کسی سے فائدہ اٹھانے میں شرم نہ کی، اور فائدہ پہنچانے میں کنجوسی نہ برتی"

حضرت ابن عباس، رضی اللہ عنہ، نے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "بِلِسَانٍ سَئُوْلٍ وَقَلْبٍ عَقُوْلٍ" یعنی زیادہ پوچھ گچھ کرنے والی زبان اور زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والے دل کی بدولت۔[5]

کسب معاش اور تعلیم میں بیر نہیں۔ ضرورت کا تقاضا ہو، تو تعلیم کے ساتھ کمانے کھانے کے وسیلے بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ فقر و افلاس کو ترکِ تعلیم کا بہانا نہیں بنایا جائے گا۔[6]

تندرست اور عقلمند کو طلبِ علم سے معذور کبھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

قدما پہلے صنعت و حرفت کی تعلیم دیتے تھے، پھر نظری علوم پڑھاتے تھے، تاکہ فقر و فاقے سے طبیعت میں لالچ نہ پیدا ہو، تعلیم یافتہ لالچی ہو، تو علم کی حرمت و عزت پر بٹا لگتا ہے، اور حق گوئی کی جرأت زائل ہو جاتی ہے۔[7]

---

(۱) شرح تعلیم المتعلم: ۵۲ (۲) ایضاً: ۵۳ (۳) ایضاً: ۵۴ (۴) ایضاً: ۵۵ (۵) ایضاً: ۵۶ (۶) ایضاً: ۵۷ (۷) ایضاً: ۵۸-۵۹

متعلم کو کنجوس بھی نہ ہونا چاہیے۔ راہِ علم میں اپنے اوپر اور دوسرے کم استطاعت طلبا پر خرچ کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے[1]

پڑھنے اور دہرانے کے لیے سبق کی مقدار مقرر کرنا چاہیے۔ مناسب یہ ہے کہ کل کا سبق ۵ بار، پرسوں کا ۴ بار، چار دن پہلے کا تین بار، پانچ دن پہلے کا ۲ بار اور چھ دن قبل کا ۱ بار دہرا لیا جائے۔
تکرارِ سبق میں شرمانا نہ چاہیے بلکہ ذوق شوق سے اس کام کو انجام دے۔ ہاں، زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنا، و نفس کو تھکا دینا ٹھیک نہیں[2]

توکل

طالبِ علم کو دورانِ تعلم میں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے، اور امورِ معاش میں دل کو مشغول نہ کرنا چاہیے۔ کھانے کپڑے کے اہتمام میں جو شخص لگ جاتا ہے، اُسے اعلیٰ مقاصد کے لیے کبھی فراغت نصیب نہیں ہوتی[3]

متعلم کو دنیوی تعلقات حتی الامکان گھٹانا چاہیے۔ اس کی بہتر صورت تعلیمی سفر ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ پردیس میں ہر قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ متعلم کو علم کی خاطر انھیں بہ خندہ پیشانی برداشت کرنا ہوگا[4]
متعلم کو علم کے سوا کسی اور مشغلے میں مصروف نہ ہونا چاہیے[5]

زمانۂ تعلیم

تعلیم کا زمانہ گہوارے سے لحد تک ہے۔ لیکن بہترین حصہ آغازِ شباب مانا گیا ہے۔ متعلم کا ہر وقت تعلیم ہی میں گزرنا چاہیے۔ لیکن جب ایک مضمون سے دل گھبرا جائے تو دوسرا پڑھنے لگے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، گفتگو سے اکتا جاتے، تو شعر لکے دواوین پڑھنے لگتے تھے۔
مطالعے کا بہترین وقت، اول و آخرِ شب ہے۔ اگر دورانِ مطالعہ میں نیند آنے لگے، تو آنکھوں پر پانی ڈال کر دفع کر لینا چاہیے[6]

شفقت و نصیحتِ استاذ

استاد کو ناصح اور مشفق ہونا چاہیے۔ حاسد ہرگز نہ ہو، ورنہ شاگردوں کو نفع نہیں پہنچا سکتا، اور خود نقصان اٹھائے گا۔ استاد کی تو یہ تمنا ہونا چاہیے کہ اپنے شاگرد کو دنیا بھر کے اہلِ علم سے آگے بڑھا سکوں۔
متعلم کو نزاع اور خصومت سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ سراسر تضیعِ اوقات ہے۔ بھلا چاہنے والا اپنے کیے کی جزا اور برا چاہنے والا کرتوت کی سزا آپ سے آپ پا لیتا ہے۔ پھر خواہ مخواہ کیوں وقت ضائع کیا جائے

(۱) شرح تعلیم المتعلم: ۵۸-۵۹ (۲) ایضاً: ۶۰ (۳) ایضاً: ۶۱ (۴) ایضاً: ۶۲ (۵) ایضاً: ۶۳ (۶) ایضاً: ۶۴

صبر و تحمل اور حسنِ ظن اختیار کرنا چاہیے۔ سوءِ ظن، خباثتِ نیت اور بد باطنی کی دلیل اور عداوت و دشمنی کی جڑ ہے۔[1]

استفادہ

طالب علم کو ہر وقت استفادے کے درپے رہنا چاہیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قلم دوات (پنسل یا فاؤنٹین پن) پاس رہے، اور جو مفید علمی بات سنے، لکھ لے۔ ارشاد نبوی ہے کہ

لَا تُفَارِقِ الْمِحْبَرَةَ، فَإِنَّ الْخَيْرَ فِيهَا وَفِي أَهْلِهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ،

قلم دوات کو جدا نہ کرو۔ قیامت تک قلم دوات، اور اس کے اہل میں بھلائی پائی جائے گی۔

دانا کہتے ہیں، کان پڑی بات بھاگ جاتی ہے، اور لکھی بات جم جاتی ہے۔

عمر تھوڑی ہے اور علم زیادہ، جو وقت مل جائے، اسے غنیمت جانو اور اوقاتِ فرصت کو ضائع نہ کرو۔

بزرگوں کی قدر کرو اور ان سے بھلی باتیں سیکھو۔ ارشاد نبوی ہے اَلْبَرَكَةُ مَعَ اَكَابِرِكُمْ برکت بزرگوں کے ساتھ ہے۔

طالبِ علم کو راہِ علم میں محنت و مشقت برداشت کرنا چاہیے۔ یاد رکھو، چاپلوسی ہر جگہ مذموم ہے، مگر طلبِ علم کی خاطر استاد اور شرکاءِ درس کی خوشامد سے گریز نہیں۔[2]

پرہیزگاری

متعلم کو بد اخلاقیوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ نیکوکار کو علم کی تحصیل بھی آسان ہوتی ہے اور فائدہ بھی زیادہ پہنچتا ہے۔

یہ بھی پرہیزگاری ہے کہ نہ زیادہ کھائے، نہ زیادہ سوئے، نہ زیادہ بولے۔

بازاری کھانا کھانا، غیبت کرنا، بکواسیوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا پرہیزگاری کے خلاف ہے، بکواسی تمہاری عمر چراتا اور وقت ضائع کرتا ہے۔

مفسدوں، بدکاروں، اور نکموں سے بچنا بھی پرہیزگاری ہے۔ صحبت اثر کرکے رہتی ہے۔

درس اور تکرار کے وقت رو بقبلہ بیٹھنا چاہیے، صالحین کی دعا کا طلبگار اور مظلوموں کی بد دعا سے مجتنب رہنا چاہیے، اور اسلامی آداب میں سستی نہ برتنا چاہیے جو آداب میں سستی کرتا ہے سننِ نبوی سے محروم ہو جاتا ہے، اور جو سننِ نبوی میں سستی کرتا ہے، فرائض سے محروم رہتا ہے اور جو فرائض سے محروم ہوا، اس کا انجام خراب ہے۔

متعلم کو نماز زیادہ پڑھنا چاہیے۔ عبادت تحصیلِ علم میں مدد کرتی ہے۔

(۱) شرح تعلیم المتعلم ۶۶ (۲) ایضاً: ۶۸۔

متعلم کی بغل میں ہر وقت مطالعے کے لیے کتاب رہنا چاہیے۔ ایک مقولہ ہے، جس کی آستین میں کتاب نہیں، اُس کے دل میں علم و حکمت کہاں ہے۔

موجبات حفظ و نسیان | قوتِ حافظہ بڑھنے کے اسباب یہ ہیں:۔ کوشش، ثبات، کمی غذا، نمازِ آخر شب (یعنی عبادت) اور سحر خیزی) تلاوتِ قرآن، گناہوں سے پرہیز، استعمالِ مسواک، شہد اور شکر کے ساتھ گوند کا استعمال. خالی معدے پر کشمش کھانا[1]

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بلغم پیدا کرنے والی ہر غذا حافظے کو گھٹاتی اور نسیان کو بڑھاتی ہے، اور بلغم کی تاثیر غذا، حافظے کو قوی کرتی اور بھول کو کھوتی ہے۔

ان امور سے بھول بڑھتی ہے:۔
گناہ گاری، دنیوی افکار، حزن و ملال، کثرتِ اشغال و تعلقات، ہرا دھنیا اور کھٹے سیب کھانا[2]

رزق و عمر کی کمی بیشی | طالب علم کو قوت (روزی) اور اُس کے بڑھانے کے اسباب بہرحال درکار ہیں تاکہ فارغ البال ہو کر تحصیل علم کرے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ارتکابِ گناہ، خصوصاً جھوٹ رزق کو گھٹاتا ہے۔ زیادہ سونا، بیحیائی، نجس و ناپاک رہنا، رزق کی بے ادبی اور ناقدری، وقت پر کام نہ کرنا، بزرگوں کا ادب نہ کرنا، کپڑے، کھانے کے برتن اور کمرے کو گندہ رکھنا، عبادت میں سستی، بازاروں میں گھومنا، لکھنے پڑھنے کے سامان کو خراب خستہ کرنا، کنجوسی، اسراف، یہ سب فقر و افلاس تک پہنچاتے ہیں۔

غربا کی امداد، حسنِ خط، خوش کلامی، صفائی، خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت، خاموشی اور عورتوں سے کم میل جول سے رزق میں کشائش پیدا ہوتی ہے۔

ارشادِ نبوی ہے کہ "نیکی اور حسنِ سلوک سے عمر بڑھتی ہے"۔ بزرگوں کی تعظیم و توقیر، صلۂ رحم، ترکِ ایذا، صفائی اور حفظانِ صحت کے اصول کا علم اور اُن پر عمل بھی زیادتیٔ عمر کا باعث ہوتے ہیں[3]۔

یہاں تک زرنوجی کے بیان کا خلاصہ تھا۔ آیندہ صفحات میں اس کا تجزیہ کرکے جدید انداز پر ایک تعلیمی دستور العمل پیش کیا جائے گا، اور اُس کے اجزا کی حسن و خوبی اور نقصان و ضرر سے مفصل بحث کی جائے گی۔

امتیاز علی عرشی

---

(۱) شرح تعلیم المتعلم، ۶۹-۷۰ (۲) ایضاً: ۷۳-۷۶ (۳) ایضاً، ۷۶-۷۸

بچوں کے کتاب خانے کا شاندار افتتاح

رامپور میں تاریخی اجتماع

مرشد زادۂ آفاق نواب ولی عہد بہادر

نے رسم افتتاح ادا فرمائی

۱۳ مئی ۱۹۴۶ء کو بچوں کے کتاب خانہ کا افتتاح ہوا جس میں نہ صرف مدرسوں کے طلبا اور اساتذہ نے شرکت کی بلکہ عمائدین شہر کی ایک بہت بڑی تعداد شریک جلسہ تھی۔ عظیم الشان تاریخی مظاہرہ محکمۂ تعلیم کی روز افزوں ترقیوں اور عوام میں تعلیمی دلچسپیوں کا حامل تھا۔ پروگرام میں تمثیلی مشاعرہ عمدہ عمدہ نظمیں اور ایک چھوٹا سا ڈرامہ شامل تھا جس میں بچوں نے انتہائی کامیابی سے حصہ لیا۔

ہم جنگ کے زمانہ میں پیدا ہوئے

"تعلیمی مضامین" سرخی کے ماتحت آپ یہ امید رکھتے ہوں گے کہ عنوان مندرجہ بالا کسی تحقیقاتی مضمون کی تفصیل ہوگی یا کسی موضوع خاص پر کوئی طولانی منطقی تبصرہ جو یقیناً "سرخی" کے عام مطالب سے ظاہر بھی ہوتا ہے۔ مگر "ہم جنگ کے زمانہ میں پیدا ہوئے" چند لفظوں کا ایک مختصر بیان ہے جسے دورِ حاضرہ کے ان معصوم بچوں کی دکھی پکار کہنا چاہئے جنہوں نے عالم وجود میں اس وقت آنکھیں کھولیں جب زمانہ برسرِ جنگ تھا مہذب دور میں بنی نوع انسان کی تباہی و بربادی کے لئے تیار اور تعلیمی دنیا اپنی تعمیری اطلاقات سے بجائے انسانیت پروری کے انسانیت کشی پر آمادہ تھی۔ یہ جامع مگر مختصر جذبات امریکہ کے شاعر آرنسٹ لیفبور نے چند سطروں میں نظم کر دئے ہیں جن کا ترجمہ آپ کے حقیقی تاثرات کا جائزہ لینے کے لئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آپ دنیائے مستقبل کے معمار اور قوموں کے بنانے والے ہیں، آپ کی مخصوص توجہ اس نظم کی آخری دو سطروں کی جانب مبذول کی جاتی ہے جن سے "بچہ" کے صحیح معنوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیا آپ ایسی سعی فرمائیں گے کہ یہ افرادِ مستقبل کے جو امانت ہیں آپ کی رہنمائی میں صلح و آشتی کے مجاہد ہوں کہ عالم امکان کے منتشر اجزا کو انسانیت کی ایک لڑی میں پرو دیں اور آپ کی سرپرستی میں صحیح نشو و نما پا کر اتحاد و اتفاق کی فضا میں آزادی کی گونج پیدا کر دیں ...؟

ہم لڑائی کے بچے ہیں –
جو عالم خوف و خطر میں پیدا ہوئے –
ہمارے شفیق باپ میدانِ جنگ میں مصروفِ کار تھے –
اور ہماری مائیں ہم سے دست بردار ہوگئی تھیں –
ہمارے کھلونے چوبی بندوقیں ہیں –
ہم جنگ کے کھیل کھیلتے ہیں –
کونٹری کے بچے کہاں ہیں ....؟
اور ٹوکیو کے لڑکے اور لڑکیاں جنہوں نے ہم معصوموں کو فاقہ کا نشانہ بنایا
اب ہم اپنی غذا کہاں سے لائیں ....؟
ہم کم سن اور نحیف ہیں –
لیکن ہمارے کمزور کاندھوں پر دنیائے مستقبل کا بار ہے –

ایک اچھی کتاب

"مدرسۂ جدید" بلجیم میں

میں آج آپ کا تعارف تعلیم کے متعلق ایک بہت مفید اور دلچسپ کتاب سے کرانا چاہتا ہوں جس کا نام ہے "بلجیم میں ایک مدرسہ جدید" یہ کتاب ابتدا میں فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی، اس کے بعد اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ اور کئی سال ہوئے میں نے اس کا ترجمہ اردو میں بھی کیا تھا لیکن ابھی تک اس پر آخری نظر ڈال کر چھپوانے کی نوبت نہیں آئی۔ بہرحال امید ہے کہ اس مختصر سے تعارف کی مدد سے آپ کو اس کتاب میں دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔

یہ کتاب بلجیم کے ایک نہایت مشہور معلّم اور ماہر تعلیم اے فاریاڈی واسکونسلو نے لکھی ہے اور اس میں اپنے اس مدرسہ کے مفصل حالات بیان کئے ہیں۔ جو اس نے یورپ کی جنگ عظیم نمبر ا سے پیشتر قائم کیا تھا۔ اور جس کو جنگ ہی کی وجہ سے بند کرنا پڑا تھا۔ یہ حالات اس نے لکچروں کی شکل میں جنیوا کے مشہور تعلیمی ادارہ "روسو انسٹی ٹیوٹ" کے سامنے بیان کئے تھے۔ لیکن بعد میں ان کتابوں کی شکل میں مرتب کر کے چھپوا دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کتاب میں تخاطب کی شان پائی جاتی ہے۔ جیسے کوئی براہ راست ہم سے باتیں کر رہا ہو۔ لیکن اس طرز اظہار کی وجہ سے کتاب کا مضمون زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔

اس مدرسہ کے بانی کی کوشش یہ تھی کہ اس میں ان تمام اصولوں اور نظریوں کو عملی جامہ پہنایا جائے جو "تعلیم جدید" میں مضمر ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ خیالات ہوائی نہیں ہیں بلکہ قابل عمل بھی ہیں اور اگر ہم ان پر کاربند ہوں تو طلباء کی تربیت اور تعلیم بہت زیادہ مکمل اور قابل اطمینان طریقے سے ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ضمناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصول کیا ہیں جو جدید تعلیم کا طغرائے امتیاز ہیں۔ لیکن سب سے بڑا فائدہ اس کتاب کے مطالعہ کا یہ ہے کہ اس سے ان عملی مسائل پر روشنی پڑے گی جن سے استادوں کو آئے دن سروکار رہتا ہے اور جن پر اکثر ضخیم تعلیمی تصانیف بھی روشنی نہیں ڈالتیں۔ کیونکہ وہ بالعموم اصولوں اور نظریوں سے بحث کرتی ہیں۔ اور

غریب استاد جو روزمرہ کی تعلیمی مشکلات سے تنگ آجاتا ہے ان پر غور کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کرسکتا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یہ کتاب خاص طور پر سکول کے استادوں کو اپیل کریگی۔

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ کتاب اس قسم کی ہے جیسی تعلیم پر پرانی درسی کتابیں ہوتی تھیں جن میں ہر موقعہ کے لئے ایک ہدایت اور ہر مضمون کے ہر حصے کے لئے ایک صاف اور صریح طریقہ تعلیم دیا ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے ٹریننگ سکولوں اور کالجوں کے ہدایت یافتہ استادوں کا طریقہ عمل تیلی کے بیل جیسا ہوجاتا ہے اور ان کی جدت خیال، آزادی عمل، قوتِ فکر سب سلب ہوجاتی ہے۔ نہیں، اس کتاب میں تعلیمی نظریوں اور طریقوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ یعنی ہر طریقہ تعلیم کو بتاتے ہوئے یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ وہ کس نظریہ یا عام اصول کے ماتحت ہے اور ساتھ ہی ہر عام اصول کو عمل کی کسوٹی پر جانچا گیا ہے تاکہ اس کی صحت اور صداقت کا یقین ہوسکے۔ یہی نقطۂ نظر ہے جو ہمیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ یعنی عملی جزئیات میں اصول کی کارفرمائی دیکھیں اور انھیں عملی جزئیات کے مشاہدہ اور مطالعہ سے اصول کو اخذ کریں۔ تعلیمی ترقی اس طریقہ کار پر منحصر ہے۔

اس کتاب پر جنیوا ایک نہایت مشہور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر اڈولف فریر نے ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں انھوں نے "مدرسہ جدید" کے مفہوم سے بحث کی ہے۔ انھوں نے اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر تیس شرائط یا خصوصیات پیش کی ہیں جن میں سے (ان کے خیال کے مطابق) کم ازکم پندرہ ہر اسکول میں ہونی چاہئیں جس کو ان کی تعریف کے مطابق "مدرسہ جدید" مانا جاسکتا ہے۔ ان میں سے چند اہم شرائط کا ذکر استادوں کی واقفیت اور دلچسپی کے لئے کیا جاتا ہے۔

(۱) مدرسہ جدید کو ایک "تعلیمی معمل" ہونا چاہئے، یعنی اس میں نئے تعلیمی طریقوں اور اصولوں کی جانچ کرنی چاہئے کہ آیا وہ اس قابل ہیں کہ عام تعلیمی نظام میں منسلک ہوسکیں یا نہیں۔ اس طرح سے "مدرسہ جدید" دوسرے سرکاری اور غیرسرکاری مدارس کے لئے پیش رو کا کام دیتا ہے اور اپنے تجربوں کے ذریعے ان کو فائدہ پہونچاتا ہے۔

(۲) مدرسہ جدید میں طلبا کی رہایش کا انتظام ہونا چاہئے۔ کیونکہ جب تک طلبا سکول کی پڑھائی کے علاوہ باقی وقت بھی تعلیمی اثرات میں بسر نہ کریں ان کی تربیت مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس پر زور اس وجہ سے دیا جاتا ہے کہ اکثر اوقات گھر کے اثرات بچے کی تربیت میں معین نہیں ہوتے بلکہ اس پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔

(۳) مدرسہ جدید میں "دست کاری" مقررہ نصاب کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ طلبا کو کسی خاص پیشے کے لئے تیار کیا جائے بلکہ یہ کہ وہ تمام معاشرتی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوں جو ہاتھ کا کام کرنے سے ہوتے ہیں۔ اس میں نجاری، کاشتکاری، جانوروں کی نگہداشت وغیرہ شامل ہیں۔

(۴) طلبا کو بہت سے اپنی پسند مشاغل کے لئے وقت دیا جاتا ہے اور کھلی ہوا کی زندگی سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے سیاحت اور خیمہ زنی اسکول کے باقاعدہ مشاغل میں شامل ہیں۔

(۵) مدرسہ جدید میں تعلیم کا انحصار خود طالب علم کی اپنی محنت، جستجو اور تجربہ پر ہے۔ استاد کا کام ہر چیز کو "بتانا" نہیں ہے۔ بلکہ طلبا کو مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دینا ہے۔

(۶) مدرسہ جدید میں طلبا کو فرداً فرداً علحدہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس میں وہ اپنی جدت، اختراع اور اختلاف طبائع کو ظاہر کرسکیں۔ اس کے بعد وہ ان کو ایک دوسرے کے مطالعہ اور تفتیش سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۷) مدرسہ جدید میں ایک وقت میں بہت سے مضامین کا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ توجہ کو چند مضامین پر مجتمع رکھا جاتا ہے، دلچسپی کے لئے طریقہ تعلیم اور مطالعہ میں تبدیلی اور تنوع پیدا کیا جاتا ہے۔

(۸) ضبط اور انتظام کے لئے طلبا کی ایک "جمہوری حکومت" قایم کی جاتی ہے جس کے ذریعے وہ خود اپنے مسائل اور جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مدرسہ جدید میں استاد کی جبری حکومت بے محل ہے

(۹) طلبا میں مختلف قسم کے معاشرتی فرائض اور خدمات تقسیم کی جاتی ہیں تاکہ ان میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ ایک جماعت کے فرد ہیں اور اس رکنیت کی وجہ سے ان پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

(۱۰) سزا اور انعام ڈرانے اور تحریص کے لئے استعمال نہیں کئے جاتے۔ سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ آیندہ کے لئے بچہ زیادہ عمدہ کام کرکے دکھائے نہ کہ استاد کا غصہ دور کرنے کے لئے اور انعام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جن بچوں کی طبیعت میں "تخلیق" کا مادہ ہو انہیں اس کے نشو و نما کا موقع دیا جاتا ہے۔

(۱۱) بچوں میں مقابلہ اور مسابقت کا انتہائی جذبہ پیدا نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ اشتراک عمل کو روکتا ہے اس لئے ان کے کام کا مقابلہ زیادہ تر ان کے اپنے پچھلے کام سے کیا جاتا ہے نہ کہ دوسروں کے کام سے۔

(۱۲) مدرسہ جدید کا ایک ایسا ماحول ہونا چاہئے جو حسن سے معمور ہو۔ جو اپنے گرد و نواح کی خوبصورتی درستکاری کی تعلیم وغیرہ کے ذریعے اُن میں احساس حسن کو بیدار کرے۔

ان شرائط کو پڑھکر پہلا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نہایت صاف اور صریح چیزیں ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے مدرسوں کی تعلیم اور اس کے نظام زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی شرط یا اصول ایسا نہیں جس کو ہم بالعموم نظر انداز نہیں کرتے یا عملاً اس کے بالکل مخالف نہیں ہوتے۔ ہمیں کے اس "مدرسہ جدید" کا حال پڑھ کر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ کس طرح ایک استاد جو واقعتاً بچوں کی مکمل اور صحیح تربیت کا خواہاں ہو، ان اصولوں پر عمل کر کے مدرسہ کو صحیح معنوں میں ایک خوشگوار، مفید اور اخلاقی ماحول بنا سکتا ہے اور ان کی زندگی میں ان تمام عناصر اور صلاحیتوں کی ہم آہنگ تربیت کر سکتا ہے۔ جو آئندہ چل کر ان کو دنیا میں درکار ہوں گے۔

معذرت

کتابت و طباعت کی مشکلات کے باعث اپریل کا یہ ماہنامہ مئی کے دوسرے ہفتہ میں پریس جا رہا ہے۔ چونکہ اشاعت میں تاخیر ہو چکی تھی اس لئے مئی کے مہینہ کی محکمہ تعلیم ریاست رام پور کے متعلق چند اہم خبریں بھی اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔

قارئین کرام کی خدمت میں معذرت خواہ ہوں کہ حسب اعلان اپریل کا "تعلیم جدید" وقت مقررہ پر حاضر خدمت نہ کر سکا۔

حقیر

[illegible]

سنگ و خشت

بہت خوب رسالہ نے قلیل مدت میں کافی ترقی کی۔

جمنا پرشاد بی اے ال ٹی کالیستھ
پاٹ شالہ اسکول لکھنؤ

ہمارے لئے رسالہ تعلیم جدید صحیح معنوں میں ہمارے جذبات کا ترجمان ہے — احمد حسین۔ ایم اے۔ ال ٹی کانپور

میری "تائید" " فرمائیے آپ کی کیا رائے ہے" کے عنوان سے تجویز اول کی یعنی سرپرستوں کے لئے مدرسہ کی ضرورت" جو آپ کے فروری کے رسالہ میں شائع ہوئی ہے اس سے میں بلفظ بہ تائید کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں تعلیم کا پرچار کرنے والے اس مفید تجویز کی اہمیت پر غور کریں گے اور والدین و سرپرستوں کے لئے مجوزہ تعلیمی اداروں کے اجرا کی پیہم سعی کریں گے۔

سید اشرف حسین ایڈوکیٹ
" سرپرست لکھنؤ"

تشریح طلب " دنیا میں رفتار تعلیم" کے عنوان سے جو خبریں شائع ہوتی ہیں وہ تشریح طلب ہوتی ہیں۔ کیا آپ اس ذیل میں ایسا تعلیمی مواد فراہم کرکے درج نہیں فرما سکتے جو اصل کارکی یوں توضیح کرسکے کہ ہمارے کام کے آپ کی مختصر زحمت ہماری معلومات میں ایک معتد بہ اضافہ کردیگی۔

ایک استاد۔ رام پور

بچوں کی بیسک کا معائنہ واردھا تعلیمی اسکیم کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ حرفے کے ذریعہ تیار کی ہوئی اشیاء کو فروخت کیا جائے اور ان اشیاء کی قیمت سے جو روپیہ وصول ہو اس میں سے ہی استاد کی تنخواہ ادا کی جائے، اس تجویز کو حکومت نے اس لئے مسترد کردیا کہ استاد حرفے سے تعلیمی فائدہ اٹھانے کی بجائے اسے مالی منفعت کا ذریعہ بنا لیں گے اور بچوں سے کارخانوں کے مزدوروں کے مانند زیادہ سے زیادہ کام لیکر اپنی ماہوار آمدنی بڑھانے کی فکر میں لگے رہیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حرفے کے اجرا سے مدرسوں

کی حالت درست ہو جانے کی بجائے اور ابتر ہو جائے گی۔ اس لئے صوبوں کی حکومتوں نے اوستادوں کو خزانہ سرکاری میں سے تنخواہ دلایا جانا مناسب سمجھا۔

اس ترمیم کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ حرفے کے ذریعہ تعلیم کا انتظام ہو جانے سے ملک کی تعلیمی حالت بہتر ہوتی لیکن تعلیمی نمائشوں نے اس ترمیم سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہ ہونے دیا۔ اور نمائشوں کے لئے تعلیمی کام بھی نمائشی ہی سا رہا۔ ان نمائشوں میں مختلف مدرسوں کی تیار کی ہوئی اشیا، نمائش کی غرض سے رکھی جاتی ہیں۔ اور جس مدرسے کی اشیا، بہتر اور عمدہ ہوتی ہیں وہاں کے مدرس کو کامیاب اور قابل ترقی شمار کیا جاتا ہے اور جس جگہ کی چیزیں اچھی نہ ہوں اس جگہ کا مدرس نالایق اور نااہل سمجھا جاتا ہے حالانکہ مدرس کی تیار کی ہوئی چیزیں تو وہ بچے ہیں جو اس کے زیر تعلیم رہے ہیں۔ اس لئے اسکی اہلیت کی کسوٹی بھی یہی بچے ہیں نہ کہ وہ اشیاء جو مدرسہ میں بنتی ہیں۔ پھر اگر نمائش ضروری ہی ہے تو چیزوں کی بجائے بچوں کو نمائش میں رکھا جائے۔ کیونکہ یہ اندازہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اکثر مدرسے ماہرین فنون سے چیزیں تیار کرا کے نمائش گاہوں میں رکھتے ہیں اور خراج تحسین اور ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر کیسے مزے کی بات ہے کہ یہ طریقہ جانچ غیر لوگ نہیں بلکہ تعلیمی افسران ہی آزماتے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ جب تک تعلیم میں نمائش کا عنصر شامل رہے گا۔ تعلیمی کام میں بھی تصنع کو دخل رہے گا۔ اور جب تعلیمی افسران چیزیں دیکھنے کے بجائے مدرسے کے بچوں کی عام سیرت کا مطالعہ کرنے لگیں گے۔ اور استادوں کو یقین دلا دیں گے کہ اُن کا فرض چیزیں بنانا نہیں بلکہ انسان بنانا ہے تو شاید ہمارے مدرسوں کے دن بھی پھر جائیں

ایک استاد

وقت کا تعین

التماس یہ ہے کہ ہم مدرسین مدارس دیہاتی کو وقت پر رسالہ دستیاب نہیں ہوتا جس کی وجہ یہ ہے کہ ماہنامہ تعلیم جدید ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے اور مدرسین مدارس دیہاتی ہر ماہ کی یکم تاریخ کو بغرض وصولیابی تنخواہ دفتر انسپکٹری مدارس میں آتے ہیں۔ اگر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ۱۲ بجے دوپہر تک دفتر انسپکٹری مدارس میں ماہنامہ تعلیم جدید کی کاپیاں پہونچ جایا کریں تو مدرسین مدارس دیہاتی کو وقت پر تنخواہ کے ساتھ ہی ساتھ ماہنامہ تعلیم جدید کی بھی وصولیابی ہو جایا کریگی۔ اور مضامین بھیجنے والے مدرسین کیلئے کافی وقت نکل آئیگا۔ ہمیں امید ہے دفتر ادارت اس جانب توجہ فرماکر تعلیم جدید کی اشاعت کا انتظام ہر ماہ کی پہلی تاریخ کر دیگا۔ تاکہ دفتر انسپکٹری مدارس سے تعلیم جدید تنخواہ کے ساتھ وصول ہو جائے۔ — مدرس دیہاتی اسکول بھنڈپورہ

دنیا میں رفتار تعلیم

امریکہ میں آلۂ نشر کا تعلیمی استعمال

امریکہ میں ماہرین تعلیم نے ریڈیو سننے کے شوق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسکو ایک مخصوص آلۂ تعلیم بنالیا ہے۔ اکثر شہروں کے مدرسوں اور یونیورسٹیوں نے اپنی اپنی ذاتی نشر گاہیں تعمیر کی ہیں اور جماعتوں میں سننے کے آلے نصب کئے ہیں اس طرح بچے تعلیم گاہوں کے علاوہ اپنے اپنے گھروں میں اپنے سبق اور دوسرے تعلیمی مضامین سنتے رہتے ہیں۔ نشر گاہوں سے تفریحی۔ تجارتی اور خالص درسی موضوعات کی اشاعت کی جاتی ہے۔ امریکہ کے استاد کوشش کرتے ہیں کہ بچوں کے لئے ہر سبق مختلف پہلوؤں سے دلچسپ بنایا جائے تاکہ اس کے اثرات مستقل ہوں۔ ان بچوں کو جو کسی کھیل کسی سبق یا کسی دوسرے مفید تعلیمی مشغلہ سے گریز کرتے ہیں۔ ان ہی نشر گاہوں سے موسیقی، مذاخ اور ناچ وغیرہ کے ذریعہ سے دہی کھیل، سبق اور مشغلے نشر کئے جاتے جن کی طرف بچے کسی نہ کسی طرح اپنے مذاق کے خلاف بھی اکثر رجوع ہو جاتے ہیں۔ شجاعت و دلیری کی کہانیاں اور ایسے افسانے جن سے بچوں کی قوت تلاش نشوونما پاسکے۔ فطرت کے راز، سائنسی معلومات کے چٹکلے نشر کئے جاتے ہیں اور اب تک تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ تمام طریقے نہایت موثر و مفید ثابت ہوئے ہیں۔

سوالات کا نشر

سوالات کے ذریعہ سے کھیل کا پروگرام مرتب کیا جاتا ہے جس میں بچے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ایسے پروگرام سے جذبہ مقابلہ پیدا ہوتا ہے اور بچوں کے علاوہ اکثر اس جزو میں بڑے بوڑھے بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ "ہم کو کہانی کہنے دو"۔ "مزاح اور موسیقی" "اس کی کیا شکل ہے" وغیرہ کے عنوانات نشری فہرستوں پر مشتمل ہیں۔

آرٹ کی ترغیب

کلولینڈا (کلیولینڈ) ریڈیو نے آرٹ کے فن لطیف کی نمائش میں بڑی ترقی کی ہے۔ جماعتوں کے کمروں میں پردوں پر دل فریب رنگوں کے اسلائڈ دکھائے جاتے ہیں اور کلولینڈ آرٹ میوزیم کا ایک آرٹسٹ آرٹ کی نمائش کے مواقع پر تقریر کرتا ہے اور تصویروں کی تفصیلات کو

بچوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہے
غیر زبانوں کی تعلیم بھی اسی طریقہ سے دی جاتی ہے۔
انڈیانا میں تقریباً تینتالیس ہزار ابتدائی مدرسوں کے طلبا نے جہاں موسیقی سکھانے کے لئے کوئی استاد نہ تھا - بینڈ ناچ گانا ریڈیو کے ذریعہ سے سیکھا ہے، ایر آف راچسٹر اسکول نیو یارک نے پرائمری مدارس کی آٹھویں جماعت کے لئے ایسے ایسے پروگرام مرتب کئے ہیں جن سے بچوں نے اکثر سال بھر کا نصاب مکمل کر لیا ہے۔
بہرحال امریکہ نے براڈکاسٹ کا تعلیمی استعمال اس قدر عام کر دیا ہے کہ اب طلبا خود اپنا پروگرام بنا کر نشر کرتے رہتے ہیں -

نیوٹن کا ایک انگریزی مدرسہ

مسٹر اے ڈی برانچ مظہر ہیں کہ نیوٹن کے اداروں نے امسال کوشش کی کہ تعلیم کے سلسلہ میں "گھر" اور اسکول ایسوسیشن کے درمیان تعلقات کی تجدید ہو اور رشتہ قائم رہے۔ استاد اور والدین اپنی اپنی جگہ پر اپنے فرائض کا احساس کریں اور بچوں کے مستقبل کا خیال کرتے ہوئے گھر اور "مدرسہ" کے اتحاد و اتفاق کی بنیادیں ڈالیں نیو ایجوکیشن ایکٹ کے ماتحت چلنے والے ادارے تعلیم گاہوں کی عمارتیں نصاب میں بعض نئے موضوعات اور مشاغل کا اندراج والدین کی ذمہ داریاں اور اسی قسم کے تحریک پیدا کرنے والے موضوعات

پر عوام کے روبرو تقاریر کی گئیں جن کا نتیجہ اچھا رہا - اس امر پر سب سے زیادہ زور دیا گیا کہ کسی نہ کسی طرح گھر اور مدرسہ میں خوش آہنگی رہے اور ایسے وسائل اختیار کئے جائیں، جن سے مابین مدرسہ و گھر غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہنے پائے -

ذریعہ تعلیم میں یونیسکو کی تقریر کا خلاصہ

ہم آج اس لئے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ ان تمام وسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں جن سے ہم تمدنی اصلاحات کے ذریعہ عالم کو اتحاد و اتفاق کا پیغام دے سکیں ہم جن اقوام کی نمایندگی کر رہے ہیں ان سب نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں اس جنگ عظیم کے ہولناک نتائج کا ضرور تجربہ کیا ہے، ماضی کے تاریک واقعات ہم سب کے سامنے ہیں - ہم میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو مستقبل کی اصلاح کے لئے مساوی طور پر بے چین نہ ہو، ہم سب کی متفقہ خواہش ہے کہ انسانی تاریخ کے گزشتہ ابواب پر نظر ثانی کرنے کی بجائے ایک ایسے نئے باب کا آغاز کیا جائے جس میں مستقل امن و اماں لطف و محبت، اتحاد و اتفاق کے گہرے مسائل درج ہوں -
دنیا اب حدود ممالک کے تعین، آئین حکومت کے تقرر اور صنعت و حرفت کی گرم بازاری نہیں

چاہتی بلکہ وہ اقوام عالم کے درمیان ایسے رشتوں کی طلبگار ہے جن کے دامن مسرت دائمی کا راز حقیقت اور امید روشن سے مالامال ہوں۔

آپ ہی فرمائیے کہ ایسے زمانہ کا جس میں ہم زندگی کی راہیں طے کر رہے ہیں کیا حشر ہوگا۔ اگر ہم نے موجودہ تعلیم کے اجزاء میں ذہنی نشو ونما اور اخلاقی بلندی کے عناصر نظر انداز کر دئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم کو ذریعہ معاش بنانے کا طریقہ دنیا پر ایسا عذاب ہوگیا ہے جس سے فوری نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن کیا واقعی منافرت، خونریزی اور انسانیت کشی اب بھی اسباق درسی اور طریقہ تعلیم سے الگ نہ کی جائے گی۔ ضرور الگ کی جائیگی اور بالخصوص ایسے مواقع پر جب اقوام عالم میں جمہوریت پسندی کا جذبہ بڑھتا جا رہا اور وہ چاہتی ہیں کہ موافقت و موانست سے لبریز کوئی ایسا طرز تعلیم جاری کیا جائے جس کی روشنی میں جمہور عالم اپنی بقائے دوام کی منزلیں پائیں آج مطلق العنان حاکم اپنے چاروں طرف کیا دیکھ رہا ہے؟ ترقی یافتہ انسانوں کا اجتماع جو بلاشبہ رو بہ ترقی صنعت و حرفت، سائنس اور خلوص نیت پر مبنی کاروبار کے اجراء پر صرف کر رہا ہے۔ اور بآواز بلند اعلان کر رہا ہے کہ موجودہ یونیورسٹیوں کے طرز عمل میں فوری انقلاب ہو جانا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ اب تک ضروریات زندگی کی اہم راہوں میں ہم عوام الناس کی رہنمائی کے کبھی ممنون احسان نہیں ہوئے۔ لیکن آج محسوس ہوتا ہے کہ اس مجمع میں بے شمار ایسے مرد، خواتین اور بچے ہیں جن سے امید کی شعاعیں ساطع ہوتی ہیں۔ ان ہی میں آفات ارضی کے شکار شکستہ خاطر ایسے بھی ہیں جن کی دلیرانہ ہمتوں نے دنیا میں آزادی کی لہر دوڑا دی اور بنی نوع انسان کو مزید خطرات سے بچا لیا۔ اگر دنیا اسی قسم کی اور بھی اداکاران حیات کی خواہشمند ہے تو اسے اپنی تعلیم گاہوں کی اصلاح کرنا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ قومیت اور وطنیت محض تقریروں سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ تاریخ جغرافیہ۔ علم فرائض اور درس حریت کے بے اثر بیانیہ طریقوں نے جو ہماری تعلیم گاہوں میں استعمال کئے گئے اُن اثرات کو بھی معدوم کر دیا جن سے صحیح معنوں میں انفرادیت کی تکمیل ہو سکتی، اور انسانوں میں سماج کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعلیمی دنیا کے لئے ایسا مواد مہیا کیا جائے جس سے وہ بآسانی بیدار مغز شہری تیار کر سکے۔ ......

ٹرانسوال میں دو زبانوں کی تعلیم

حال میں ٹرانسوال کی صوبائی کونسل نے ڈول میڈیم آرڈیننس کا نفاذ کیا ہے جس میں اس امر پر زور دیا ہے کہ انگریزی اور

افریقی دونوں زبانوں کی تعلیم دی جائے اور ہر دو زبانوں کو صوبہ کے مدرسوں میں مساوی درجہ پر رکھا جائے۔

اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ صوبہ میں ان دو زبانوں کا معیار برقرار رہے، مقامی زبان میں تعلیم دینے والے ابتدائی مدرسے انگریزی زبان کی تعلیم بھی دیں چھٹی جماعت سے لیکر دسویں جماعت تک بھی اسی طریقہ پر عمل درآمد ہوگا۔ محکمہ تعلیم نے اس تجربہ کی آزمائش کے لئے پانچ سال مقرر کئے ہیں اور اعلان کیا ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء تک یہی طریقہ تعلیم جاری رہے گا۔ سنہ ۱۹۴۶ء سے چھٹی جماعت میں ایک اضافی مضمون انگریزی میں پڑھایا جائے گا۔ اور اس طرح ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ انگریزی اور افریقی زبانوں میں توازن قائم رہے۔

فرانس اور برطانیہ میں تعلیمی معاہدہ

فرانس اور برطانیہ کے تعلقات کو خوش گوار رکھنے کے لئے ان دو ممالک کے درمیان ایک تعلیمی معاہدہ ہوا جس کا اعلان برطانیہ کی تعلیمی وزارت نے کیا۔ اس سلسلہ میں دو اسکیمیں ہوں گی، ایک وہ جس سے برطانیہ اور فرانسیسی طلبا میں ربط پیدا ہوتا رہے، اور جس کے واسطے باہمی مراسلات ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ دوسرا وہ کہ جس سے تعطیلات میں ایک جگہ کے طلبہ دوسری جگہ جا سکیں تاکہ یکجائی کا موقع مل سکے اور اس طرح بچوں میں دوستی کی تحریک پیدا ہو، اس کے لئے باقاعدہ ادارہ جات قائم کئے گئے ہیں اور ایسے قوانین مرتب کئے جا رہے ہیں جن سے دونوں جگہ کے طلباء کے رجحانات کا ریکارڈ بن سکے تاکہ انگلستان ویلز اور فرانس کے ہم مزاج طلباء کے لئے نزدیکی کے مواقع فراہم ہو سکیں۔

روس میں بچوں کے کتب خانے

روس میں بچوں کا لیٹریچر تیار کرنے کے لئے خصوصی طور پر پبلشر اور مصنفین مقرر ہیں چنانچہ روس کے ہر گاؤں میں بچوں کے لئے ایک کتب خانہ ہے اور شہروں میں تو کئی کئی مطالعہ کے مرکز اور لائبریریاں قائم کی گئی ہیں۔ ماسکو میں ۵۰ کتاب گھر ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑے کتب خانہ میں تیس ہی ہزار کتابیں موجود ہیں۔ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں بیس ہزار بچوں نے ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا۔ کتب خانوں میں ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے طلبہ کے مذاق اور معیار کی مطابق کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ہر موضوع کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً جنگ اور سامان جنگ۔ حب وطن کہانیاں۔ ایجادات سوشل اسٹڈیز وغیرہ یہ امر قابل توجہ ہے کہ تمام تصنیفات میں خیال رکھا گیا ہے کہ شروع ہی سے بچوں میں قومی و ملکی محبت کا جذبہ پیدا ہوتا رہے لائبریرین بچوں کو کتابوں کے انتخاب میں مدد دیتا ہے اور مضمون کے بارے میں انہیں واقفیت بہم پہنچاتا ہے کہانیوں اور نظموں کی کتابوں سے قدرتی طور پر بچوں کو لگاؤ ہوتا ہے اس لئے اس قسم کی کتابیں ان لائبریریوں میں بکثرت موجود ہیں۔

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

استادوں کے مرکزی کتب خانہ کی رسمِ افتتاح

۱۴؍ ماہ اپریل ۱۹۴۶ء کو عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے استادوں کے مرکزی کتب خانہ کی رسمِ افتتاح ادا کی محکمۂ تعلیم ریاست رام پور کی تعلیمی سرگرمیوں کی یہ پہلی عملی منزل نہایت شان و شوکت سے طے ہوئی۔ کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی، بعد ازاں عالی مرتبت جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

محکمۂ تعلیم رام پور نے تعلیمی اصلاح اور ترقی کے لئے جو جدید تجاویز منظور کی ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم تجویز ایک استادوں کے کتب خانے کا قیام ہے جس میں ان کی ذہنی بیداری اور ان کی معلومات اور فنی قابلیت میں اضافہ کرنے کے لئے مناسب قسم کی تعلیمی کتابیں۔ (اردو انگریزی زبانوں میں) اور ملکی اور غیر ملکی رسالے مہیا کئے جائیں گے اور اس قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی جن سے فائدہ اٹھا کر وہ جمود اور بے تعلقی کی کیفیت دور ہو سکے جو چند سال کام کرکے اکثر استادوں پر طاری ہو جاتی ہے۔

اس جمود کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے بعض کا مجھے اندازہ ہے بہت سے استاد کشمکشِ حیات کے بوجھ سے اس طرح دبے ہوتے ہیں کہ وہ علمی اور تہذیبی مشاغل کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے۔ بعض استادوں کی علمی قابلیت اس قدر محدود ہوتی ہے کہ وہ کتابوں اور رسالوں سے براہِ راست مستفید نہیں ہو سکتے۔ بعض استادوں کو ایسی ہدایت اور مشورہ نصیب نہیں ہوتا کہ ان کے دل میں فنی ترقی کا شوق اور ولولہ پیدا ہو اور وہ جوش اور آمادگی کے ساتھ ان تمام وسائل اور ذرائع سے فائدہ اٹھائیں جو ان کو مل سکتے ہیں۔ بعض میں احساسِ فرض اور دیانتِ عمل کی کمی ہوتی ہے اور وہ محض روزانہ کام کی خانہ پری کو کافی سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن ان تمام اسباب کے علاوہ اور شاید ان سے زیادہ مؤثر رکھنے والا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے لئے اکثر وہ سہولتیں مہیا نہیں کی جاتیں جو ان کے دل و دماغ کو بیدار اور ان کے جوش اور شوق کو تازہ رکھ سکیں وہ خود اپنی مالی حالت کی وجہ سے کتابیں اور رسالے فراہم نہیں کر سکتے اور ان کے لئے کوئی ایسا مرکزی کتب خانہ موجود نہیں ہوتا جہاں

وہ اپنی علمی اور فنی پیاس بجھا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ استاد بھی جو مقابلۃً فرض شناس اور ترقی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ سازگار حالات کے نہ ملنے سے دوسروں کی طرح بے پرواہ ہو جاتے ہیں اور ان کے کام میں بھی وہ یکسانیت اور معمول پسندی راہ پا جاتی ہے جو اچھی تعلیم کی دشمن ہے۔

بہرحال ہمارے یہاں کے استادوں میں جو اسباب بھی کارفرما ہوں ان کا مجموعی اثر تعلیمی اصلاح و ترقی پر نہایت برا پڑتا ہے تعلیم ایک ایسا کام ہے جس میں غور و فکر، مشاہدہ اور تجربے، مطالعے اور تحقیق کی ضرورت ہے اس میں استاد کو جیتے جاگتے، بڑھتے پلتے بچوں سے سابقہ پڑتا ہے جو زندگی کے ایک ارتقائی دور میں سے گذر رہے ہوتے ہیں ان کی فطرت کا خاصہ نشو و نما، انقلاب اور تبدیلی ہے۔ مثلاً پانچ چھ برس کے بچوں اور بارہ تیرہ برس کے بچوں میں بہت سی باتیں اور عادتیں اور جبلی شوق اور میلانات مختلف ہوتے ہیں۔ ان سب کے لئے تعلیم اور ضبط و تادیب کے طریقے عمر اور نفسیات کے تقاضوں کے مطابق اختیار کرنے ضروری ہیں۔ دریں نہیں کہ مختلف عمر کے بچوں میں اختلافات ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی عمر کے بچوں میں بہت نمایاں انفرادی اختلافات ہوتے ہیں جن کو کوئی سمجھدار معلم نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے کوئی بات اس قدر خطرناک نہیں ہے جس قدر یہ کوشش کہ وہ ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے۔ لہٰذا اس کو لازم ہے کہ وہ بچوں کی ذہنی اور جذباتی خصوصیتوں کا، ان کی جسمانی نشو و نما کا، ان کے انفرادی اور اجتماعی رجحانات کا غور سے مطالعہ کرے اور اپنے مطالعے اور مشاہدے کو پرکھنے اور ان کی صحیح تعبیر کرنے کے لئے دوسرے معلموں اور ماہرین فن کے خیالات سے واقفیت حاصل کرے۔ اسی طرح جو علوم وہ بچوں کو پڑھاتا ہے ان میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ نئی تحقیقات کی وجہ سے پرانے نظریئے بدلتے رہتے ہیں۔ خصوصاً سماجی علوم اور سائنس میں نہایت تیزی کے ساتھ ترقی ہو رہی ہے اس لئے ہر بیدار مغز اور فرض شناس معلم کا کام ہے کہ وہ ان جدید تحریکوں سے حسب ضرورت واقفیت رکھے تاکہ ۱۹۶۶ء میں "بلیک ہول" کے واقعہ کو اس رنگ میں پیش نہ کرے جس طرح ۱۹۰۶ء میں پیش کیا جاتا تھا اور خوراک کا موضوع پڑھاتے وقت وٹامن سے ناواقف نہ ہو اور اونچی جماعتوں کو جغرافیہ اس طرح نہ پڑھائے گویا کہ صنعت و حرفت کی ترقی، وسائل آمد و رفت کی تیزی اور سائنس کی جدید ایجادات نے تمام ملکوں اور قوموں کے باہمی تعلقات میں ایک انقلاب عظیم پیدا نہیں کر دیا ہے۔

اگر اس انقلاب پذیر زمانے میں تعلیم کی یہ تصویر ٹھیک ہے اور زمانہ واقعی استادوں سے اس قسم کی توقع رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ جب تک ہمارے استاد مسلسل اپنے علم و عرفان میں، اپنی قابلیت اور فنی مہارت میں اپنی نفسیاتی سمجھداری میں اضافہ نہ کرتے رہیں گے وہ اپنا فرض ادا نہیں کر سکتے جن لوگوں کو معلمی کی باقاعدہ تربیت نہیں ملی ان کو تو کام شروع کرنا ہی مشکل ہے۔ ممکن ہے بعض "پیدائشی استاد" ایسے ہوں جن کی طبیعت اور خداداد صلاحیت خود ان کے لئے مشعل ہدایت بن جائے لیکن ایسے استاد بہت کم ہوتے ہیں، بہت بڑی اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں ابتدا ہی سے اس مشکل فن کو سکھانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کے واسطے علاوہ ٹریننگ کا انتظام کرنے کے اس قسم کے کتب خانے کا قیام لازم ہے۔ رہے وہ استاد جو تربیت حاصل کر چکے ہیں ان کے لئے بھی ایک یا دو سال میں پریشانی اور عجلت کے ساتھ حاصل کئے ہوئے سرمائے پر معلمی کا تمام زمانہ بسر کرنا صریحاً ناممکن ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سال بہ سال زیادہ فرسودہ خیال، معمول کے زیادہ عادی اور جوشِ عمل سے زیادہ بیگانہ ہوتے جاتے ہیں۔ ذہن میں تازگی اور دل میں حوصلہ قائم رکھنے کے لئے تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثے کی ضرورت ہے۔ دوسرے اچھے معلموں کے کارناموں کو جاننے کی ضرورت ہے، ایسی کتابوں اور مضامین کو پڑھنے کی ضرورت ہے جو گرد و پیش کے صبر آزما اور ہمت شکن ماحول میں بھی خدمت اور حقیقت پسندی کی شمع روشن رکھیں۔ اگر بہترین معلموں کو بھی یہ مواقع نصیب نہ ہوں اور وہ ایک مردہ، بے حس اور ذوقِ عمل سے خالی ماحول میں کچھ عرصہ تک رہیں تو اس کا سایہ ان کی زندگی پر چھا جاتا ہے۔ اور ان کی صلاحیتیں افسردہ ہو کر رہ جاتی ہیں، لہذا ایسے تربیت یافتہ استادوں کے لئے بھی اس قسم کے ایک اچھے کتاب خانے کا قیام جو ان کی دماغی فضا میں وسعت پیدا کرے، نہایت مفید ہے۔

لیکن کسی کتاب خانے کا محض قائم ہو جانا کافی نہیں کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک کتاب خانہ کتابوں کا گھر ہونے کے بجائے کتابوں کا مدفن بن جائے کتاب خانے میں جان اُن لوگوں سے پڑتی ہے جو اس کو استعمال کرتے ہیں اور اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر کوئی کتاب خانہ اپنے ممبروں کے لئے ایک زندہ تہذیبی مرکز بن جائے، اگر لوگ وہاں سے نہ صرف کتابیں اور رسالے حاصل کر کے پڑھیں بلکہ مشترک دلچسپی کے مباحث پر تبادلۂ خیال بھی کریں اور ایسے جلسوں اور تقریبوں کا انتظام کیا جائے جس میں سب لوگ ایک دوسرے کے ذاتی مطالعے اور تحقیق و تفتیش سے فائدہ اٹھا سکیں اور اس طرح ایک ذہنی بیداری اور رونق کی فضا پیدا ہو جائے تو وہ کتاب خانہ لوگوں کے ادبی ذوق اور علمی شوق پر

بہت گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔ شاید کسی عام کتب خانے میں یہ فضا پیدا کرنا مشکل ہے لیکن استادوں کے اس کتب خانے میں جہاں زیادہ تر ایک ہی قسم اور ایک ہی مذاق کے لوگ جمع ہوں گے، جن میں اشتراک مقاصد کی وجہ یک جہتی ہوگی اس قسم کی فضا پیدا کرنا چنداں دشوار نہیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ اس کتب خانے کو رام پور کے اساتذہ کی علمی اور ادبی زندگی کا ایک مرکز بنا یا جائے اور یہاں باقاعدہ طور پر مثلاً ایک یا دو ہفتے میں ایک بار استادوں کے جلسے ہوا کریں جن میں مختلف استادوں، تعلیمی افسروں اور بیرونی حضرات کو مدعو کیا جائے کہ وہ تعلیمی مباحث پر مضامین پڑھیں یا تقریریں کریں، یا مل جل کر اچھی اچھی کتابوں اور رسالوں کے مضامین کا مطالعہ کریں، یا مدرسوں کی اصلاح کی تجویزیں سوچیں یا خود اپنی مجلسی حالت کو بہتر بنانے کے لئے تدبیریں اختیار کریں اس ضمن میں انگریزی جاننے والے ان استادوں کی خدمت کرسکتے ہیں جو انگریزی نہیں پڑھ سکتے۔ اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ عمدہ انگریزی کتابوں یا رسالوں میں جو مفید اور قابل قدر باتیں پائیں ان کو باسلوب مناسب اردو زبان میں اپنے رفقائے کار کی ہدایت کے لئے پیش کریں یا بعض استاد خاص طور پر بعض رسالوں مثلاً "ٹائمز ایجوکیشنل سپلیمنٹ" (لندن) یا "نیو ایرا" (لندن) وغیرہ کا مطالعہ اپنے ذمے لے لیں اور ہر مہینے اُن کے خاص خاص مضامین اور مغربی دنیا کی تعلیمی خبروں کے اقتباسات وغیرہ ان استادوں کے جلسوں میں پیش کریں، اس قسم کی اور بہت سی تجاویز، باہمی مشورے اور تبادلۂ خیال کے ذریعے سوچی جا سکتی ہیں۔ لیکن آپ سب کا اشتراک عمل (باقاعدگی اور استقلال کے ساتھ) شرط ہے اس کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔

فی الحال یہ کتب خانہ ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں قائم کیا جا رہا ہے اس کا افتتاح عنقریب ہوجائے گا میں نے اس کے لئے ہندوستان اور انگلستان سے بہت سی عمدہ تعلیمی کتابیں اور رسالے منگائے ہیں جن کے مطالعے سے تعلیم کی ایک نئی دنیا آپ کے سامنے کھل جائے گی۔ ابھی اردو کی کتابوں کا ذخیرہ مقابلتہً محدود ہے لیکن اس کی تلافی ایک حد تک ٹریننگ اسکول کے اپنے کتب خانے سے ہوجائے گی۔ جس میں تعلیم پر اردو میں اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ لہذا میں توقع کرتا ہوں کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے تمام اساتذہ اس کتاب خانے سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ حال ہی میں جو اسکیم زیر ملازمت مدرسین کی ٹریننگ کے لئے تیار کی گئی ہے اس کا مرکز بھی یہی ٹریننگ اسکول اور مجوزہ کتب خانہ ہوگا۔

کتب خانے کی رکنیت کی کوئی فیس نہیں ہوگی اور باقی تمام قواعد بھی حتی الامکان سہل اور سادہ

رکھے جائیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ اساتذہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ فی الحال اس کا دائرہ عمل شہر رامپور تک محدود ہوگا لیکن دیہاتی مدارس کے اساتذہ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں جو شہر میں آکر کتابیں حاصل کریں۔ لیکن جب کام منظم ہو جائے گا تو محکمہ اس پر بھی غور کرے گا کہ دیہات کے مدرسین کے لئے کتابیں فراہم کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھئے کتب خانہ قائم کر دینا محکمے کا کام ہے اس میں جان ڈالنا محکمے کے بس میں نہیں، آپ کے اختیار میں ہے:

خواجہ غلام السیدین

نیو ایجوکیشن فیلوشپ کا اجرا

بہ تحریک مرزا سجاد علیخان ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول۔ مندرجہ ذیل حضرات نے نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی بنا ڈالی۔
شیخ الجامعہ عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اس مفید ادارہ کی رسم افتتاح ادا کرتے ہوئے حضار جلسہ کو مخاطب فرمایا اور انتہائی بلاغت سے ادارہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے اپنے یورپ کے سفر اور ولایت کی نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی عملی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور رامپور میں اس "برادری" کے قیام پر اظہار مسرت فرمایا۔
عالیجناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے ریاست میں ادارہ ہذا کی ضرورت کا تذکرہ فرماتے ہوئے بانیان ادارہ کو مفید مشورے دئے اور فرمایا "مجھے امید ہے کہ نیو ایجوکیشن کو عام مقبولیت دی جانے کی سعی اور اس کے ذریعہ تعلیمی مقاصد کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن جد و جہد کی جائیگی"۔
نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے بانیان کے اسمائے گرامی، سید سفارش حسین صاحب، شوکت حسین خاں صاحب، اسرار حسین صاحب، ظریف حسین صاحب، نبی شاہ صاحب، آل احمد صاحب سرور، پروفیسر خلیل اللہ صاحب، پروفیسر آل نیاز صاحب، مسٹر کرشنانی، مرزا سجاد علیخاں۔

تعلیمی میلہ

ریاست رام پور میں تعلیمی میلہ کی اسکیم چلائی جا رہی ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

اسکیم :۔ تعلیمی میلہ کے انعقاد کا خیال میں اپنے مدرسہ کے ماہانہ پروگرام فروری کے "ہمارا مدرسہ" میں مختصراً شائع کر چکا ہوں، اس اشاعت کے بعد میرے ذہن میں یہ آیا کہ اس علمی مظاہرہ کو ایسے وسیع اور اعلیٰ پیمانہ پر رچایا جائے جو ریاست کے دیہی طلباء کے لئے مفید اور سبق آموز ہو، نیز شہری طالب علم بھی اس سے نہ صرف لطف اندوز ہوں بلکہ عملاً مستفید ہوں، ظاہر ہے کہ قصبات کے رہنے والے غریب طالب علموں کو ایسے مواقع کہاں نصیب ہوتے ہیں جن سے وہ ایجادات حاضرہ اور زمانہ رواں کی سائنسی ترتیبوں کا بچشم خود مشاہدہ کر سکیں، اس حالت میں تعلیمی میلہ کا نفسیاتی نقطہ نظر سے اگر یہ مظاہرہ دلکش اور دیدہ زیب بنایا جا سکا تو لازمی ہے کہ اس میں شرکت کرنے والے معصوم بچے اپنی آخر عمر تک اس کے مفید اور کارآمد اثرات کو زائل نہ ہونے دیں گے یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس مظاہرہ کی چند سال بعد تجدید کر دی گئی تو وہ نسلوں تک دلوں میں زندگی بدوش تعلیمی مذاق کی لہر دوڑاتی رہے گی اور ان سدا بہار گل بداماں مظاہرات کی یاد کو بیداری کی نازک انگلیاں عرصہ تک پہلو نشیں رہ کر گدگدایا کریں گی۔

غرض اسی اُدھیڑ بُن میں میری چند راتیں گذری تھیں کہ میں نے تجویز مذکور کو مختصراً ضبط تحریر میں لاکر عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ایسے نباض فن اور مسائل عمیق کو ایک ہی نظر میں تاڑ لینے والے عالم متبحر کے سامنے تجویز کا آنا تھا کہ اس کی شرح ہوگئی اور حکم صادر ہوا کہ میں اس کے متعلق ایک مکمل اور مفصل اسکیم آپ سب حضرات کے مشورہ سے تیار کروں۔ آج آپ کو زحمت دی ہے کہ میری دستگیری فرما کر اس مفید خیال کو عملی میدان میں لانے کے لئے میرے معین ہوجئے۔

میلہ کی وضاحت میری تجویز ہے کہ نومبر کے کسی ہفتہ میں جس وقت کا آپ تعین فرمائیں ریاست رام پور میں ایسے مقام پر جہاں آپ سب متفق الرائے ہوں تعلیمی میلہ کے نام سے ایک ایسا تفصیلی اور شاندار مظاہرہ کیا جائے جو نہ صرف ریاست کے مدرسین اور ابتدائی مدرسوں کے طلباء کے لئے مفید ہو بلکہ ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں جس کی کارروائی تمامی ملک کے لئے ایک مستقل لائحہ عمل بن سکے۔

گو سلطی اور ربکلے پڑ چکے ہیں لیکن ہم ہندوستانیوں کی طبیعت سے ابھی تفریحات کے نقوش قطعی طور پر زائل نہیں ہوئے اور بالخصوص ہم اساتذہ کے ذہنوں سے جنکی رفتار گفتار نشست و برخاست غرض ہر ادا میں "بچپن" موجود ہے اور آج نہیں بلکہ یورپ کے مشہور استاد، ہرفن "پستالوزی" کے بقول "میں تو اپنی زندگی میں ہمیشہ سے کچھ بچہ ہی سا رہا" - ایسی معصوم اور البڑ زندگی رکھنے والے بچوں کے علاوہ اساتذہ کے لئے "میلہ" کی جاذبیت اور اس کے نام کا دل فریب پس منظر یقیناً دیرپا اور مدتوں تک تازگی کے ساتھ قائم رہنے والا ہے اس لئے میں نے فلسفیانہ نام کے بجائے اس مظاہرہ کا نام میلہ رکھا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ سب حضرات بچوں اور بچوں کے رہنماؤں کے احساسات کی رَو اور میلان طبع کا جائزہ لیتے ہوئے "میلہ" کی لفظ کا احترام فرمائیں گے۔ آپ متفکر ہیں مبادا اس لفظ کی مزید در و بست میں آپ کا ذہن گہرائیوں کی جانب منعطف ہو جائے اور مفید لمحوں میں سے اچھا خاصہ وقت لفظی تنازعات میں ختم ہو جائے اس لئے میں اصل موضوع کا خاکہ آپ کی خدمت میں حاضر کرتا ہوں اس پر غور فرما کر کسی ایک ایسے بامعنی نتیجہ کو وجود میں لے آئیے جو عمال حکومت - حکام ریاست، اور عمائدین شہر کے لئے قابل قبول ہو۔

مالیات

دولت ہی مشکلکشائے عالم ہے - اسی پر بہتر سے بہتر کاموں کے انجام دیئے جانے کا دار و مدار ہے، ہیں صرف اس کشمکش و پیچ میں ہوں کہ کہیں اس ناگزیر وادی میں قدم رکھتے ہی، حاجت روائی کے دربند نہ ہو جائیں اور راہِ چارہ مسدود نہ ہو جائے، مگر میں عالم امکان کی کسی شئے کو مائل بہ شر سمجھنا بڑا جرم سمجھتا ہوں میں قنوطی نہیں بلکہ پختہ اور سچا استحسان پسند اور رجائیت پسند ہوں، ہیں کائنات کے ہر ذرہ میں مسرت کی دمک دیکھتا ہوں، مجھکو دنیا نے بہت پیسا ہے ہیں پیسا گیا مگر پسنے کے بعد بھی میرا رنگ طبیعت نکھرتا ہی گیا - میں مسائل ہست و بود میں خوش طبعی کو ذریعہ حیات جانتا ہوں -

مسئلہ زیر غور کوئی مخصوص اہمیت کا حامل نہیں اور پھر ایسی حالت میں جب آپ جیسے مہندس اور ماہرینِ فن اقتصادیات مسئلہ مذکور میں حلال مشکلات ہوں - مجھکو یقین کامل ہے کہ فرمانروائے ریاست عالیہ رامپور کی علم نوازی ہمارے آڑے آئے گی بشرطیکہ ہم کوئی مفید اور ٹھوس تجویز اپنے مشیر تعلیمات کے مشورہ آخر کے بعد باقاعدہ اپنے محکمہ کے ذریعہ سے اعلیٰحضرت بندگان حضور پرنور کی خدمت میں پیش کر سکے، ہم میں سے ہر ایک کو اس اعتقاد پر پختہ رہنا چاہئے کہ مالی نقصان سے اگر انسانی زندگی کے کسی اہم جزو کا نفع ہوتا ہے تو ایسے مالی نقصان پر حکومت عالیہ زیادہ توجہ نہ کرےگی۔

اور عمائدین شہر اس کو شہریت کا فلسفۂ رواں تصور فرمائیں گے۔

اب میں ان امور کی ابتدا کرتا ہوں جو اصل موضوع ہیں۔

صحیح تعلیم

آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کے تین شعبے ہیں اور ان سہ شعبہ جات پر یوں عمل درآمد ہونا چاہئے کہ وہ علیحدہ علیحدہ بھی مکمل ہوتے رہیں اور متحدہ طور پر بھی ان کی تکمیل ہوتی رہے۔ ان میں سے کسی عنصر کا نظرانداز کیا جانا اصول تعلیم کے منافی ہے۔ ایسے عناصر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) حفظان صحت

(۲) ذہنی نشو ونما۔

(۳) اخلاقی بلندی

تعلیمی میلہ میں بھی ان ہی تین شعبوں کا مظاہرہ کیا جائے گا۔

شعبۂ حفظان صحت

صوبہ جات ہند کے ایسے ذمہ دار حضرات سے رجوع کیا جائے گا جو ابتدائی مدارس کے بچوں کی حفظان صحت کی دیکھ بھال کرنے والے ہیں۔ اس کے لئے کم از کم دس ایسے اسٹال نصب کئے جائیں گے جو حفظان صحت کے طریقوں کا مظاہرہ کریں گے اس شعبہ کی ایک کانفرنس کی جائے گی جس میں مختلف صوبہ جات کے نمائندے جن کا تعلق مدارس کے بچوں سے ہے مدعو کئے جائیں گے۔ اس کانفرنس کے لئے چند تجاویز مقرر کی جائیں گی جن کو کانفرنس مذکور میں پیش کر کے کوشش کی جائے گی کہ ایسے موثر و مفید طریقے دریافت کئے جائیں جن سے ہم اپنے ملک کے ان معصوم بچوں کو تندرست رکھ سکیں جو مستقبل قریب میں ملک و قوم کے ذہنی اور جسمانی سپاہی بننے والے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک سب کمیٹی بنائی جائے گی جو صاحب ڈائرکٹر بہادر حفظان رامپور کی نگرانی میں اسٹال و کانفرنس کے کام انجام دیگی، یہی کمیٹی کانفرنس کے لئے تجاویز بھی مقرر کریگی

ذہنی نشو ونما

اس ذیل میں ایک تفصیلی پروگرام کی ضرورت ہے جس کا خاکہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱) صنعت و حرفت کے اسٹال ...... جو بچوں کے مشاغل کا نمونہ ہوں۔

(۲) طریقۂ تعلیم کا عملی مظاہرہ۔

چند مشہور اور اچھے انگریزی و ہندوستانی ادارے مدعو کئے جائیں گے جن کے اساتذہ مقرر کردہ اوقات پر میلہ کے عام پنڈال میں — DEMONSTR-ATION. نمونہ کے اسباق دیں گے اور اپنے

تجربہ کے مشاہدہ کا دوسرے اساتذہ کو موقع دیں گے اس میں رام پور کے ابتدائی مدارس کے اساتذہ بھی حصہ لیں گے۔

(۴) بچوں کے آزاد مشغلوں کی نمائش۔ یہ شعبہ دو حصوں پر منقسم ہوگا۔

(الف) کھلے میدانوں میں مشغلہ۔
اس ذیل میں چند ایسے مدرسے مدعو کئے جائیں گے جو اپنے بچوں کے ذریعہ دل چسپ اور نئے مشغلوں کی کی نمائش کریں۔

(ب) اسٹیج پر مشغلہ۔
موسیقی۔ چند چھوٹے چھوٹے تعلیمی ڈرامے منعقد کئے جائیں گے۔ اس میں ابتدائی مدرسے کے بچوں کے لئے مقابلہ کا انعام رکھا جائے گا۔ جو انگریزی ابتدائی مدرسوں کے لئے بھی ہوگا۔
متذکرۂ بالا ہر دو عنوانات میں رام پور کے مدارس بھی مدعو کئے جائیں گے جن کے لئے پہلے نئے نئے مشغلوں کے اجرا کی جانب استادوں کو رجوع کیا جائے گا ممکن ہے اس سلسلہ میں ہمارے استاد کسی ایجاد کی طرف بھی مائل ہوسکیں۔

آل انڈیا پرائمری ایجوکیشن کانفرنس

ہندوستان کا ماحول پیش نظر رکھتے ہوئے ذہنی ارتقا کے طریقے یکجا کرنے کا ایک اور اچھا اور موثر طریقہ یہ ہوگا کہ ایک آل انڈیا پرائمری ایجوکیشن کانفرنس طلب کی جائے اور مقرر کردہ تجاویز کو ماہرین فن کی رائے حاصل کرنے کے لئے اس کانفرنس میں پیش کیا جائے۔ یہ تجاویز بمشورۂ عالی مرتبت صاحب شیر تعلیمات بہادر مرتب ہوں۔

ناظمان تعلیم کی کانفرنس

اگر متذکرہ بالا کانفرنس کسی باعث بہ لحاظ وقت وزعیت صحیح نہ سمجھی جائے تو تمام صوبہ جات اور ریاستوں کے ناظمان تعلیم کی ایک کانفرنس کی جائے جس کی صدارت کے لئے مسٹر سارجنٹ سے استدعا کی جائے اور ملک کی ابتدائی تعلیمی ضروریات اور اس کے کامیاب بنانے پر بحث و مباحثہ کرلیا جائے، ممکن ہے ہندوستان کے مختلف مقامی حالات کے ماتحت ملک کی تعلیمی ترقیوں کے واسطے کوئی موثر اور مفید طریقہ دستیاب ہوسکے، اس کانفرنس کی افتتاح کے لئے میڈم مانٹسوری سے استدعا کی جائے تو بہتر ہے۔

دیگر عام مظاہرات

ریاست رام پور کے ابتدائی مدرسوں کے طلبا کا ایک کلب قائم کیا جائے اور اس کلب کی جانب سے ایک ریکریشن ہال یا گراؤنڈ بنائی جاسکے۔

جس میں Merry-go-round اور اسی قسم کے اچھے اور نئے کھیل نصب کئے جائیں جو بچوں کے لئے سبب تفریح ہوں - اور باعث درس بھی۔

تعلیمی اخبارات ہندوستان کے تمام انگریزی، اور ہندی تعلیمی اخبارات کے نمائندوں کی کانفرنس طلب کی جائے جس میں اُن کی گذشتہ کارگذاریوں اور تعلیمی خدمتوں کو دہرایا جائے اور ایسے لائحہ عمل پر بحث کی جائے جو آیندہ ملک کی تعلیمی رفتار میں معین ہو سکے، اس کانفرنس سے دو فائدے ہونگے اول تعلیمی میلہ کا ایک وسیع پروپگنڈا۔ دوسرے قومی و ملکی تعلیم کے نصب العین کا تقرر اور اس کا نشر۔

کتب فروشوں کے اسٹال ملک کے زیادہ سے زیادہ کتب فروش اس مفید میلہ کی جانب رجوع کئے جائیں گے اور ان کو ترغیب دی جائے گی کہ وہ اپنی اپنی دکانیں اس میلہ میں نصب کرکے اپنی تصانیف اور تالیفات کی نمائش کریں۔

مصنفین کا مقابلہ اس قسم کے ایک مقابلہ کا اعلان کیا جائے کہ جو شخص اردو اور ہندی میں پرائمری مدارس کے لئے مقررکردہ موضوع پر اچھی سیریز (سلسلہ) تصنیف کریگا۔ اس کو اعلان کردہ انعام دیا جائے گا۔ اس مقابلہ کے فوائد ماہرین تعلیم پر پوشیدہ نہیں، اس لئے اس کی تفصیلات پر فی الحال بحث ملتوی رکھتا ہوں ۔ظاہر ہے کہ انعام دئے جانے کے بعد وہ تصانیف جو مقابلہ میں اول دوم و سویم قرار دی جائیں گی محکمۂ تعلیم ریاست رام پور کی ملکیت ہونگی۔

مالیات کی فراہمی آمدنی کا ذکر کرنے سے پہلے آپ کی خدمت میں خرچ کی مد پیش کرتا ہوں ۔آپ فرمائیں گے کہ یہ الٹی ریٹ ہے بجنے کی کیونکر؟ تو جواب میں عرض کردوں کہ تعلیمی میلہ اگر دل کی لگن ہے تو بہر صورت پایۂ تکمیل کو پہنچکر رہے گا۔

خرچ
(۱) کام کی ابتدا کے لئے .... عا؍
(۲) پروپگنڈا .... ا؎۔۔۔۔۔۔

اس جزو کے دو حصے ہوں گے۔ پہلا وہ جو تعلیمی میلہ کے اختتام تک جاری رہے گا دوسرا جو میلہ کے ختم ہوجانے کے بعد شروع ہوگا پہلے جزو کے لئے صرف عا؍ روپیہ

اور دوسرے کے لئے جو ضروری ہے الــ ھا ر ۔ دوسرے جزو کے سلسلہ میں میلہ کی مکمل کارروائی جس میں ماہرین فن کی تقاریر وغیرہ شامل ہوں گی ایک کتاب کی صورت میں شائع کی جائے گی۔

(۳) استقبال مہمانان .... ھا ر

(۴) اسٹال و پنڈال کی تعمیر .... الــ ۔

(۵) ری کریشن اسٹال .... ھا ر

(۶) مقابلہ کے انعامات .... الــ

میزان عــہ ھا ر ۔

آمدنی

یہ نمائش آٹھ روز تک جاری رہیگی۔ داخلہ مفت ہوگا۔

(۱) ری کریشن اسٹال .... داخلہ ایک آنہ

اگر کل داخلہ آٹھ ہزار ہو تو آمدنی ھا ر روپیہ ہوسکتی ہے۔

(۲) اسٹالوں کا کرایہ .... عــہ فی اسٹال

اگر کل پچاس اسٹال ہوے تو آمدنی ..... ھا ر روپیہ ہوسکتی ہے۔

(۳) پرائمری ایجوکیشن کانفرنس میں ممبری کی فیس (عہ ر) اور وزیٹرس کے لئے ۸ ر

(۴) تصانیف کی فروختگی۔

(۵) کارروائی میلہ جو کتاب کی صورت میں شائع ہوگی

عمائدین شہر سے اشتراک کی اپیل

یہ امر آپ سے پوشیدہ نہیں کہ ہر وہ کام جو عوام کی دلچسپی کا باعث ہوگا ضرور کامیاب ہوگا۔ تعلیمی میلہ میں عمائدین شہر سے اشتراک کی اپیل کرنا چاہیے، اگر ان کی دلچسپیاں بھی شامل ہو جائیں گی۔ تو ہمارا مقصد ایک بڑی حد تک کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے گا۔ اس کے لئے میں تجویز کروں گا کہ ایک مجلس استقبالیہ کی تشکیل کی جائے جس کی صدارت کے واسطے صاحبان اثر کے مشورہ سے شہر میں کوئی ایسی فرد تلاش کی جائے جس کے دل میں ہمارے معصوم بچوں کا درد ہو، ان کی تعلیم کا جذبہ ہو۔ اگر یہ مجلس استقبالیہ بن سکی تو مندرجہ ذیل قاعدہ پر عمل درآمد ہوگا۔

مجلس استقبالیہ

(۱) فیس ممبری خصوصی .... عــہ

(۲) فیس ممبری عمومی .... عہ ر

اس طرح کوشش کی جانا چاہئے کہ کم از کم ایک سو باشندگان ریاست رام پور مجلس استقبالیہ کے ممبر بن سکیں۔

سب کمیٹیاں

اسی مجلس استقبالیہ سے مندرجہ ذیل سب کمیٹیاں میلہ کے انتظام کے لئے بنائی جائیگی۔

(۱) سب کمیٹی استقبال مہانان۔

(۲) سب کمیٹی پنڈال واسٹال۔

(۳) سب کمیٹی برائے کانفرنس۔

مجوزہ کانفرنس

(۱) حفظان صحت۔ (۲) تعلیمی اخبار نویسیوں کی کانفرنس۔

(۳) آل انڈیا پرائمری ایجوکیشن کانفرنس (۴) کانفرنس ناظمان تعلیمات

(۵) آل انڈیا پرائمری ایجوکیشن فیلوشپ کی نشستیں۔

فیلوشپ

اسی سلسلہ میں جب کہ ہم تعلیم کے انتہائی اہم مسائل پر غور کرنے کے لئے تیار رہیں اور اس وقت ہمارے پیش نظر زندگی کا کوئی دوسرا شعبہ نہیں بجز تعلیم کے تو مجکو اجازت دیجئے کہ فیلوشپ کی اسکیم کا خاکہ بھی آج ہی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں، میری خواہش ہے کہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے نام سے ایک ادارہ شروع کیا جائے جس کے ذریعہ سے تمامی ریاست میں ایک تعلیمی برادری قائم ہو جائے اور ادارہ مذکور کا مقصد حقیقی یہ ہو کہ وہ ملک کی ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے میں سعی بلیغ کرتا رہے اس اسکیم کی تفصیلات بصورت بائی لاز عنقریب آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ فی الحال اس کو وجود میں لانے پر اپنی رائے کا اظہار فرما دیجئے اور ضروری قطعین منتخب فرما دیجئے تاکہ اسکیم کو آگے بڑھانے میں کوئی وقت واقع نہ ہو۔

آپ حضرات تعلیمی میلہ کی تجویزات پر غور فرما چکے ہیں، مہربانی ہوگی اگر آپ اپنی اپنی رائے کا اظہار فرما کر کسی ایک مرکزی فیصلہ تک پہونچنے میں میرے معین ہوں۔

آپکا خادم مرزا سجاد علیخاں بی اے۔ بی ٹی (علیگ)

تعلیمی میلہ کے انتظامات کے لئے مجلس نتظامیہ کی تشکیل

۱۵ ماہ اپریل ۱۹۴۶ء کو تعلیمی میلہ کی تجویز پر غور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل حضرات کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں مجلس انتظامیہ کی تشکیل ہوئی اور دو اہم تجاویز پیش ہوکر بہ اتفاق آرا منظور ہوئیں۔

ٹنگ میں شریک ہونے والے حضرات

مسز کے کیوان۔ ہڈ مسٹرس خورشید گرلس ہائی اسکول، مس بی۔ال۔ اسکاٹ اسٹنٹ ڈائرکٹر مانٹسوری اسکول، مسٹر اسرار حسین انسپکٹر مدارس رام پور، مسٹر سفارش حسین ہیڈ ماسٹر حامدیہ اسکول، مسٹر شوکت حسین خاں ہیڈ ماسٹر ٹریننگ اسکول، مسٹر خلیل اللہ خاں ہیڈ ماسٹر باقر اسکول، مسٹر نبی شاہ ہیڈ ماسٹر مرتضٰی اسکول، محسن میاں صاحب پیشکار محکمۂ تعلیمات، مرزا سجاد علیخاں ہیڈ ماسٹر ماڈل اسکول و مدیر تعلیم جدید

تجاویز

(۱) تجویز ہوا کہ تعلیمی میلہ اور پرائمری ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے شہر کے عمائدین کی ایک مجلس استقبالیہ مقرر کی جائے اور رؤسائے شہر میں سے کسی ایک کو بمشورہ عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر بہادر و عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر صدر مقرر کیا جائے۔

(۲) سید سفارش حسین صاحب۔ اسرار حسین صاحب، مسز کے کیوان ممبر اور مرزا سجاد علی خاں سکریٹری مقرر ہوں۔

دورِ حاضر کا انسان

مصورِ فطرت حضرتِ اقبال کی کھینچی ہوئی انسانی تصویر دیکھیئے اور اس میں اپنے تعلیمی رنگوں کی ایسی آمیزش کیجیے کہ تصویر لطیف نظرانسانوں کی آنکھوں میں کھپ جائے، اور سماج اس کو اپنی محفلِ عزم کی زینت قرار دے لے۔

عشق ناپید خردمی گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

باقر اسکول کا تیسرا سالانہ جلسہ تقسیم انعامات اور اس کے مقاصد

تعلیم اور تعلم کے گوناگوں اصولوں میں تعلّم بالعمل کی فوقیت و افادیت محتاج بیان نہیں، یہ جدید طریقۂ عمل کے ذریعہ زندگی اور تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کر کے دونوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے معلم اور متعلم دونوں عمل کے سہارے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی جد و جہد کرتے ہیں۔ حصولِ علم کا یہ ذریعہ جتنا مفید و مؤثر، ٹھوس اور پائدار ہے اتنا ہی دلچسپ و دلکش بھی ہے۔ اسی لئے تعلیم جدید کے اصولوں پر چلنے والے ادارے اپنی اپنی تعلیمی و تدریسی فضا میں فعالیت و عملیت کی روح پھونک کر اس کو جیتا جاگتا زندہ اور آزاد بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں

چنانچہ شروع ہی سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ہماری درس گاہ محض کتابی ہو کر جسد بے روح اور پیکر بے جان بن کر نہ رہ جائے۔ بلکہ اس میں زندگی کی دلچسپی و دلکشی تگ و دو۔ ہماہمی چہل پہل شور و شغف جوش و خروش سب کچھ ہو اور ان ہی ہنگامہ زائیوں کی تہ میں ہماری تعلیمی و تدریسی مساعی شرمندۂ معنی ہوتی رہیں، ان مقاصد کے حصول کے لئے ہم مختلف النوع طریقوں سے کام لیتے رہے ہیں۔ لیکن ان تمام اصولوں کی تہ میں عمل ہی کارفرما رہا ہے۔ جو کچھ ہم نے کیا ہے یا کر رہے ہیں اس میں مضطرب و پائندہ زندگی کی تڑپ حرکت سعئ پیہم روحِ رواں کے طور پر جاری و ساری ہیں۔ ہمارا کوئی قدم زندگی و عمل کی جولانیوں سے علیحدہ نہیں رہا۔ ہم نے کبھی بے جان اور اٹل ٹائم ٹیبل کی پابندی کو ضروری ولازمی نہیں سمجھا۔ بلکہ ہمیشہ ندرت۔ اپج جدت کا سہارا لئے آگے بڑھتے رہے ہیں۔ ہماری درس گاہ میں سورج ہر روز نئی شعلہ سامانیوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ اور اپنی پرکیف ہنگامہ آرائیوں کے شور و شغف کے ہمراہ غروب ہو کر "عیشِ فردا" کے لئے کچھ نئی رنگینیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہماری تعلیمی فضا میں بے حسی و جمود راہ نہیں پاتے معلم و متعلم کے پرخلوص اتحادِ عمل کے باعث ہماری یہ چھوٹی سی درس گاہ اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں "تن من" سے مصروف ہے۔

مختلف قسم کے مجلسی مشاغل و تقاریب اسکول کی روزانہ زندگی میں جاری ہیں۔ جو اپنی گوناگون اور نوع بنوع

خصوصیات کی بنا پر نہایت دلچسپ و دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ طلباء میں علمی و ادبی ذوق شوق کی توسیع و ترقی کا آلہ کار رہیں۔ ان ہی مشاغل کے زیر اثر طلباء و طالبات میں امتیاز و افتخار۔ تقابل و توازن کے جذبات بیدار ہو کر ان کو حرکت و عمل کے لئے مضطرب و بے حس کرتے رہتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ہمارے اداروں کو مردہ دلی و بے حسی سے محفوظ رکھتی ہے۔

انہی تقاریب کے ضمن میں ہمارا سالانہ جلسہ بھی ہے جس کی آمد اسکول کے ہر شعبہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دیتی ہے۔ طلباء و طالبات کے قلوب میں جذبات عمل تموج خیز ہو کر ان کو اپنی اپنی کارکردگی۔ قابلیت صلاحیت اور سلیقہ مندی دکھانے کے لئے بیتاب کر دیتے ہیں۔ موازنہ و مقابلہ کی پرجوش آرزو، اسکول کے ہر گوشہ و کونہ میں جاری و ساری دکھائی دیتی ہے۔ کہیں چند طلباء اپنی اجتماعی کارکردگی دکھانے میں معروف نظر آتے ہیں تو کہیں کوئی منچلا طالب علم اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے میں مشغول ہے۔ ہر درجہ کے طلباء و طالبات اپنے اپنے درجہ کی زینت و آرائش میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کا درجہ زیب و زینت میں دوسرے درجوں سے بڑھ جائے، ان اجتماعی و انفرادی مساعی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول کا گوشہ گوشہ نظر فریب، تصاویر، دیدہ زیب ڈزائن، دلکش کارٹون، عمدہ و رنگین نقشوں اور چارٹ سے سج سجا کر "جنت نگاہ" بن جاتا ہے۔

ماڈل اور پروجیکٹ کی تیاری میں ہر ایک طالب علم و طالبہ اپنی اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کرنے میں اور بعض مرتبہ تو طلبہ و طالبات کی اس "کام جوئی" کا جوش و خروش اتنا بڑھ جاتا ہے کہ مجوزہ پروگرام میں ترمیم و اضافہ کئے بغیر ان سرگرم کارکنوں کی دلداری مشکل ہو جاتی ہے، ہفتہ عشرہ کی اس سرگرمئ عمل کے بعد اسکول اس قابل بن جاتا ہے کہ ہر کہ و مہ سے داد تحسین لے سکے اور اپنی مساعی و طریق کار کو عوام کے سامنے پیش کر کے اپنی عملیت و فعالیت کو نمایاں کر سکے۔

جیسا کہ سطور بالا کے مطالعہ سے مترشح ہوگا کہ ہمارا یہ سالانہ جلسہ جو ہر سال منعقد ہوتا رہتا ہے محض نام و نمود پر مبنی نہیں بلکہ ہماری جملہ تعلیمی و تدریسی مساعی کا جزو اور سال بھر کے مجلسی مشاغل کا لب لباب ہے، اس کی تیاری کے سلسلہ میں طلباء و طالبات عملاً مختلف قسم کی تعلیمی فوائد سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں اور اسی فعالی طریق کار کی بدولت تعلیمی نقوش کا ثبات اس قدر گہرا اور دائمی ہوتا ہے جو کسی دوسرے طریقہ تعلیم سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ہم اپنے امسال کے جلسہ کی دو چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی تعلیمی اہمیت و

افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان میں پہلی چیز ذرائع خبر رسانی کے ماڈل ہیں، ان ماڈل کی تیاری میں بچوں نے کافی تلاش و جستجو سے کام لیا اور بڑی محنت و کاوش کے بعد ان کو ترتیب دیکر دیدہ زیب و نظر فریب بنانے میں اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑا، اس عظیم الشان تہذیب و تمدن کے ارتقائی دور سے لیکر اس ابتدائی دور جبکہ "دست مشاطہ نہ تھا محروم زلف" دوراں تک کے ذرائع خبر رسانی کے ماڈل تیار کئے" دوسری چیز ماڈل ولیج کی تیاری تھی اس سلسلہ میں مواضعات کے عام نقائص کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بچوں نے ایک ایسا ماڈل تیار کیا جو جدید ترین ضروریات کے مطابق حفظانِ صحت کے اصولوں پر پورا اترتا ہو بستی کی ترتیب و تنظیم، مکانات کی تعمیر اور ان کا جائے وقوع - مسجد - مندر - بازار - دکانیں - کنویں تالاب - مرگھٹ - قبرستان کے مقامات ماڈل کے طور پر بنائے، اس ماڈل کی تیاری میں جہاں بچوں نے عام ہندوستانی گاؤں کی بستی کے نقائص معلوم کئے وہاں یہ بھی سمجھا کہ وہ کس طرح دور کئے جا سکتے ہیں - اور آج کل کی ضروریات کے مطابق مواضعات کی تشکیل کس طرح ہو سکتی ہے -

یہ اور اسی قبیل کی متعدد و مفید چیزیں بچوں نے سالانہ جلسہ کی تیاری میں عملاً سیکھیں، جن کے نقوش اُن کے حافظے سے مٹائے نہیں مٹ سکتے، اب ہم جلسہ کی مکمل روئداد ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ قارئین کو اس کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے -

۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء سنیچر کے روز باقر اسکول کا سالانہ جلسہ ۵ بجے شام محترمہ بیگم صاحبہ صاحبزادہ مسعود الظفر خاں صاحب بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا شہر کے عمائدین اور رؤسا کارخانہ جات کے افسران محکمہ تعلیمات کے افسران اور اساتذہ صاحبان و طلبا - و طالبات کے سرپرست صاحبان و خواتین نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی شرکا کے سلسلہ میں عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ ملیہ دہلی، عالی مرتبت جناب محمد ارشاد اللہ خاں صاحب بہادر ہوم منسٹر و وزیر تعلیمات، عالی مرتبت جناب خواجہ غلام السیدین صاحب بہادر مشیر تعلیمات و محترمہ بیگم صاحبہ عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر و عالی مرتبت مرزا ناصر الدین مسعود صاحب بہادر چیف سکریٹری و جناب صاحبزادہ مسعود الظفر خاں صاحب بہادر وغیرہم قابل ذکر ہیں

صدر محترمہ و جملہ مہمانانِ گرامی نے اسکول کی نمائش اسکول کے تیار کردہ ماڈل اسکول کی زینت و آرائش اور دیگر مشاغل کو بنظر غائر ملاحظہ فرمایا - ماڈل ولیج اور اس کی تفصیلات، ماڈل شوگر انڈسٹریز اور دوسری مصنوعات، ابتدائی بچوں کی ڈرل - میوزیم باغبانی، چڑیا گھر ریڈ کراس سوسائٹی - پانی پت کی پہلی

چرخ کاتا ۔ بجلی ماڈل ۔ سائنس کے کام کے نمونے ۔ کشیدہ کاری و امور خانہ داری کے نمونے ۔ مشاغل طالبات ۔ ذرائع خبر رسانی کے ماڈل تعلیمی تعلیمی و تفریحی کیمپ کمیٹی (تحصیل بلاسپور) کے منصوبے کی روئداد ۔ چارٹس نقشہ جات کمیٹی کا جغرافیہ سماجی جائزہ کمیٹی ۔ اسکول کا نیچر اسٹڈی پلاٹ آرٹ و کرافٹ کے نمونے اور ان کے عملی مظاہرے ۔ پاٹری ۔ بچوں کی لائبریری ۔ ان کے اپنے تالیفات اسکول کی میگزین بچوں کا بینک و دوکان ۔ چھوٹے بچوں کا مٹی کا کام ، گم شدہ اشیا کا صندوق ۔ درجات کی دیواروں پر بنائی ہوئی دیدہ زیب رنگین تصاویر ، برآمدے کے دلکش و دلفریب کارٹون مدارج حیات کے نمونے ، ہولی ۔ دیوالی ۔ قوالی کے سین اور مختلف تعلیمی کارناموں کی تفصیل کو پسند فرماکر اظہار مسرت و امتنان فرمایا ۔

تقسیم انعامات کے بعد محترمہ صدر صاحبہ نے اپنی صدارتی تقریر میں اسکول کے کام اور اس کے مشاغل کی حیرت انگیز پر اظہار مسرت فرمایا آپ کی پُر مغز تقریر کا اقتباس حسب ذیل ہے :

" مجھے باقر اسکول کے بچوں کو اور ان کے تعلیمی کاموں کو دیکھکر بہت خوشی ہوئی اور میری تمنا یہ ہے کہ رامپور کے ہر محلہ میں ایسے ہی اسکول نظر آئیں تاکہ ہمارے شہر کا ہر بچہ ان سے فائدہ حاصل کر سکے "

موصوفہ نے عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر کی رہنمائی میں ریاست میں جو تعلیمی ترقیات ہوئی ہیں اس کا اعتراف فرماتے ہوئے فرمایا " ہم کو سیدین صاحب کے مشیر تعلیمات ہونے پر جتنا بھی فخر ہو وہ کم ہے یہاں کے اسکولوں میں آپ کے آنے سے جان پڑ گئی ہے وہ زمانہ بھی انشاءاللہ دور نہیں جب کہ رامپور تعلیم کا ایک نمونہ بن جائے گا "

صدر صاحبہ کے بعد عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر نے صدر محترمہ و دیگر حاضرین کا شکریہ ادا فرمایا جنہوں نے اپنا قیمتی وقت جلسہ کی شرکت میں صرف کیا ۔ ممدوح نے اسکول کے جملہ کاموں پر مفصل تنقید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ۔

" مجھے خوشی ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں باقر اسکول نمونہ کا اسکول بن گیا ہے ۔ میں یہاں کے طریق کار سے پوری طرح مطمئن ہوں "

واحد حسن خان اسسٹنٹ ماسٹر باقر اسکول

ورناکیولر مڈل اسکول (شہر) کی کارکردگی

اردو مڈل اسکول رام پور میں مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۴۶ء کو زیر صدارت ہیڈ ماسٹر صاحب مڈل اسکول شہر۔ بر بنائے تبادلہ سید حید رحسن صاحب جلسہ وداعی منعقد کیا گیا جس میں بشمول اساتذہ پرائمری اسکول سارے مڈل درجات کے طالب علم و اساتذہ شریک تھے۔ اکثر نے وداعی نظمیں پڑھیں۔ لطیفے اور کہاوتیں کہیں۔

اس موقعہ کو غنیمت پا کر کچھ انعامات اسکاؤٹنگ اور جونیر ریڈ کراس جو ڈائرکٹر آف پبلک ہیلتھ رامپور سے عطا ہوا تھا۔ سید حیدر حسن صاحب کے وداعی ہاتھوں سے تقسیم کرا گیا۔

امسال اُردو مڈل اسکول رام پور کے جونیر ریڈ کراس گروپ کا کام ریاست کے جملہ تعلیمی اداروں سے بہتر اور کامیاب رہا ہے۔

۱۹ اپریل ۱۹۴۶ء بروز جمعہ اسکول کے سوشل سدھار گروپ نے موضع احمد نگر میں رات گزاری جس میں مواضعات کے لوگوں کو میجک لالٹین کے ذریعہ متعدی امراض کے پھیلنے اور اُن کے انسداد کی تدابیر بچوں نے بتائیں۔ علاوہ اس کام کے تفریحی نظمیں پہیلیاں اور لطیفے بھی کہے گئے۔ گاؤں والوں نے بچوں سے وعدہ لیا کہ وہ پھر گاؤں میں آئیں اور لوگوں کو اسی قسم کی مفید باتیں بتلائیں۔

محکمہ حفظان صحت اور طلبا

جناب جمیل الرحمٰن خاں صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ رام پور کی سعی پیہم

اسکولوں کے کمزور اور غیر مستطیع بچوں کی بحالی صحت کے لئے دودھ کا انتظام

پبلک ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کے ماتحت اسکول ہیلتھ سروس قایم ہے جو ریاست کے تمام اُن طالب علموں کا ڈاکٹری معائنہ کرتی ہے، جو شہر میں واقع ہیں خواہ وہ پرائمری ہوں خواہ سکنڈری، اسکول ہیلتھ آفیسر تمام طلباء کی جانچ اور ان کی دیکھ بھال و علاج کرنے کے ذمہ دار ہیں، بیمار بچوں کی سہولت کے واسطے ایک سنٹرل اسکول ڈسپنسری قائم ہے جہاں پر خاص طریقے

سے اسکول کے بچوں کا علاج کیا جاتا ہے ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۱۰۱۸، ۴۳-۱۹۴۲ء میں ۱۵۳۹ - اور ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۲۹۷۰ - اور ۴۵-۱۹۴۴ء میں ۳۸۴۴ طلبا، کا ڈاکٹری معائنہ کیا گیا۔ ہر سال جس قدر بچے اس قسم کے پائے گئے۔ جو پوری طرح پر تندرست نہ تھے اُن کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی گئی اور مناسب علاج کیا گیا جب تک کہ وہ مکمل صحت یاب نہ ہوگئے۔

ڈاکٹری معائنہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بہت سے بچوں کی تندرستی ناقص تغذیہ کی بنا پر خراب ہے ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۸۰ طلباء کو گورنمنٹ کی جانب سے مقویات اور مفت دودھ دیا گیا۔ اور ۴۵-۱۹۴۴ء میں ۱۹۰ طلباء کو جن بچوں کو دودھ اور مقوی ادویہ دی گئیں اُن کی حالت جلد روبہ ترقی ہوئی اور وہ بہت جلد چاق چوبند نظر آنے لگے اسکول کے عام بچوں کا جن کو دودھ نہیں دیا گیا تھا وزن اوسطاً ۴ء۵ پونڈ فی بچہ بڑھا اور ان بچوں کا جن کی تندرستی خراب تھی۔ دودھ دینے پر ان کا وزن ۶ء۷ پونڈ بڑھا۔ اسی طرح بچوں کی اونچائی کی اوسط جن کو دودھ نہیں ملا ۱ء۸، انچ تھی۔ اور جن کو دودھ دیا گیا تھا اُن کی اونچائی ۳ء۴، انچ تھی اس اسکیم پر گورنمنٹ قریب چھ ہزار روپیہ سالانہ صرف کر رہی تھی۔ چونکہ نتیجہ حاطرخواہ مرتب ہوا۔ اور اسکول کے بچوں کی صحت روبہ ترقی رہی۔ اس لئے تجویز کیا گیا۔ کہ سالِ رواں میں اس کے لئے ۲۰۰ طلبا منتخب کئے جائیں اور فوراً یہ مفید اسکیم شروع کر دی جائے۔ اس کارِ خیر میں ہوپل اور گون برادرس نے بھی شرکت کی، برٹش انڈیا کے قاعدا اور ایجوکیشنل کوڈ کے تحت اسکول کے بچوں سے ایک آنہ فی کس میڈیکل فیس اُن کے مفت طبی امداد کے سلسلہ میں وصول کی جاتی ہے لیکن چونکہ اعلیٰحضرت بندگان حضور پرنور دام اقبالہم وملکہم کی رعایا پروری کے باعث سنٹرل ہسپتال ڈسپنسری کے کل مصارف گورنمنٹ برداشت کرتی ہے۔ اس لئے اس فیس کی کل رقم بمشورہ عالی صاحب مشیر بہادر تعلیمات و باتفاق فائنینس ڈپارٹمنٹ اس اسکیم کے واسطے مخصوص کر دی گئی —

سال رواں میں اسکیم پر تقریباً سات ہزار روپیہ صرف ہوگا جس میں سے میونسپل بورڈ کی گرانٹ عاید ہوگی گون برادرس فیکٹریز کی ایک ہزار اور پانچ سو روپیہ ریڈ کراس سوسائٹی کی گرانٹ بقیہ روپیہ میڈیکل ڈپارٹمنٹ اور ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ سے مہیا ہوگا۔ چونکہ اس اسکیم کی اب کافی اہمیت ہوگئی ہے بذیل ذیل جونیر ریڈکراس سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے۔

توسیع شدہ جونیر ریڈکراس سب کمیٹی

(۱) جونیر ریڈکراس سکشن۔ (۱)- عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر بہادر چیرمین۔

۲۔ عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب بہادر	ممبر
۳۔ آل احمد صاحب سرور۔	"
۴۔ مسز زیدی۔	"
۵۔ مسز ارشاد اللہ خاں۔	"
۶۔ مسز مسعود۔	"
۷۔ سید اسرار حسین صاحب۔	جوائنٹ سکریٹری
۸۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب۔	"
۹۔ ڈاکٹر جمیل الرحمن	آنریری سکریٹری

(۲) نمائندگان پبلک ویلفیر سوسائٹی۔

۱۔ ایذیڈنٹ ڈائرکٹر گوون برادرس لمیٹڈ رام پور اسٹیٹ۔
۲۔ عالی مرتبت فنشر صاحب بہادر انچارج پبلک ہیلتھ۔
۳۔ عالی مرتبت صاحب چیف میڈیکل آفیسر بہادر۔
۴۔ جنرل منیجر صاحب رضا ٹیکسٹائل لمیٹڈ۔

(۳) نمائندہ میونسپل بورڈ۔

۱۔ بابو رادھے بہاری لال صاحب ممبر میونسپل بورڈ۔

چونکہ اس اسکیم پر عملدرآمد اس ہفتے سے ہوگا۔ اس لئے ہر اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کا فرض ہے کہ وہ اپنے ان تمام بچوں کو جن کی صحت دوسروں کے مقابلہ میں گری ہوئی ہے۔ فوراً اسکول ہیلتھ آفیسر صاحب سے معائنہ کرائیں۔ تاکہ موخرالذکر اُن کے تعاون سے اُن ۲۰۰ طلباء کا انتخاب کرسکیں جن کو سال رواں میں دودھ اور مقوی غذا دیا جانا ضروری ہے۔

[illegible] اسکولوں کے بچوں کو اپنے اسکول کونسلر کی نگہبانی میں باری باری سے اسکول ملک سنٹر واقع [illegible] اسکول گھیر نجو خاں پر ۱۱½ اور ۱۲½ بجے کے درمیان جاکر دودھ پینا ہوگا۔ اور سکنڈری اسکول [illegible] کے واسطے ایک سائیکل سوار بوتلوں میں دودھ ہر اسکول پہنچکر تقسیم کرے گا ہر بچہ کو قریب دس [illegible] دودھ دیا جائے گا۔ صبح کا اسکول ہوجانے پر اوقات میں مناسب ترمیم ہوجائے گی۔

اُن تمام افسران سے جن کو بچوں کی تعلیم و صحت تندرستی سے دل چسپی ہے نیز اُن والدین اور سرپرستوں سے جن کو اپنے بچوں کی صحت و سلامتی کا خاص خیال ہے۔ استدعا کی جاتی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ملک سنٹرل اور سنٹرل اسکول ڈسپنسری کا معائنہ کرکے اپنے مفید مشوروں سے مستفیض فرمائیں تاکہ کارکنان کی ہمت افزائی ہو۔ اور کام میں مزید اصلاح ہوسکے۔

ڈائرکٹر آف پبلک ہیلتھ و آنریری سکرٹیری
جونیر ریڈ کراس سوسائٹی

تعلیم بالغان کی رفتار

آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت ہمیشہ بنی نوع انسان کے پیش نظر رہی ہے اور رہیگی۔ موجودہ دور کی علمی ترقی سب پر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے جس کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے ہندوستان کی طرح کے وہ ممالک بہت ہی بدنصیب ہیں جن کی کثیر آبادی بالکل جاہل ہے۔ ان خیالات کے پیش نظر اعلیحضرت بندگان حضور پرنور دام اقبالہم وملکہم نے از راہ علم پروری اور رعایا نوازی باشندگان ریاست کی علمی ترقی کے لئے تعلیم کے ایک مکمل پروگرام کی منظوری فرمائی ہے جس کی رو سے ایک طرف بچوں کی لازمی تعلیم کو رعایا کی ترقی کا زینہ قرار دیا ہے۔ اور دوسری طرف ناخواندہ بالغان کے لئے تعلیمی مراکز قائم کئے گئے ہیں تاکہ ریاست کا کوئی باشندہ جاہل نہ رہے۔ اور بالغوں میں حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی علمی ترقی کا احساس بھی پیدا ہوسکے اور اس طرح ایک بنیادی خامی کا سدباب ہوجائے۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں ایک جلسہ بمقام مرتضی اسکول بتاریخ ۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء بوقت ۸ بجے شب منعقد ہوا جس میں بالغان کو اسناد و انعام تقسیم کئے گئے۔ اکثر و بیشتر حضرات نے شرکت فرماکر اپنی علم دوستی کا خوشگوار فریضہ ادا فرمایا۔

محکمۂ تعلیم ریاست اپمپو آرگن



تعلیم ... کی ... جدید

تعلیم جدید

مُدیر
مرزا استجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی (علیگ)

چندہ سالانہ ... پانچ روپے
فی پرچہ ... آٹھ آنے

جلد (۱) | رامپور ۔ جولائی و اگست ۱۹۴۶ء | نمبر (۵)

فہرست مضامین

اُستادوں سے خطاب

مُعلّمی کا پیشہ

(ایک تقریر جو حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے ۱۴ مارچ ۱۹۴۲ عیسوی کو نشر کی گئی)

میں عثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر تعلیم کے متعلق توسیعی خطبات دینے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ چونکہ آپ میں سے اکثر حضرات ان تقریروں کے بارے محفوظ رہے ہیں اس لیے ریڈیو والوں نے ازراہ ستم ظریفی مجھ سے فرمائش کی ہے میں اپنی تقریر سے آپ کی سمع خراشی کروں۔ مُروّت انکار کے راستے میں حائل ہوئی اور اس کا خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑ رہا ہے! خیر!!

اس چند منٹ کی تقریر میں میرے لیے کسی مستقل تعلیمی موضوع پر اظہارِ خیال کرنا تو ممکن نہیں۔ اس لیے میں اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ایک ضروری لیکن محروم توجہ موضوع یعنی معلّمی کے پیشے کے متعلق چند باتیں کرنا چاہتا ہوں، پہلے ان تمام حضرات اور خواتین سے جن کا کام تعلیم کا انتظام کرنا ہے اور جنھیں تعلیم کے نتائج سے دلچسپی ہے، اُس کے بعد اُستادوں سے جو تعلیم کا کام انجام دیتے ہیں اور جن کے سپرد یہ فرض ہے کہ ناطق حیوانوں کی ہر آنے والی نسل کو انسان بنائیں۔

آپ نے عام طور پر یہ شکایت سُنی ہوگی کہ ہمارے مُلک میں جو تعلیم نافذ ہے وہ بہت ناقص اور نامکمل ہے اور اس شکایت کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے کسی خاص واقفیت یا تجربے کی بھی شرط نہیں ہے! مجھے یہ شکایت تسلیم ہے۔ ہمارے مُلک میں ستر پچھتر فی صدی بچّے تو اسکول کی طرف رُخ ہی نہیں کر پاتے اور جو وہاں جاتے بھی ہیں اُن میں سے نصف کے قریب سال ہی بھر میں اسکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کیونکہ مدرسے کا ماحول اس قدر ناسازگار اور تعلیم ایسی غیر دلکش ہوتی ہے کہ اُن کے لیے وہاں قیام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے چھ کروڑ بچوں میں سے مشکل سے چالیس لاکھ ایسے ہیں جو مدرسوں میں چار سال کی مدّت بسر کرتے ہیں اور اُن کو بھی اس قلیل عرصے میں صرف خواندگی سکھائی جا سکتی ہے، کسی قسم کی دیرپا سماجی اور اخلاقی تربیت نہیں دی جا سکتی۔ ایک اور ستم یہ ہے کہ جس رفتار سے ہمارے ہاں

خواندگی بڑھ رہی ہے اُس سے زیادہ رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے یعنی سال بہ سال اس ہندوستان جنت نشان میں جو ہزاروں برس سے تہذیب کا سرچشمہ رہا ہے اور جس کو ہمیشہ اپنی علمی روایتوں پر ناز رہا ہے ناخواندوں کی مجموعی تعداد بجائے گھٹنے کے بڑھتی چلی جاتی ہے! لہذا اگر اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کوئی انقلابی اقدام نہ کیا گیا تو ملک کے مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے۔ اور خدا پر حفاظت کی ذمہ داری ڈالنے کو بھی ایک خوش عقیدہ محاورہ ہی سمجھیے۔ کیونکہ تاریخی شاہدہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خدا کسی قوم کی حفاظت کے لیے اپنے اختیارات خصوصی استعمال نہیں کرتا بلکہ قوانین فطرت اپنی کارفرمائی دکھاتے ہیں اور قوموں کو اپنے اعمال کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے۔

لیکن آپ نے کبھی یہ غور بھی کیا کہ آخر ہمارے ملک میں تعلیم اس قدر کم اور گھٹیا معیار کی کیوں ہے؟ اس کا اصل جواب جس کو نہ آپ پسند کریں گے نہ میں، یہ ہے کہ دراصل ہم لوگوں میں تعلیم کی صحیح قدر و قیمت کا احساس ہی نہیں۔ ورنہ یہ ستم کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہم تمام سماجی کارکنوں کے مقابلے میں سب سے کم معاوضہ ان استادوں کو دیتے ہیں جن کا کام ہے ہمارے بچوں کے دل و دماغ کی تربیت، ان کی سیرت کی تشکیل، ان کے ذوق کی اصلاح اور ان کے تصورِ خیر و شر کا تعین! اور ہم اپنے مدرسوں کے لئے بسا اوقات ایسی عمارتیں تجویز کرتے ہیں جن میں خوشحال اور سمجھ دار لوگ اپنے جانوروں کو رکھنا بھی پسند نہ کریں گے! کیا آپ نے کبھی اس عجیب صورتِ حال پر غور کیا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بہترین اعزاز اور انعام کے مستحق وہ لوگ نہیں سمجھے جاتے جو خاموشی اور دیانت داری کے ساتھ ہماری خدمت کرتے ہیں بلکہ دولت، عزت، اثر اور رسوخ کی فراوانی ان لوگوں پر کی جاتی ہے جو خوں ریز جنگوں کا اہتمام کرتے ہیں یا کاروبار میں سٹہ بازی اور اس قسم کی دوسری حرکتوں کے ذریعہ لوگوں کا روپیہ بٹورتے ہیں یا اشتہار بازی کے ذریعہ بیوقوفوں کی بیوقوفی اور خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض سمجھ دار لوگوں کو چھوڑ کر اکثر کی نظر میں سکندر، چنگیز خاں اور نپولین کی اہمیت سقراط اور نیوٹن اور اقبال سے کہیں زیادہ ہے اور خواہ لوگ ان کی شان میں لفظی قصیدے پڑھیں لیکن جہاں تک واقعی اعتراف اور دنیاوی وجاہت کا تعلق ہے خدمت کرنے والوں کا ملک گیری اور لوٹ مار کرنے والوں کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں! یہ دراصل ان تمام انسانی اقدار کی توہین ہے جن پر ایک معقول معاشرے اور ایک متوازن شخصیت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور جب تک ہم اس بات کی کامیاب کوشش نہ کریں گے کہ سماج میں استادوں اور معلموں کو وہ درجہ حاصل ہو جس کے وہ مستحق ہیں، ہماری تعلیم بے فیض اور بے جان رہے گی۔ آپ میں سے کتنے حضرات کو اندازہ ہے کہ ہندوستان کے پرائمری اسکولوں کے بیشتر مدرس جو تنخواہیں پاتے ہیں وہ آٹھ نو روپیہ ماہوار سے لے کر پچیس روپے

ماہوار تک پہنچتی ہیں اور اس قابل تعریف فیاضی کے بعد ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ بے ضرر اور بے زبان طبقہ جس کو معاشی کش مکش سے ایک دم کو فرصت نہیں ملتی، تعلیم و تربیت کے مشکل اور مقدس فرض کو بخوبی انجام دے۔ اب جب حکومت آپ اس قدر معاوضہ مقرر کرے گی تو ظاہر ہے کہ اس پیشے میں زیادہ تر وہ لوگ آئیں گے جو زندگی کے کسی دوسرے شعبے میں جگہ نہ پاسکیں گے یا اگر بعض مخلص، جوشیلے، بے نفس اور خدمت پسند لوگ اپنی طبیعت کے رجحان سے مجبور ہو کر اس طرف آئیں گے تو انھیں بھی یہ ہمت شکن حالات پسپا کر دیں گے۔ آپ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ جو لوگ اس حالت میں زندگی بسر کریں گے۔ وہ اطمینان خاطر کے ساتھ اپنے فرائض کو ادا کر سکیں گے یا اپنی قابلیت اور کارکردگی میں اضافہ کر سکیں گے یا اپنے گرد و پیش کی معاشرتی تحریکوں میں سمجھداری کے ساتھ وہ دلچسپی لیں گے جو تعلیم کے قالب میں روح ڈالتی ہے۔

لہذا ملک کی حکومتوں سے میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ معلموں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس زمانے میں جنگ کی داروگیر نے قیمتوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اس لئے پچیس یا تیس روپے ماہوار کی تنخواہ کو استادوں کے لئے معراج نہ سمجھیں کیونکہ یہ تیس روپے جنگ سے پہلے کے دس بارہ روپوں سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔ اس بارے میں مالی تنگی کا عذر بھی میرے دل کو نہیں لگتا، کیونکہ اس مالی تنگی کے باوجود دنیا کی قوموں نے جنگ کی تباہ کاری کے لئے کروڑوں پونڈ روزانہ کا خرچ اٹھایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو کام انسان تخریب کی خاطر کر سکتا ہے اگر اسے تعمیر کی خاطر کرے تو اسے حماقت کا ثبوت نہیں دانشمندی کی دلیل سمجھنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی سوسائٹی سے یعنی آپ سب سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ استادوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنائے اور ان کی وہی قدر و احترام کرے جو ایک زمانے میں ہندوستان میں استادوں کی ہوتی تھی۔ اگر کسی شخص میں وہ ذاتی صفات اور قابلیت نہیں کہ وہ ایک اچھا معلم بن سکے تو اس کو یقیناً تعلیم کے میدان سے ہٹا دینا چاہیئے لیکن جس شخص کو حکومت اور سوسائٹی پچیس تیس سال تک مسلسل بچوں کی ہدایت اور نگرانی کے فرض پر مامور کرتی ہے۔ اور انسان سازی کا مہتم بالشان کام اس کے سپرد کرتی ہے اس کے ساتھ بے اعتنائی یا تحقیر کا سلوک کرنا محض اس کے ساتھ بے انصافی نہیں بلکہ خود اپنے مستقبل کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔

یہاں تک تو میں استادوں کے حقوق کی حمایت میں حکومت اور والدین اور سوسائٹی سے مخاطب تھا لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں اپنے ہم پیشہ رفقا یعنی استادوں سے بھی کروں۔ میں نے اپنی عملی زندگی کا بیشتر حصہ استادوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی نگرانی اور ان کے کام کی تنظیم میں صرف کیا ہے، اس لیے مجھے قدرتاً ان کے ساتھ بہت گہری ہمدردی اور دلچسپی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ سلجھ میں انھیں

وہ بلند مقام اور عزت حاصل ہو جس کے وہ واقعاً مستحق ہیں۔ لیکن اگر مجھے ایک صحیح مگر پامال حقیقت کو دہرانے کی اجازت ہو تو میں انھیں یہ بات یاد دلاؤں کہ حقوق اور حیثیت کسی جماعت یا حکومت سے بطور عطیہ کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ انھیں تو اپنی کارکردگی اور اپنے فرائض کی ادائگی کے ذریعہ جیتا جاتا ہے۔ اس لیئے اگر استاد سماج میں شایان شان مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں باوجود اپنی مشکلات اور محرومیوں کے باوجود سوسائٹی کی بے اعتنائی اور سرد مہری کے اپنے کام کو اس طرح انجام دینا ہوگا کہ رائے عامہ کو زبردستی اسکا اعتراف کرنا پڑے۔ شاید دنیا میں کوئی پیشہ اس قدر مشکل اور اس قدر متنوع صلاحیتوں کا طالب گار نہیں جس قدر معلمی کا پیشہ ہے۔ اس کے لیے مختلف نصابی مضامین میں مہارت درکار ہے اور بچوں کی انفرادی فطرت کو جاننا ضروری ہے اس میں اس سادگی و پرکاری" کی ضرورت ہے جو مدوّن اور مرتب علوم کو بچوں کے سامنے عملی مشاغل اور کھیل کے روپ میں پیش کر سکے۔ اس میں تہذیب اور تمدن اور قومی زندگی کے ان تمام مفید اور مضر اثرات اور تحریکوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو بچوں کی فطرت کو بناتی یا بگاڑتی ہیں اور ان تمام اثرات کے جوکھنے میں تعلیم کو بحیثیت ایک مرکزی اثر کے نصب کرنے کی ضرورت۔ یہ تمام باتیں ہر استاد کے لیئے خواہ وہ گاؤں کے کسی ابتدائی مدرسے کا استاد ہو، نہایت مشکل لیکن ناگزیر مسائل پیش کرتی ہیں جن کو حل کیے بغیر وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اپنی عملی قابلیت کے حدود کے اندر اندر ان تمام مسائل کو سمجھنا اور ان کی روشنی میں تعلیم کا کام چلانا اس کا فرض ہے۔ اس کے لیئے کوئی غلط فہمی اسقدر مہلک نہیں ہو سکتی جس قدر یہ خیال کہ اسکا کام محض چند مضامین یا چند کتابیں پڑھا دینا ہے اور بس خواہ طالب علم کی شخصیت اور اس کی موجودہ اور آئندہ زندگی کی آبیاری کریں یا نہ کریں۔ کس خوبی سے شاعر مشرق نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر　　جس کی صنعت ہے روح انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لیئے　　کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
پیش خورشید بر مکش دیوار　　خواہی از صحن خانہ نورانی

لہٰذا اگر آپ اپنے طلبہ کی زندگی کے صحن خانہ کو نورانی چاہتے ہیں تو خورشید حقیقت کے سامنے دیوار کھینچنے سے پرہیز کیجیئے اور موجودہ تمدن کی جو بنیادی حقیقتیں ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کیجیئے۔ میرے پاس اس قدر وقت نہیں کہ میں اس تمدن کا تجزیہ کرکے یہ بتا سکوں کہ اس میں کون کون سے عناصر کارفرما ہیں۔ لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی نے انسان کی زندگی اور معاشرے کو متحرک اور انقلاب پذیر بنا دیا ہے، اور

ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ "سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز" اس لئے تعلیم کو بھی اس طرح منظم کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ طلبہ کو ذہنی بیداری کی دولت سے بہرہ ور کرے اور انھیں اس قابل بنائے کہ وہ بجائے عادتوں اور سکھی سکھائی باتوں کے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے، بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر اپنا راستہ خود تلاش کر سکیں۔ آج کل کی زندگی میں ہر ہر قدم پر انسان کو دوراہے ملتے ہیں اور جو شخص عقل کی روشنی میں اپنا راستہ نہیں بنا سکتا وہ اسی بھول بھلیاں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوسری بات جو استادوں کو یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں مختلف قسم کے لوگ بستے ہیں جو مختلف ملکوں اور قوموں میں اور نسلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف جماعتیں اور مختلف خیال اور عقائد کے لوگ ہیں۔ لیکن دور حاضر کے تقاضوں نے تمام انسانوں کی بہبود کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ اگر کوئی جماعت یا قوم یا ملک دوسروں کے حقوق پر تصرف کر کے یا ان کو تمدنی اور مادی دولت سے محروم کر کے اپنا سرمایۂ عیش فراہم کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے اس نامبارک کوشش میں انجام کار ناکامی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر انسانی وحدت اور یک جہتی کے احساس کو طلبہ کے دل و دماغ میں مستحکم کرنا ان کا سب سے اہم فرض ہے۔ اختلافات کی جانب سے رواداری برتنا، مختلف خیالات کو ٹھنڈے دل سے سننا اور ان پر غیر جانب داری کے ساتھ غور کرنا۔ جو جماعتیں اور طبقے کسی لحاظ سے محروم یا مظلوم ہیں ان کی دستگیری کرنا اور ان کے جائز حقوق کے لئے جد وجہد کرنا، سختی کے ساتھ خود پر احتساب نفس کرنا اور فیاضی کے ساتھ مخالف کے حق کو تسلیم کرنا، یہ تمام صفات محض اخلاقی نقطۂ نظر ہی سے قابل تعریف نہیں بلکہ آج کل کی دنیا میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے ہر شریف آدمی میں ان کا موجود ہونا ضروری ہے۔ معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ ان صفات کی تربیت کرے اور انہیں زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کرے۔ اس تنگ نظری اور تعصب کے زمانے میں فیاضی، رواداری اور وسیع القلبی کی یہ تلقین بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ معلم کا کام ہی پہاڑ کی چڑھائی ہے! تمدنی زندگی کی بہت سی تحریکیں اور تحریصیں اور خود انسان کی فطرت کے آسان پسند رجحانات اس کو نیچے کی طرف کھینچنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ مستقبل کی طرف نظر جمائے انسان کو اخلاقی شعور کی بلندی پر پہنچانے کے لئے جد وجہد کرتی رہے۔ اس طرح ایک بہتر انسان اور بہتر سماج کی خالق بن جائے یہی استادوں کی سب سے بڑی آزمائش ہے ان کی سب سے بلند منزل اور یہی ان کی اعلیٰ ترین سعادت ہے۔ اگر ایسا کرنے میں انھیں ہوا کی رفتار کے خلاف چلنا پڑے تو انھیں جرأت کے ساتھ اس ذمہ داری کو اٹھانا چاہیئے۔ مختلف قسم کی نامبارک تحریکیں اور اثرات نظر فریب بھیس بدل بدل کر ان کے سامنے آئیں گے اور کبھی حب وطن کے نام پر، کبھی دانشمندی کا حوالہ

دے کر، کبھی انفرادی اغراض کے واسطے سے، کبھی جماعتی اور نسلی تعصبات کو اپیل کرکے اس بات کی کوشش کریں گے کہ تعلیم شرافت، انسانیت رواداری اور دردمندی کے بجائے ان جھوٹے معبودوں کی پرستش کرنے لگیں۔ لیکن اس وقت استادوں کا فرض ہوگا کہ وہ کوہ وقاری کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم رہیں اور جب وقت جنون اور خود غرضی کے طوفان عقل اور اخلاق کے کر، دچراغوں کو بجھانے کی کوشش کریں اس وقت وہ اپنے دل ودماغ کی تمام قوتوں کی بازی لگاکر ان کی حفاظت کریں اور اس بات کو ثابت کر دکھائیں کہ اہل غرض کی پھونکوں سے انسانی فضل و کرامت کے چراغ نہیں بجھائے جا سکتے۔

خواجہ غلام السیدین

"خواجہ غلام السیدین" بین الاقوامی ماہر تعلیم کی حیثیت سے آسٹریلیا جارہے ہیں

نیو فیلوشپ کے بین الاقوامی ہیڈ کوارٹر لندن اور نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے آسٹریلوی حلقے نے خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات حکومت رامپور کو مدعو کیا ہے کہ موصوف آئندہ ماہ میں اُن ماہرین تعلیمات کے بین الاقوامی وفد کے ممبر کی حیثیت سے آسٹریلیا کا دورہ کریں جو مختلف ریاستوں میں جائیں گے اور متعدد دارالسلطنت میں ایسی تعلیمی کانفرنسوں میں شریک ہوں گے جو کہ "بین الاقوامی مفاہمت" کے مرکزی موضوع پر بحث کرنے کی غرض سے منعقد کی جارہی ہیں۔ خواجہ غلام السیدین صاحب جن موضوع پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیے گئے ہیں ان میں حسب ذیل شامل ہیں:-

(۱) صلح کے لیے تعلیم
(۲) تعلیم میں کیا کیا صورتیں پیدا ہونے والی ہیں
(۳) اسلام کے نظریے کی تعلیم خاص کر فلسفۂ اقبال کے حوالے سے
(۴) ہندوستان میں تعلیم
(۵) بین الاقوامی صلح و مفاہمت کے بڑھانے میں یو، ان، ای اس، سی، او کیا حصہ لے سکتے ہیں۔

تعلیمی مضامین

بچے قوم کے مستقبل کا محضر ہیں

تعلیمی ہندوستان میں جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ایک انقلابی فرد ہیں۔ موصوف نے اسلامیہ کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر جو خطبہ پڑھا تھا اس کا ایک حصہ آپ کے ملاحظہ کے لیے درج کیا جاتا ہے اس میں گو صرف طلباء سے خطاب کیا گیا ہے لیکن چونکہ خطبۂ ہذا کے اکثر و بیشتر اجزاء رائج الوقت ناقص طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالتے ہیں اس لئے زیادہ امکان ہے کہ اس کے مطالعے سے آپ اپنے استفادہ کے لیے بہت کچھ اخذ کر سکیں۔

(ادارہ)

عزیزان من ...... آپ نے یہاں اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی سال صرف کرکے تعلیم حاصل کی ہے۔ بڑی امنگوں کے ساتھ آپ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جبکہ آپ کو اپنی محنتوں کا پھل ایک ڈگری کی صورت میں یہاں سے ملنے والا ہے۔ ایسے موقع پر جسے آپ اپنے نزدیک مبارک موقع سمجھتے ہوں گے، آپ کے جذبات کی نزاکت کا مجھے پورا احساس ہے، اور اسی لئے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا صاف صاف اظہار کرتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے۔ مگر میں آپ سے خیانت کروں گا اگر محض نمائشی طور پر آپ کے جذبات کی رعایت کرکے وہ بات آپ سے نہ کہوں جو میرے نزدیک سچی ہے اور جس سے آپ کو آگاہ کرنا اس وقت، اور اسی وقت میں ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اس وقت آپ اپنی زندگی کے ایک مرحلہ سے گزر کر دوسرے مرحلے کی طرف جا رہے ہیں۔ دراصل میں آپ کی اس مادرِ تعلیمی کو ـــــ اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادران تعلیمی کو ـــــ درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کئے جاتے رہے ہیں، اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں، یہ دراصل موت کے صداقت نامے Death Certificate ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیئے جا رہے ہیں جبکہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے۔ اب یہ آپ کی اپنی خوش قسمتی ہے کہ اس منضبط اور منظم قتل گاہ سے بھی جان سلامت لیکر نکل آئیں۔ میں یہاں اس صداقت نامۂ موت کے حصول پر آپ کو مبارکباد دینے نہیں آیا ہوں بلکہ آپ کا ہم قوم ہونے کی وجہ سے جو ہمدردی قدرتی طور پر میں آپ کے ساتھ رکھتا ہوں وہ مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔

میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں ڈھونڈتا پھرتا ہو کہ کہاں نحیف جان نیم بسمل ابھی سانس لے رہا ہے۔

یقین جانیے کہ یہ بات میں مبالغے کی راہ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں اخباری زبان میں "سنسنی" پیدا کرنا نہیں چاہتا فی الواقع اس نظام تعلیم کے متعلق میرا نقطۂ نظر یہی ہے۔ اور اگر میں آپ کو ذرا تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ میں کیونکر اس نتیجہ پر پہونچا ہوں، تو کیا عجب کہ آپ خود بھی مجھ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

شاید آپ میں سے ہر شخص اس بات کو جانتا ہوگا کہ اگر کوئی پودا ایک جگہ سے اکھاڑ کر کسی دوسری ایسی جگہ لگا دیا جائے جہاں کی زمین آب وہوا، موسم، ہر چیز اس کی طبیعت کے خلاف ہو، تو وہاں کبھی جڑ نہ پکڑ سکے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مصنوعی طور پر اس کے لیے وہی حالات پیدا کر دے جائیں جو اس کی قدرتی جائے پیدائش میں تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لیبورٹیری کی مصنوعی زندگی ہر پودے کو تمام عمر کے لئے میسر نہیں آسکتی اس غیر معمولی صورت حال کو نظر انداز کر دینے کے بعد یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ کسی پودے کو اسکی اصلی جائے پیدائش سے اکھاڑنا اور ایک مختلف قسم کے ماحول میں لیجا کر لگا دینا در اصل اسے ہلاک کرنا ہے۔

اچھا اب ذرا اس بدقسمت پودے کی حالت کا اندازہ کیجیے جو اپنی زمین سے اکھاڑا نہیں گیا، اپنے ماحول سے نکالا بھی نہیں گیا، وہی زمین ہے وہی آب وہوا، وہی موسم ہے جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ مگر سائنٹیفک طریقوں سے خود اس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی گئی کہ وہیں اپنی ہی جائے پیدائش میں اس کی طبیعت اس زمین، اس آب وہوا اور اس موسم سے بے لگاؤ اور بیگانہ ہو کر رہ گئی، اور وہ اس قابل نہ رہا کہ اس میں اپنی جڑیں پھیلا سکے اس ہوا اور اس پانی سے غذا حاصل کر سکے۔ اور اس موسم میں پھل پھول سکے۔ اس اندرونی تغیر کی وجہ سے وہ بعینہ ایسا ہو گیا جیسے کسی دوسری زمین کا پودا ہے اور اجنبی ماحول میں لاکر لگا دیا گیا ہے۔ اب وہ اس کا محتاج ہو گیا ہے کہ اس کے گرد مصنوعی فضا، تیار کیجائے اور مصنوعی طور پر اس زندگی کا سامان کیا جائے۔ یہ لیبورٹیری کی زندگی اگر اُسے بہم نہ پہنچے تو وہ جہاں پیدا ہوا ہے وہیں کھڑے کھڑے زمین چھوڑ دے گا اور مرجھا کر رہ جائے گا۔

پہلا فعل، یعنی ایک پودے کو اکھاڑ کر اجنبی ماحول میں جا لگانا، چھوٹے درجہ کا ظلم ہے، اور دوسرا فعل، یعنی ایک پودے کو اسی جگہ، جہاں وہ پیدا ہوا ہے، اپنے ماحول سے اجنبی بنا دینا اس سے عظیم تر ظلم ہے۔ اور جب ایک دو نہیں لاکھوں پودوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جا رہا ہو، اور اتنے کثیر التعداد پودوں کے لیے لیبوریٹری کی مصنوعی فضا بہم پہنچانا محال ہو، تو بیجا نہ ہوگا اگر اُسے ظلم کے بجائے قتل عام کہا جائے۔

حقیقی صورت حال کا جو مطالعہ میں نے کیا ہے وہ مجھے بتاتا ہے کہ ان درسگاہوں میں آپ کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ آپ ہندوستان کی سرزمین میں مسلم سوسائٹی کے اندر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ زمین، یہی تمدنی

آب و ہوا اور یہی تہذیبی ماحول ہے اس کی پیداوار آپ ہیں۔ آپ کے نشو نما پانے اور پھل پھول لانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اسی زمین میں جڑیں پھیلائیں اور اسی آب و ہوا سے زندگی کی طاقت حاصل کریں۔ اس ماحول سے آپ کو جتنی زیادہ مناسبت ہوگی اسی قدر زیادہ بالیدگی آپ کو نصیب ہوگی اور اسی قدر زیادہ اس چمن کی بہار میں آپ اضافہ کریں گے۔ مگر واقعہ کیا ہے؟ یہاں جو تعلیم و تربیت آپ کو ملتی ہے، جو ذہنیت آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے، جو خیالات جذبات اور داعیات آپ کے اندر پرورش پاتے ہیں، جو عادات و اطوار اور خصائل آپ میں راسخ ہوتے ہیں، اور جس طرزِ فکر، رنگِ طبیعت، اور طریقِ زندگی کے سانچے میں آپ ڈھالے جاتے ہیں، کیا وہ سب مل جل کر اس زمین، اس آب و ہوا اور اس موسم سے کوئی مناسبت بھی آپ کے اندر باقی رہنے دیتے ہیں؟ یہ زبان جو آپ بولتے ہیں، یہ لباس جو آپ پہنتے ہیں، یہ طرزِ زندگی جو آپ اختیار کرتے ہیں، یہ نظریات اور افکار جو آپ اس تعلیم سے حاصل کرتے ہیں، ان سب چیزوں کو آخر کتنا لگاؤ آپ کے ان کروڑوں بھائیوں کے ساتھ ہے جن کے درمیان آپ کا جینا اور مرنا ہے اور اس تمدن کے ساتھ ہے جو آپ کے چاروں طرف چھایا ہوا ہے؟ آپ کی شخصیت اس ماحول میں کسقدر بیگانہ، اور یہ ماحول آپ کی شخصیت کے لئے کتنا اجنبی ہے! کاش آپ کے اندر اتنی حس ہی باقی رہنے دی گئی ہوتی کہ اس بیگانگی کو اور اس کی اذیت کو محسوس کر سکتے۔

آپ اتنا تو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خام اشیاء کو صنعت اور کاریگری سے تیار کرنے کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے لئے کارآمد اور مفید بن سکیں۔ جو چیز اس طرح تیار کی گئی ہو کہ اس سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکے، وہ خود بھی ضایع ہوئی اور اُس پر کاریگری بھی فضول صرف کی گئی۔ کپڑے پر خیاطی کی قابلیت اسی لئے صرف کی جاتی ہے کہ وہ جسم پر راست آئے۔ یہ بات حاصل نہ ہوئی تو اس کاریگری نے کپڑے کو بنایا نہیں، بگاڑ دیا۔ خام جنس پر طبّاخی کا فن صرف کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے کے قابل ہو جائے۔ اگر وہ کھانے ہی کے قابل نہ ہوئی تو باورچی نے اُسے ضائع کیا نہ کہ بنایا۔ بالکل اسی طرح تعلیم کا مدعا بھی یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جن نئے انسانوں نے جنم لیا ہے اور جو جبلّی صلاحیتیں *Potentialities* ابھی خام حالت میں ہیں، ان کو بنا سنوار کر اور بہتر طریقہ پر نشو نما دیکر اس قابل بنا دیا جائے کہ جس سوسائٹی نے انھیں جنم دیا ہے وہ اس کے مفید اور کارآمد فرد بن سکیں اور اس کی زندگی کے لیے بالیدگی اور فلاح اور ترقی کا ذریعہ ہوں۔ مگر جو تعلیم افراد کو اپنی سوسائٹی اور اسکی حقیقی زندگی سے اجنبی بنا دے اس کے حق میں اس کے سوا آپ اور کیا فتویٰ دے سکتے ہیں کہ وہ افراد کو بناتی نہیں بلکہ ضایع کرتی ہے! ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک لوحِ سادہ کی شکل میں آتا ہے، اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود

اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے دوسروں کے حوالہ کر دیتی ہے کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں، خواہ وہ ہماری اپنی موت کا فتویٰ ہی کیوں نہ ہو۔

جب آپ کوئی کپڑا سلواتے ہیں وہ آپ کے جسم پر راست نہیں آتا تو مجبوراً اسے مارکٹ میں لے جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اونے پونے بیچ کر کچھ دام ہی سیدھے کرلیں۔ اگر کپڑا کوئی ذی شعور ہستی ہو تو وہ خود بھی اپنا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سوچ سکتا کہ کہیں نہ کہیں اس کی سی ناپ اور اس کی سی تراش خراش کے کپڑے کی مانگ ہو تو وہ وہاں کھپ جائے جب تک کسی جسم پر درست نہ آئے گا، نیلام گھروں اور کباڑ خانوں میں مارا مارا پھرتا رہے گا۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جو ان درسگاہوں سے تیار ہو کر نکلتے ہیں جس سوسائٹی نے انھیں تیار کرایا ہے اس کے پاس جب یہ تیار ہو کر واپس پہنچتے ہیں، تو وہ بھی محسوس کرتی ہے، اور یہ خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ اس کے تمدن اور اس کی زندگی کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ جس طرح معدہ اس غذا کو قبول نہیں کرتا جو اس کے لیے مناسب نہ ہو، اسی طرح سوسائٹی بھی طبعی طور پر ان افراد کو اپنے اندر کھپا نہیں سکتی جو اس کے لیے مناسب نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو اپنے کسی کام کا نہ پاکر نیلام کے لئے پیش کر دیتی ہے، جس قدر قیمت پر بھی یہ بک سکتے ہیں بیچ ڈالتی ہے، اور یہ خود بھی اپنی زندگی کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سمجھتے کہ کہیں بک جائیں۔ آپ غور تو کیجئے کس قدر سخت خسارے میں ہے وہ قوم جو اپنی بہترین انسانی متاع دوسروں کے ہاتھ بیچتی ہے؟ ہم وہ ہیں جو انسان دے کر جوتی اور کپڑا اور روٹی حاصل کرتے ہیں! قدرت نے جو انسانی طاقت Man Power اور دماغی طاقت Brain Power ہم کو خود ہمارے اپنے کام کے لیے دی تھی وہ دوسروں کے کام آتی ہے۔ ان ہٹے کٹے جسموں میں جو قوت بھری ہوئی ہے، ان بڑے سروں میں جو قابلیتیں بھری ہوئی ہیں، ان چوڑے چکلے سینوں میں جو دل طرح طرح کی طاقتیں رکھتے ہیں، جنھیں خدا نے ہمارے لیے عطا کیا تھا، ان میں سے بمشکل ایک دو فیصدی ہمارے کام آتے ہیں، باقی سب کو دوسرے خرید لے جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس خسارے کی تجارت کو ہم بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا اصل سرمایۂ زندگی تو یہی انسانی طاقت ہے اس لیے اسے بیچنا نفع کا سودا نہیں بلکہ سراسر ٹوٹا ہے۔

مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، یا تازہ تازہ فارغ ہوئے ہیں سب سے پہلے میں یہ تحقیق کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا کوئی مقصد بھی معین کیا ہے یا نہیں۔ مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو۔ بلکہ بیشتر اصحاب ایسے ہیں جن کے ذہن میں اس امر کا

سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہئیے یا ہو سکتا ہے۔ مقصد کے سوال کو وہ محض ایک فلسفیانہ یا شاعرانہ مسئلہ سمجھتے ہیں، اور عملی حیثیت سے یہ طے کرنے کی کوئی ضرورت ان کو محسوس نہیں ہوتی کہ آخر دنیا کی زندگی میں ہماری کوششوں اور محنتوں کا ہماری تمام دوڑ دھوپ کا کوئی منتہا (goal) اور کوئی مقصد بھی ہونا چاہئے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظام تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود معین کر سکے بلکہ زندگی کے لئے کسی نصب العین کی ضرورت ہی محسوس کر سکے یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی؟ بے مقصد زندگی (Aimless Life) بسر کرنا تو حیوانات کا کام ہے۔ اگر آدمی بھی صرف اس لئے جیئے کہ جینا ہے اور اپنی قوتوں کا مصرف بقائے نفس اور تناسل کے سوا کچھ نہ سمجھے تو آخر اس میں اور دوسرے حیوانات میں کیا فرق باقی رہا۔

میری اس تنقید کا مدعا ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو ملامت کروں ملامت تو قصوروار کو کی جاتی ہے۔ اور آپ قصوروار نہیں بلکہ مظلوم ہیں۔ اس لیے میں دراصل آپ کی ہمدردی میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب جو آپ زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھنے کے لئے جا رہے ہیں تو پوری طرح اپنا جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ فی الواقع اس مرحلہ پر آپ کس پوزیشن میں ہیں، آپ ملت اسلامیہ کے افراد ہیں۔ یہ ملت کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جو اس میں پیدا ہوا ہو وہ آپ سے آپ مسلم ہو۔ یہ محض ایک ایسے تمدنی گروہ Cultural groups کا نام بھی نہیں ہے جس کے ساتھ محض معاشرتی حیثیت سے وابستہ ہونا مسلم ہونے کے لئے کافی ہو۔ دراصل اسلام ایک مخصوص نظام فکر (Idiology) کا نام ہے جس کی بنیاد تمدنی زندگی اپنے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ تعمیر ہوتی ہے۔ اس ملت کی بقاء بالکل اس بات پر منحصر ہے کہ جو افراد اس میں شامل ہوں وہ اس نظام فکر کو سمجھتے ہوں اس روح سے آشنا ہوں اور اپنی تمدنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس روح کی عملی تفسیر و تعبیر پیش کرنے پر قادر ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ملت کے اہل دماغ طبقہ Intelligentia کے لیے تو سب سے بڑھ کر اس علم و فہم اور اس عمل کی ضرورت ہے کیونکہ یہی طبقہ ملت کا رہنما اور پیش رو ہے۔ اگرچہ ہر قوم اور ہر گروہ کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا اہل دماغ طبقہ اس کی مخصوص قومی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا ہو، لیکن ملت اسلام کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ یہاں ہماری انفرادیت کی اساس نہ خاک ہے، نہ خون، نہ رنگ، نہ زبان، نہ کوئی اور مادی چیز، بلکہ صرف اسلام ہے۔ ہمارے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہماری ملت کے افراد اور خصوصاً اہل دماغ طبقے، اسلامی

طرز فکر اور اسلامی طرز عمل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے ان کی تعلیم اور تربیت میں جتنی اور جیسی کمزوری ہوگی اس کا عکس ہماری ملت کی زندگی میں جوں کا توں نمودار ہوگا۔ اور اگر وہ اس سے بالکل خالی ہوں تو یہ در اصل ہماری موت کا نشان ہوگا۔

یہ وہ حقیقت ہے جس سے یہاں کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ در اصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ اس کی غارتگری کے لیے تیار کرتا ہے؟ ان درسگاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاسیات، تاریخ، اور دوسرے تمام وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے، مگر آپ اسلام کے فلسفے اسلام کی اساس حکمت، اسلام کے اصول معیشت، اسلام کے اصول قانون، اسلام کے نظریۂ سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفہ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر اسلامی طرز پر سوچنے لگتے ہیں غیر اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے ہر معاملہ کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں، منتشر طور پر کچھ معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں مگر وہ غیر مستند اور بسا اوقات غلط اوہام و خرافات کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اسلام سے زیادہ بعید ہو جاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں وہ دماغی طور پر غیر مسلم ہو جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ اسلام حق تو ضرور ہوگا، اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور جو لوگ اس عقیدت سے بھی خالی ہو چکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس قسم کی تعلیم پانے کے ساتھ عملاً جو تربیت آپ کو میسر آتی ہے، جس ماحول میں آپ گھرے رہتے ہیں، اور عملی زندگی کے جن نمونوں سے آپ کو واسطہ پیش آتا ہے ان میں مشکل ہی سے کہیں اسلامی کیرکٹر اور اسلامی طرز عمل کا نشان پایا جاتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ علمی حیثیت سے اسلام کی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہو نہ عملی حیثیت سے اسلامی تربیت دی گئی ہو، وہ فرشتے تو نہیں ہیں کہ خود بخود مسلمان بن کر اٹھیں۔ ان پر وحی تو نازل نہیں ہوتی کہ خود بخود ان کے دل میں علم دین ڈال دیا جائے۔ وہ پانی اور ہوا سے تو اسلامی تربیت اخذ نہیں کر سکتے اگر وہ فکر اور عمل دونوں حیثیتوں سے غیر اسلامی شان رکھتے ہیں تو یہ ان کا قصور نہیں بلکہ ان درسگاہوں کا قصور ہے جو موجودہ نظام تعلیم کے تحت قائم کی گئی ہیں۔ در حقیقت یہ میرا وجدان ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، کہ ان درسگاہوں میں بہ اصل آپ کو ذبح کیا جاتا ہے، اور اس ملت کی قبر کھودی جاتی ہے جس کے نونہال آپ ہیں۔ آپ نے جس سہانے

میں جنم لیا جس کے خرچ پر تعلیم پائی جس کی فلاح کے ساتھ آپ کی فلاح اور جس کی زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی وابستہ ہے، اس کے لیے آپ بیکار بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ آپ کو صرف یہی نہیں کہ اس کی فلاح کے لیے کام کرنے کے قابل بنا دیا گیا بلکہ درا صل آپ کو باضابطہ اور منظم طریقہ پر بنا دیا گیا ہے کہ بلا ارادہ آپ کی ہر حرکت اس ملت کے لیے فتنہ ساماں ہو حتیٰ کہ آپ اس کی خیر خواہی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیں تو وہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو اس لیے کہ اس کی فطرت سے بیگانہ اور اس کے ابتدائی اصولوں تک سے بیگانہ رکھے گئے اور آپ کی پوری دماغی تربیت اس نقشہ سے کی گئی ہے جو ملت اسلام کے نقشے کے بالکل برعکس ہے

والدین سے دو دو باتیں

میں نہیں !...... یہ باتیں آپ کرینگے

مجھ کو اپنے طلبا کے والدین سے تو ہر وقت سابقہ ہے۔ آپ کو بھی کبھی کبھی ان سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا ہوگا۔ اگر اتفاق نہ ہوتا ہو تو آپ کا پیشہ اس امر کا متقاضی ہے کہ ایسے مواقع پیدا کیجئے کہ آپ کی نگرانی میں تعلیم پانے والے بچوں کے والدین آپ سے درس و تدریس کے بارے میں بات چیت کر لیا کریں والدین سے آپ کی دو دو باتیں آپ کے طریقۂ تعلیم میں بڑی حد تک معین ہونگی اور ان میں ذمہ داری کے احساس کو بیدار کرتی رہینگی۔ ان سے ملاقات کے دوران بچوں کے متعلق کچھ آپ شکوے شکایات کرینگے کچھ وہ اپنے دل کی لگی سے آپ کو مطلع کرینگے اور اس طرح نرم و گرم گفتگو کے تبادلے سے بچّوں کا مستقبل کے لیے ایک ایسا سوچا ہوا لائحۂ عمل وجود میں آجائے گا جس کی کارفرمائی ہر مقام پر اور ہر لمحہ تکمیل انفرادیت کی اعانت کرتی رہے گی۔ گھر اور مدرسے میں آہنگی لازمی ہے۔ تعلیم میں ضرورت ہے کہ گھر سے بلند کیا ہوا نالہ مدرسے کی فضا سے ٹکرائے، اور مدرسے سے بلند کی ہوئی فریاد گھر کے ماحول میں آواز بازگشت ہو کر گونجے۔ اگر اس تگ و دو میں فریاد اور نالہ سونے سے ساز بن گیا جیسا کہ وسیع امکان ہے تو اس سنگم کے تموّج سے پیدا ہونے والی صدا ایک دل گداز نغمہ بن کر محفل تہذیب و تمدن کو ضرور گرما جائے گی۔

سرد مہری

بچہ قومی حسیات کا بنیادی ذرہ ہے اگر اس کو نظر انداز کیا گیا تو قوم کی فعالی تحریکات کے تعمیری میدان تنگ ہو جائیں گے۔ ہندوستان اس نادر اصول سے بے بہرہ ہے۔ ذرا اپنے مدرسے

کے طلبار کے والدین کی بچّوں کی جانب سے بے اعتنائیوں کو دیکھیے۔ اُن کے دل میں موجیں مارنے والی وہ صحبت جو بچے کے عہد طفلی میں ایک سیل کے مانند رواں تھی اب سکونِ دریا کے مصداق ہے۔ واضح ہو کہ آپ (اُستاد) جوہر دار تیسپات کی ایک لچیلی کمانی ہیں جو اپنی پشت پر اخلاقی تمدن اور معاشرتی بار کا توازن قائم کیے ہیں، اور آپ کے شاگرد کا سرپرست وہ سنگ بنیاد ہے جس پر یہ کمانی قائم ہے آپ دونوں کا رشتہ ناگزیر سماجی ترقیوں کی میزان ہے۔ دوسری لفظوں میں یوں سمجھیے آپ اور والدین دو ستون عناصر۔ ذرا ایک کو علیحدہ کر دیجیے آپ خود دیکھیں گے کہ اجزائے تعلیم پریشاں در مقصدِ حیات فنا۔

اس سلسلے میں آپ کا ایک قومی فرض ہے کہ آپ اپنے طرزِ عمل سے والدین کی آتشِ ہمت کے کم از کم اُس جزو کو بھڑکاتے رہیے جس کا آپ کے منصب سے تعلق ہے پھر دُنیا خود دیکھ لے گی کہ آپ کے دامن کی ہوا سرد مہری کی نمرودی آگ کو سلامتی کے سائے میں گلزارِ خلیل بنا گئی۔

اتفاقات پر اعتقاد

ہمارے ملک میں طلبار کے اکثر و بیشتر والدین یا تو جاہل ہیں یا قنوطیت پسند۔ وہ جب اپنے بچّوں کے مستقبل اور اُن کی تعلیم کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

"شاعروں کی طرح آدمی نام آور شاعر بنائے نہیں جاتے۔ نام آوری فطری چیز ہے کسب سے نہیں حاصل ہوتی۔ اور یہی صورت ماہرینِ سائنس کی بھی ہے۔ اگر ازل کے روز ہی ہمارے بچّوں کو شہرت اور بزرگی ودیعت کر دی گئی ہے تو وہ یقیناً سماج کے روشن ستارے بن سکتے ہیں واقعات ان کی ترقیوں کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارا سوچا ہوا اور کیا ہوا کچھ کام نہ آئے گا۔"

ایسے تنگ نظر گروہ سے آپ کو دوچار ہونا ہے اور اگر آپ نے ملک کی اصلاح اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے تو علم کے ساتھ عمل کا پرچم لہرایے اور اپنے پڑوسیوں کا شانہ ہلا ہلا کر تلقین کیجیے کہ آنے والی نسلوں پر عملی توجہ ہی سے انفرادی بلندی اور قومی تعمیر کا امکان ہے۔ اس اصول کا پرچار اشد ضروری ہے کیونکہ عمل و علم میں یگانگی ہے اور علم و اتفاقات میں بیگانگی۔ ایک میں جان ہے اور دوسرا بے جان علم کی شاہراہیں علم کے چراغ سے روشن ہیں اور علم کی منزلیں اتفاقات کے ہاتھوں موہوم۔ ایک پر چلنے والا قومی کارواں مقصدِ حقیقی کی سرزمین پر بستر کھولے گا دوسرے پر گام زن قافلہ اگرچہ صبا رفتار ہی کیوں نہ ہو لیکن چونکہ بلا مقصد چل دیا ہے اس لئے شل ہو ہو کر بھٹکتا پھرے گا۔ اور اطمینان کی منزل کہیں نہ پا سکے گا جو بستر راحت کھولنے کی نوبت آئے زمانہ کمزوراں کی نمایاں روش اس روشن استعارہ کی ترجمان ہے۔

آپ نے اگر بچوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا ہے اور اپنے مقدس پیشے سے ملکی و قومی اصلاح کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے تو آپ بچوں کے والدین کے دلوں سے "اتفاقات اور واقعات" کا سرابی توجہ دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کہیں گے یہ طول عمل ہے تو آپ کے پیشے کی ساری زندگی ہی طول عمل ہے۔ ایک مقرر اپنے مشکل سے مشکل موضوع کو پھیلاتا ہے اور آناً فاناً اسے سمیٹ کر اپنی زبانی کارگذاریوں کا انجام پالیتا ہے ایک فلسفی اپنے تخیلات کو پرواز دے کر مسئلہ زیر غور کو مباحثہ کی زد میں لاتا ہے اور لمحوں میں اپنی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔ مزروعہ چند دنوں میں اپنی جانفشانیوں کی نمائش سے زبان تحسین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ خون دل سے سینچی ہوئی باغبان کی جستجو برق و باران کی موسمی تحریکات کے باوجود چند ماہ کی مدت میں اپنی گل افشانیوں سے دامانِ نظر کو مالا مال کر لیتی ہے لیکن آپ کی ذہنی جد و جہد اور آپ کا جسمانی تکان بہاں میں نتیجہ کا منہ دیکھ پاتا ہے۔ آپ کے صبر کی پیداوار ضرب المثل ہے۔ ظاہر ہے کہ درس و تدریس کا پودا متضاد کیفیتوں میں پھلتا اور پھولتا ہے وہ متعدد بہاروں کی سرور افزا سرمستیوں سے لہراتا اور بے گنتی خزاں نصیب ہاتھ کے جھونکوں کی خوشہ چینی کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔ گو بار آوری کی مدت دراز ہے لیکن انجام روح پرور۔

آپ کو ایسے بھی والدین سے دوچار ہونا پڑتا ہوگا جو مدرسے میں بچے کے داخلہ کے تین چار ماہ بعد ہی کہتے آتے ہوں گے کہ " واہ میرا لڑکا اتنے دنوں سے اسکول آتا ہے لیکن ابھی تک اُس کو الف۔ بے۔ بھی نہ آئی" آپ کو انھیں یہ فلسفہ آسان لفظوں میں سمجھانا ہے کہ وہ تعلیم میں اعجاز کی حکمرانی نہیں۔ اس کی مدت طولانی ہے اس کے لیے صبر و شکیبائی لازم۔

پرورش کے مدارج

اب میں آپ کی توجہ دوسرے مشکل اور اہم مسئلے کی جانب مبذول کراتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے وہ دنیا کے متعلق اطلاعات اور اس میں پھیلے ہوئے علوم سے ناآشنا ہوتا ہے وہ بالکل نہیں جانتا کہ اُس کو عالم امکان میں کیا کرنا ہے۔ اس لاعلمی کے زمانے میں جس کو طفلی کہنا چاہیے والدین اس کی پرورش کرتے ہیں اُس کو کھلاتے ہیں پلاتے ہیں پہناتے ہیں۔ اپنی زندگی کے دوسرے اہم مشاغل کے باوجود وہ اپنا زیادہ وقت اس کی نگہداشت میں صرف کرتے ہیں۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ کونسی ایسی ہندوستانی ماں ہے جس نے اپنے سہمے ہوئے بچے کو چند لمحوں کے لیے بھی اپنی آغوش سے علٰحدہ کیا ہے یا کونسا ایسا باپ ہے جس نے اپنے صغیر سن بچے کی جانب سے دن و رات کے کسی گھنٹے میں اپنی توجہ دور کی ہو۔ نہ جانے

کیا سبب ہے کہ ماں ہی ماں باپ کی محبت بچے کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ تدریجاً کیوں کم ہوتی جاتی ہے جو چاہت چھ مہینے کے سن میں تھی وہ سال بھر کی عمر میں نہیں۔ دو سال کی عمر میں اس سے کم حتیٰ کہ تین اور چار سال میں مقابلتاً نصف رہ جاتی ہے۔ پرورشی فاصلہ میں اللہ رے بُعد۔ بچپن کی تکمیل میں یہ کاوش اور جب وہ وقت آیا کہ صحیح معنوں میں انفرادیت کو پختہ کیا جائے اور انسانیت کے نقوش اُبھار کر نمایاں کیے جائیں تو یہ لاپروائی۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی آپ کے ذہن میں ہوگی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ماں اور باپ دونوں کی محبت اولیں خالص عملی ہوتی ہے وہ اپنے تمام قوائے ذہنی وجسمانی سے صغیر سن بچے کی امداد کرتے رہتے ہیں۔ گو بچے میں اس وقت اپنی قوت پیدا کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ وہ بظاہر ہاتھ پاؤں مار کر اپنے تصورات کی تسکین اور اپنے تخیل کی دنیا کو آباد کرتا رہتا ہے اس کی قوت نمو کے دوش بدوش جذبۂ نقالی بھی بار ثمر پر ہوتا ہے۔ اس جذبہ کی امداد میں ماں اور باپ کس پیار سے اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں آپ کے عام تجربہ میں یہ بات اکثر و بیشتر آچکی ہوگی کہ طفلی کی نشو ونما میں طرفین سے نیک نیتی اور اتحاد عمل کا اظہار ہوتا ہے۔ ادھر بچے نے جنبش کی اور والدین کے احساسات میں تحریک ہوئی۔ ان کے جذبہ نگرانی نے ہاتھ پھیلا کر اُس کے خیال کو اپنی محبت بھری گود میں لے لیا۔ لیکن جب وہی بچہ تعلیمی دور میں قدم رکھتا ہے تو اس مفید رہنمائی کے بجائے اُس کے تمام قوائے ذہنی وجسمانی مثلاً قوت سوال۔ قوت تعمیر۔ قوت تخریب وغیرہ کو ادھا دھند طریقہ پر کچلا جاتا ہے۔ گویا اُن کی بڑھتی ہوئی رو پر جبر واستبداد کا بند باندھا جاتا ہے۔ خود والدین سے کہئے کہ دریا کا بہاؤ روکیں خود معلوم ہو جائے گا کہ آب رواں کی چادر پھٹی اور جامۂ امید کو تار تار کر گئی لیکن اگر یہ بندش کسی خاص مقصد کے ماتحت عمل میں آئی ہے تو طوفانی بہاؤ کے شاخسانے کشت امید پر شادابی انجام کا افسانہ کہتے نظر آئیں گے۔ بہ الفاظ دیگر بچے کی فاضل جبلیت کی روک تھام مضرا در شاہراہ حیات پر اس کی صحیح رہنمائی نفع بخش ہے۔

شعور مدنیت کا فقدان

آپ کو والدین اور سرپرستوں کا ایک ایسا طبقہ بھی ملے گا جو ہندوستان کی سیاسی پستی کی بنا پر شہریت کے فلسفہ سے ناواقف اور اس کے استفادہ سے ناآشنا ہے وہ طبقہ دیہات کے باشندوں کا ہے۔ گو پنچائت کے اداروں سے ان کو اکثر و بیشتر دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ پنچوں کی رائے کو آئین زندگی تصور کرتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی ناواقفیت اور کم علمی کے باعث اُن میں علم "مدنیت" کا فقدان ہوتا

ہے اور یہی سبب ہے کہ ان میں اکثر بچوں میں جذبۂ شہریت کو جگمگاتا دیکھ کر چراغ پا ہوتے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ صغر سنی میں بچے کی تمام بڑھتی ہوئی قوتوں میں سے دوست بنانے اور ساتھی تلاش کرنے کی قوت شاداب ہوتی ہے۔ وہ ماں باپ کی ہدایات کے مطابق بھائی بہن اور گرد و نواح کے لوگوں سے اس وقت سے دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے جب سے اس میں قوت بصارت کی نشو و نما کا آغاز ہوتا ہے اس کی آنکھیں سورج کی روشنی اور الوان کی بوقلمونی کو دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ کان عالم امکان کی موسیقی کو اپنی جگہ دینے کے لائق۔ ہاں! قوت گویائی اور تکلم کی ابتدا نہیں ہوتی اس منزل پر ماں باپ دونوں اڑوس پڑوس اور آس پاس کے لوگوں سے بچے کا تعارف کراتے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بچہ زیادہ سے زیادہ افراد سے واقفیت حاصل کرے اور اپنے کو اُن کی صحبت کا ایک جیتا جاگتا ممبر بنائے۔ ابتدائے زندگی میں اصول شہریت کی یہ پابندی کوئے بچے بوجھے ہوں۔ لیکن آگے بڑھ کر مفید اور مؤثر سماجی اداکاریوں سے اتنی بے التفاتی۔

اگر آپ دیہی مدرسوں میں کام کر رہے ہیں تو آپ کا فرض ہوگا کہ اپنے طلباء کے والدین اور سرپرستوں سے بات چیت کرنے میں "شہریت اور اصول شہریت" کے موضوع کو نظر انداز نہ کریں۔ آپ کے اس مفید اصلاحی اقدام سے تعلیمی کام کے علاوہ ملکی کام کی بھی ایک گونہ تکمیل ہوتی جائے گی۔

خود غرضی

لیجئے یہ آخری اور دلچسپ بات بھی سن لیجئے لیکن اس بات کے کہنے کا جب وقت آئے تو ذرا سلیقے سے کام لیجیے گا اکثر و بیشتر والدین اپنے گھریلو آرام اور نجی سکون تلاش کرنے کے ذیل میں گھبرا کر بچوں کو مدرسے بھیج دیتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ بالاعلان کہتے ہیں کہ بچہ شرارت کرتا ہے اس کو اسکول بھیج دینا ہی ٹھیک ہے۔ لیجئے "طویلے کی بلا بندر کے سر" گھر کا ناخوشگوار عنصر مدرسہ کے حوالے۔ گویا بچہ ایک وبائی بیماری ہے جس سے گھر کو پاک کیا جاتا ہے اور مدرسے کو آباد۔ جب جائے معلم کی یہ قدر و قیمت ہے تو خود معلم کا خدا حافظ اچھا یہ مانا کہ اس تحریک میں بچے کی اصلاح کے لیے بے چینی بھی شامل ہے تو ایسے والدین تعلیم پر ایک ناقابل قبول بار ہیں جو گھر میں بچے کی درستی کا ماحول نہ بنا سکیں اور از ابتدا تا انتہا سب کچھ مدرسے ہی کے سپرد کر دیں۔ ان والدین سے آپ فرمائیے کہ اگر حلاوت ماضی کی لطیف یاد اور مستقبل کی روشن کامیوں کو اپنے بچوں کے دور حیات میں جگمگاتا دیکھنا چاہتے ہیں تو خود زیادہ

زحمت اٹھائیں اس کی کم توقع رکھیں کہ دوسرے ان کا گلشن امید سینچ کر تیار کر دیں گے۔ یہ مانا کہ مدرسے کا ماحول ایثار و قربانی کے تاثرات کا حامل ہے مگر خطرات کے قانون کا علاج جب تک گھر سے آئی ہوئی گھنگھور گھٹائیں مدرسے سے بلند ہونے والے بادلوں سے ہم آغوش نہ ہوں گے نہ ابر نیساں کی تشکیل ہوگی نہ موتی برسیں گے۔

دعوتِ سعیِ عمل

ذیل میں آپ کے ملاحظہ کے لئے ایک خط درج کیا جاتا ہے۔ اس کا موضوع یقیناً آپ کے جذبۂ عمل میں تحریک پیدا کر دے گا۔ ذرا دیکھئے کہ غیر ممالک میں آپ کے پیشے والے اپنے فرائض کو کتنا اہم جانتے اور اس کی انجام دہی میں کتنے بے چین ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور سے آپ کو پورے پورے طور پر اس بے چینی کا احساس ہو گا اور آپ دیکھیں گے کہ ایک غریب بولیسی مدرس اپنے معلومات کے اضافہ کا کس درجہ خواہشمند ہے۔ کاش ہم سب اس سے سبق لیتے۔ (مدیر)

خط

حضرات! میں اسکول کا ایک مدرس ہوں جغرافیہ پڑھاتا ہوں چونکہ دنیا کے تمام استادوں سے تعلیم سے متعلق خط وکتابت کرنے کا خواہشمند ہوں اس لئے میں اپنے ہندوستانی معلوں سے بھی مستدعی ہوں کہ وہ خط کے ذریعہ مجھ سے بات چیت اور معلمی کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال فرمائیں مجھ کو ہر موضوع پر تحقیقات کرنے اور لکھنے کا شوق ہے اور میں ان تمام چیزوں کا ذخیرہ کر رہا ہوں جو اس چمکتے ہوئے سورج کی کرنوں سے ضوبار ہیں۔

میں بے حد ممنون ہوں گا اگر آپ اپنے مدرسے کے مقصد اپنے مخصوص اسباق۔ نقشے اور اسی قسم کے تعلیمی خاکوں سے مجھے مطلع اور تعلیم کے موضوع پر مجھ سے کچھ طلب فرمائیں گے۔ میرے پاس غیر ملکی سکوں قدرتی مناظر کی تصویروں اور دوسرے قسم کے نقشوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے اور آپ ان میں سے کوئی نقشہ طلب فرمائیں تو آپ کے ملاحظہ کے لیے حاضر بھی کر سکتا ہوں۔ اگر اسی قسم کا کوئی غیر معمولی کام جس سے میرے اسباق میں مجھے مدد پہونچے آپ مجھکو مرحمت فرمائیں تو میں انتہائی ممنون ہوں گا۔

مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے انگریزی میں خط وکتابت کریں گے اس کا ترجمہ کرا لوں گا۔

کیا آپ اور آپ کا عزیز ملک ایک غریب معلم کی آواز پر لبیک کہے گا۔

(آپ کا مخلص)　　سی، وڈ، کیوڈی بیک

۶۳۲ وسٹ، آٹھواں اسٹانیوالا اسٹریٹ

اوہیو، (یو۔ ایس۔ اے)

دنیا میں رفتارِ تعلیم

افسر مدرس ٹریننگ کالج میپل (ہالینڈ) کے کچھ نکات

مسٹر دان ڈریمولن افسر مدرس ٹریننگ کالج میپل کے ایک طویل مقالہ سے وہ چند اہم اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جو فرائض کے انجام دہی میں آپ کے معین ہونگے۔ گو یہ نظریات کسی غیر معمولی معنویت کے حامل ہیں لیکن ان کا بار بار اعادہ اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ ان کی یاد کسی عالم میں بھی دھندلانے نہ پائے۔ (ادارہ)

"........ ہمارا مقصد حقیقی یہ ہے کہ تعلیم میں ایسے وسائل اختیار کیے جائیں جن سے طلبا کی شخصیت کی تکمیل ہو سکے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہمارے بنیادی مدرسوں کو مندرجۂ ذیل اصولوں پر کاربند رکھنا پڑیگا۔

(۱) عملی کاموں کا اجرا۔

(۲) انفرادی تعلیم و تربیت پر مخصوص توجہ۔

(۳) اُن ذرائع کا اختیار کرنا جن سے انواع و اقسام کی ذہنی قوتیں پختہ ہوں اور ان میں توازن قائم رہے۔

(۴) وہ تدابیر عمل میں لائی جائیں جن سے اخلاقیات کی درستگی ہوتی رہے۔

.... چونکہ ان ہی چار عناصر پر تعلیمی حیات کا دار و مدار ہے اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے ٹریننگ اسکولوں اور ٹریننگ کالجوں کے طلبا کو ذیل کے اہم نکات کی جانب متوجہ رکھیں۔

(۱) کہ وہ اپنے زیر تعلیم بچوں کی تمام تحریکات کو مقرر کردہ نصابی و درسی نقشہ جات۔ کتب و آلاتِ تعلیمی ہی سے وابستہ نہ رکھیں بلکہ ذاتی کاوشوں اور شخصی تجربات کو ہر منزل پر پیش پیش رکھیں درسی اسباق کے لیے درس گاہوں کی جماعتوں میں حاضری دینے سے زیادہ کتاب خانوں کی حاضری کو ضروری سمجھیں جہاں یہ مان لیا گیا ہے کہ ان کی قوت تلاش کسی پہلو تشنہ نہ رہ سکے گی۔

(۲) بچے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مدرس کے محتاج نہ رہیں اُن کے تحقیقاتی اقدام خود مختارانہ ہونا لازمی ہیں۔ اس امر کی پابندی پہلے ہی روز سے اُن کو با اُصول ہی نہیں بلکہ با عمل رہنے پر

مجبور کرے گی ان کو نہایت ہوشیاری سے وہ تمام نوٹس خلاصے۔ کتابوں کی فہرستیں۔ اپنا مہیا کیا ہوا ذخیرہ نقشہ جات اور شکل اس کے دوسری چیزیں باحتیاط یکجا کرنا پڑیں گی جن سے ان کو حوالہ جات کی فراہمی میں سہولت ہو۔

(۳) بچے "وحدت" سے "کثرت" کی جانب قدم بڑھاتے رہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ایک معلوم شدہ "جزو" سے ایک غیر معلوم شدہ "کل" ہاتھ آسکے۔ یہ اہم اور مشکل کام اگر تنہا نہ ہو سکے تو دو دو تین تین کی ٹولیاں بنادی جائیں جہاں ایک دوسرے کی متحدہ اعانت سے تحقیقات کی منزل سر ہونے میں آسانیاں بہم ہو سکیں۔

(۴) بچوں میں پیش قدمی کی قوت بڑھتی رہے

(۵) بچوں میں بیرون مدرسہ تعلقات پیدا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا رہے اس کے لیے مدرسہ کی خط و کتابت کا مطالعہ۔ اکسی کرشن فنون لطیفہ کی طرف توجہ۔ حرفہ سے دلچسپیاں زیادہ کارآمد ہیں۔

(۶) اس امر کی کوشش لازمی قرار دیجائے کہ بچے عملاً اپنے خیالات کے اظہار میں ترقی کرتے رہیں۔ وہ آپس کی گفتگو استادوں سے بات چیت مدرسہ کے تمام بچوں کے سامنے اظہار خیال میں کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ ان نکات کی تکمیل کے لیے ٹریننگ کالج اور ٹریننگ اسکولوں سے نکلے ہوئے نئے استادوں کے واسطے مندرجۂ ذیل ہدایات ضروری ہیں۔

مخصوص موضوع کی تعلیم دینے والے ہر استاد کے پاس اپنا علیحدہ کتاب خانہ ضروری ہو۔ کتابیں کھلی ہوئی الماریوں میں رکھی جائیں۔

کتابوں کے "کورس" علیحدہ کر دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے موضوع بروقت نظروں کے سامنے رکھ سکیں۔

مدرسہ میں تمام تعلیمی مواد ایسی کھلی ہوئی جگہ رکھا جائے جہاں بچے آسانی سے پہنچ سکیں۔

بچے کاغذ کے کشادہ صفحات پر کام کریں۔۔۔۔۔

وہ اپنے تمام تحریری کام کو فائلوں میں یکجا رکھیں۔۔۔۔۔۔۔

وہ اپنا تعلیمی ذخیرہ اپنی حفاظت میں رکھیں۔۔۔

ہر جماعت کے کمرہ میں عملی کاموں کی نمائش ہونا چاہیئے۔

جماعت کا ہر کمرہ بچوں کی آمد و رفت کے لیے کھلا رہنا چاہئے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مقامی تاریخ کی تعلیم

ملکی تاریخ پڑھانے کے لیے بچوں کو تیار کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں مقامی تاریخ چھوٹے چھوٹے قصوں کے ذریعہ سے پڑھائی جائے۔ اس طریقۂ کار

سے وطن کی محبت۔ ہیرو ورشپ اور دلیری کے جذبات اُبھرتے رہیں گے۔ اور موجودہ نسلیں اپنے خاندانی اور برادری کے کارناموں سے درس لے کر ملکی تاریخ کے وسیع اسباق سے دلچسپیاں لینے لگیں گے سمرسٹ کے بنیادی مدرسوں میں تاریخ کی تعلیم کے لیے وہاں کے مقامی ذی اثر لوگوں نے ہر قسم کی اعانت کا وعدہ کیا ہے اور اکثر و بیشتر اوقات صرف اسی کام کے لیے مخصوص کردئے گئے ہیں کہ اُن کی آمدنیوں سے سمرسٹ کی مقامی تاریخ مرتب کی جائے وہاں کے گذشتہ وطن پرست بہادروں کے کارنامے سراہے جائیں اور ان ہی کارناموں کو آلۂ کار بنا کر بچوں میں وطن کی محبت پختہ کی جائے۔

گو ہمارے لیے یہ طریقہ طول عمل تصور کیا جائے گا لیکن کیا اچھا ہوگا کہ ریاست رامپور تمام بنیادی مدارس میں رامپور تاریخی قصے پڑھائے جاتے اور بچوں سے نامور مقامی دلیروں سورماؤں اور خدمت ریاست کے سلسلہ میں مشہور وفاداروں سے تعارف کرایا جاتا۔

مدرسوں میں غذا کی فراہمی

مئی کے آخری ہفتہ میں انگلستان کی تعلیمی وزارت نے اسکول میل آرگنائزرس (مدرسوں میں کھانے کا انتظام کرنے والوں) کی ایک کانفرنس طلب کی تین سو مندوبین نے کانفرنس مذکور میں شرکت کی اور آرگنائزرس نے انتہائی انہماک سے تمام کارروائی میں حصہ لیا یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی جس کو انگلستان کے مقتدر حلقوں میں کافی اہمیت دی جارہی ہے اس گروہ کے ایک فرد نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ "تعلیم میں دو ہی چیزیں اہم ہیں جن پر ہم اپنی پوری قوت صرف کررہے ہیں۔ ایک تو بچوں کی جسمانی اور دوسرے دماغی تندرستی۔ آخرالذکر اول الذکر کی شرمندۂ احسان ہے۔ اگر بچہ جسمانی طور پر بیمار ہے تو دماغی بیماری بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ اگر بچہ کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنا ہے تو اس کے لیے مفید غذا کا مہیا کیا جانا فرض اولین ہے جس طرح ہمارے تعلیم کے ماہر بچوں کی دماغی خوراک بہم پہنچانے کے لیے اچھی اچھی کتابیں تصنیف کرنے میں مشغول ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی جسمانی صحت کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ اس کو ترقی دینے میں پورے انہماک سے کام لیں اس طرح ہماری اور مذکورۂ بالا ماہرین کی متحدہ کوششیں تعلیم کے مقصد کو کامیاب بنا سکیں گی۔ اگر اس جنگ عظیم کا بار ہمارے کاندھوں پر نہ آپڑا ہوتا تو ہم اپنی اس گراں بہا خدمت کو بام عروج تک پہنچا چکے ہوتے"۔

اس کانفرنس کا یہ اثر ہوا ہے کہ محکمۂ تعلیم نے تجربہ کار فوڈ آرگنائزر عورتیں مدرسوں میں تعنات کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور عنقریب اس مفید اور موثر شعبہ کی تکمیل ہو جائے گی۔

دو متضاد نظریئے

ابھی چند روز ہوئے کہ پاپائے اعظم نے اٹلی کی ایک کانفرنس میں صدارت فرماتے ہوئے کہا کہ "دنیا میں لاکھوں معصوم بچے فاقوں مر رہے ہیں ان ناوقت اموات اور بے ہنگام حادثات کے دوش بدوش انسانوں کی اخلاقی پستی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صرف تین چیزیں ان حوادث کا سبب ہیں۔ اول فارغ خطی جو عام ہو رہی ہے۔ دوم وہ مدرسے جن سے دینی و مذہبی تعلیم بالکل سلب کر لی گئی ہے۔ اور سوم اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے جرائد و رسائل جن کے اجرا کی عام اجازت حکومتوں نے دے رکھی ہے۔

کامن ویلتھ پارٹی کی سالانہ کانفرنس میں جو ۲۶، اپریل کو ہیٹنگز میں منعقد ہوئی نیشنل کمیٹی نے تعلیمی اصلاحات کے سلسلہ میں یہ درخواست پیش کی کہ فرقہ وارانہ درسی کتابوں کی تعلیم بند کر دی جائے بلکہ مذہبی تعلیم کا ذکر بھی نصاب تعلیم سے خارج کر دیا جائے۔ اگر ایسے والدین اور سرپرستوں کی اکثریت ہے تو اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے پر مصر ہیں تو اُن کے لیے اس قسم کی مخصوص درسگاہوں کا اجرا کیا جائے جہاں دینی و مذہبی تعلیم کا انتظام ہو۔ اور عام درسگاہیں ان جراثیم سے پاک و پاکیزہ رکھی جائیں۔

پونا میں صوبوں کے تعلیمی وزیروں کی کانفرنس

ہمیں افسوس ہے کہ باوجود کافی جدوجہد کے ہم اس کانفرنس کی مکمل کارروائی حاصل نہ کر سکے۔ "تعلیم جدید" کے ناظرین یعنی مدرسین رسالۂ ہٰذا کے صفحات پر اس اہم اور تاریخی کارروائی کو دیکھنے کے ضرور متمنی ہوں گے۔ ہماری کوششیں جاری ہیں اور تفصیلات حاصل ہونے پر تمامتر کارروائی آئندہ اشاعت میں درج کی جائے گی۔ فی الحال ہم مسٹر ڈی۔ ایس جوشی ڈپٹی سکریٹری محکمۂ تعلیمات بمبئی کے دستخطوں سے جو ایجنڈا کانفرنس مذکور کا جاری کیا گیا ہے اسے درج کرتے ہیں۔.....

(ادارہ)

ایجنڈا

(۱) صوبائی حکومتوں کی بنیادی قومی تعلیم سے متعلق کیا پالیسی ہونا چاہئے۔ کیا مذکورۂ بالا طریقہ تعلیم اب تجربہ ہی کی حد تک رکھا جائے جیسا کہ ۳۸ء تک رہا یا ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں اسی کو جاری کیا جائے؟

(۲) وہ ذرائع و وسائل دریافت کیے جائیں جن سے یہ طریقۂ تعلیم ابتدائی مدارس میں کامیابی سے جاری کیا جا سکے۔

(۳) بنیادی قومی تعلیم کے لیے درسی کتب کی تصنیف و تالیف اور ان کی تیاری کے طریقے۔

(۴) پروگرام جس سے جبریہ ابتدائی تعلیم کا اجرا ہو سکے۔

(۵) ابتدائی تعلیم کے اجرا کرنے میں حکومت اور مقامی عمال حکومت کی ذمہ داریوں کا اعلان۔

(۶) تعلیم بالغان کا اجرا۔

(۷) طلبا کو مجلسی خدمات انجام دینے کی تعلیم۔

بسلسلۂ تعلیم بالغان

دیگر سماجی خدمات

ان مخصوص گاؤں اور دیہاتوں کا مشترکہ لیبر کیمپ۔

(۸) ثانوی مدارس میں انگریزی زبان کو کونسی جگہ دینا چاہیئے۔

نوٹ۔ اسی کانفرنس میں ایک تجویز یہ بھی منظور ہوئی ہے کہ ابتدائی مدرسوں سے انگریزی زبان کی تعلیم بالکل خارج کر دی جائے۔

(۹) ایک ایسی کمیٹی کا تقرر جو مندرجۂ ذیل امور کی تفصیلات پر تحقیقات کر کے بعد میں اپنی سفارشات پیش کرے

(الف) بنیادی تعلیم۔

(۱) اُن مدارج کا یقین جن کے ذریعہ سے بنیادی تعلیم کا اجرا ہو سکے۔

(۲) استادوں کا مہیا کیا جانا انکی استعداد انکی حرفہ اور دوسری صنعتوں دستکاریوں میں ٹریننگ جو بنیادی تعلیم کے لیے ضروری ہیں۔

(۳) دیگر ضروریات کا مہیا کیا جانا۔ کمدر کا پرچار وغیرہ اور دوسرے اسی قسم کے شعبوں سے اتحاد عمل کے طریقے سوچنا۔

(ب) جبریہ تعلیم کے پروگرام کی تفصیلات کے اجرا پر غور کرنا۔ مثلاً کس عمر سے یہ تعلیم ضروری قرار دی جائے۔ عمارات کی تعمیر وغیرہ۔

نیو ایجوکیشن فیلوشپ رامپور

نیو ایجوکیشن فیلوشپ رام پور کے اہم مقاصد یہ ہیں کہ اس ادارہ کے ذریعہ جدید اور سائنسی طرز تعلیم کی تبلیغ کی جائے جہالت کے خلاف جہاد اور ابتدائی تعلیم کی جانب عوام کو دعوت دیجائے اور اور وہ تمام ذرائع و وسائل اختیار کئے جائیں جن سے تعلیمی ادارہ جات کو اپنے فرائض انجام دینے میں سہولت ہو۔ اس کے ممبروں نے یہ بھی اپنا فرض قرار دے لیا ہے کہ طلباء کے والدین سے ان کے بچوں کی تعلیم کے متعلق تبادلۂ خیال کرتے رہیں اور ان کے مستقبل کی تمام راہوں سے والدین کو آگاہ کرتے رہیں۔ ہر مدرس کا فرض ہے کہ اس برادری میں جلد شامل ہو جائے۔ تفصیلات حاصل کرنے کے لیے

دفتر نیو ایجوکیشن فیلوشپ، خسرو باغ، رامپور

کے پتے پر مراسلت کیجیے۔

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

بچوں کے کتاب خانہ کے افتتاح کی خبر گزشتہ شمارہ میں مختصراً شائع ہو چکی ہے۔ مزید تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ اس تحریک کا اہم جزو عالی جناب مرشد زادہ آفاق نواب ولی عہد بہادر دام اقبالہم کی صدارتی تقریر ہے جس کے اہم اور افادی پہلو کی جانب آپ کی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

(ادارہ)

خطبۂ صدارت

حضرات اور عزیز بچو! سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بچوں کے کتب خانہ کی افتتاح کے لیے مجھے یہاں مدعو کیا اور یہ نیک کام میرے سپرد کیا، جس کی وجہ سے مجھے رامپور کے طلبار کی ایک مفید تحریک میں حصہ لینے کا موقع ملا ہے۔

عام طور پر ہمارے ملک و ریاست میں بچوں کی زندگی بہت تنگ و محدود ہوتی ہے، اس کی کئی وجہیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اُن کو مفید تہذیبی چیزوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہماری تہذیب کا دار و مدار اچھی تعلیم پر ہے، اور علم حاصل کرنے کے لیے کتب خانے نہایت ضروری ہیں۔ یہ کتب خانہ اس کمی کو پورا کرنے میں مدد دے گا اور میں امید کرتا ہوں کہ بچوں کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرے گا۔

جیسا کہ عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے:۔ یہ کتب خانہ فی الحال ایک چھوٹے سے پیمانے پر جاری کیا گیا ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ حکومت اور محکمۂ تعلیم مستقبل قریب میں اس کی طرف زیادہ توجہ کر سکے گا۔ اس کی اپنی عمارت ہوگی اور اس میں نہ صرف بچوں کے لیے کتابیں پڑھنے کا انتظام ہوگا بلکہ اُن کے کھیلنے اور تفریح کا، اُن کے جلسوں، اور تقریبوں کا انتظام بھی کیا جائے گا تاکہ یہ کتب خانہ اُن کی تہذیبی زندگی کا مرکز بن جائے۔

مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ اس کتب خانہ کے ساتھ ایک چھوٹا سا میوزیم بنانے کی تجویز بھی ہے جس میں بچوں کی بنائی ہوئی چیزیں اور اُن کی دلچسپی کی دوسری چیزیں جمع کی جائیں گی، تاکہ اُن کی نظر اور دلچسپیوں میں وسعت

پیدا ہو۔ اس میوزیم کے لیے بعض مناسب چیزیں فراہم کرنے کی میں خود بھی کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ اہل علم پور اس کام میں محکمۂ تعلیم کا ہاتھ بٹائیں گے۔

میں ریاست کے تمام بچوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کتب خانہ سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ ایک اچھی کتاب زندگی کی بہترین ساتھی اور دوست ہے اور بڑے بڑے مصنف کتابوں کے ذریعے ہمارے ہر وقت کے مشیر اور مددگار بن جاتے ہیں اور ہمارے کاموں میں مدد دیتے ہیں کتاب کے بغیر انسان کی زندگی خالی خالی اور روکھی پھیکی بن جاتی ہے۔ اس لیے یہی زمانہ ہے جب تم کتابوں کی دنیا میں داخل ہو کر مطالعہ کی اچھی عادت ڈال سکتے ہو اور اس سے عمر بھر فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

رامپور کا کتب خانہ تمام دنیا میں مشہور ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ کتب خانہ جو کہ میرے خیال میں ہندوستان میں اپنی قسم کا پہلا ہے اس ملک میں شہرت حاصل کرے؟ اس کتب خانے کی ترقی اور بہبودی ہمارے ہاتھوں میں ہے اور میں اہل وطن سے امید کرتا ہوں کہ وہ اس کتب خانے میں نیز محکمۂ تعلیم کی تمام تحریکوں میں گہری دلچسپی لیں گے اور اُن کی مدد کریں گے۔

بچوں کے کتب خانے کی افتتاح کا میں اعلان کرتا ہوں اور اس کی ترقی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

بچوں کا کتاب خانہ
ایک نئی تعلیمی تحریک

رامپور کی تعلیمی ترقی وہ شاندار کارنامہ ہے جس سے راعی و رعایا دونوں کے جوش عمل و صحت فکر کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اور اس کے دور رس نتائج پر فریقین کو بجا طور سے فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ آج رامپور میں مرد اور عورت بچے اور بوڑھے۔ لڑکے اور لڑکیوں سب کے لیے تعلیم کا ایسا معقول اور مناسب انتظام ہے جو انھیں حالات کے لحاظ سے کامیاب زندگی کی طرف لے جانے کا ضامن ہے۔ شہر میں لڑکیوں کے لیے ہائی اسکول۔ اور مڈل اسکول۔ لڑکوں کے لیے انٹر کالج۔ ہائی اسکول اینگلو ورناکیولر مڈل اسکول۔ اردو مڈل اسکول ٹکنیکل اسکول اور عربی کی اعلیٰ درس گاہ بچوں کے لیے محلے محلے پرائمری مدارس عورتوں کے لیے مدرسہ امور خانہ داری و دستکاری بوڑھوں اور بالغوں کے واسطے تعلیمی مرکز اور اساتذوں کے لیے ٹرینِنگ اسکول قائم ہیں اور ابتدائی لازمی تعلیم کا بھی انتظام بڑی تیزی سے جاری ہے۔ دیہات میں جابجا پرائمری مدارس اور مرکز تعلیم بالغان تحصیلوں اور قصبوں میں اُردو مڈل اسکول اور لڑکیوں کے اسکول موجود ہیں اور ایک تحصیل میں ابتدائی لازمی تعلیم بھی رائج ہے یہ تمام ادارے روز افزوں کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

براہ راست تعلیم دینے والے اداروں کے علاوہ بہت سی تحریکیں وقتاً فوقتاً جاری ہوتی رہتی ہیں جو اہل رامپور کے لیے تعلیمی وتہذیبی مذاق کی اصلاح اور ترقی کے سیکڑوں سدا بہار پھول اپنے دامن میں لیے ہوتی ہیں ان مفید تحریکوں میں ایک جدید ترین تحریک بچوں کے کتاب خانے کا قیام ہے جس کی ابتدا بتارہی ہے کہ وہ انشاء اللہ اپنے گوناگوں مقاصد کے اعتبار سے تعلیمی وتہذیبی مشن کا ایک خاموش مگر پرکار اور بصیرت آفریں ادارہ ثابت ہو گا اور رام پور کی نئی پود کے لیے ایک شاندار مستقبل کا پیش خیمہ۔

جس طرح بچوں کے معیاری نشو و نما کے لیے اچھی غذا اور جسمانی ورزش کی ضرورت ہے اسی طرح ان کی دماغی وذہنی اصلاح وترقی کے لیے کتاب بینی کی حاجت ہے کوئی مہذب ومعقول دماغ کتاب کا شرمندۂ احسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے کتاب ایک خاموش مگر سچے مشیر کی طرح اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ ذہنی کثافتوں اور آلائشوں کی بیخ کنی کرتے ہوئے عاقبت اندیشی اور معاملہ فہمی پیدا کرتی ہے جو بتدریج مکمل ہوکر انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بنا دیتی ہے اس لیے ایک شائستہ اور اعلیٰ قوم بنانے کے لیے بچوں کے کتاب خانے قائم کرنا ضروری ہیں جہاں بچوں کے دل ودماغ کے لئے دلچسپ کہانیوں اور رسیلی نظموں کی شعوری اور ذہنی غذائیں اور تہذیب واخلاق کے الوان نعمت سجائے جاتے ہیں۔ ریاست کے تمام تعلیمی اداروں کے طلبہ کے واسطے ایک مرکزی بچوں کا کتاب خانہ اپنی قسم کا سب سے پہلا مصلحانہ ادارہ ہے۔

فی الحال یہ مفید تحریک نہایت چھوٹے پیمانے پر چلائی جارہی ہے لیکن قوی امید ہے کہ مستقبل قریب میں بچوں کا کتاب خانہ اپنی نوعیت کا سب سے بڑا کتاب خانہ ثابت ہوگا جس کے ساتھ ایک قابل دید میوزیم اور دارالمطالعہ بھی ہوگا۔ معقول مناسب عمارت دستیاب نہ ہونے کے باعث عارضی طور پر ایک چھوٹی سی عمارت میں اس کا آغاز کیا گیا ہے۔

اس مفید تحریک کا افتتاحی جلسہ ۱۳ مئی ۱۹۴۶ء کو نہایت تزک واحتشام سے منعقد ہوا جس کی صدارت مرشدزادہ آفاق نواب شہزادہ سید مرتضیٰ علی خاں صاحب بہادر ولی عہد ریاست نے فرمائی عالی مرتبت مرزا ناصر الدین صاحب چیف سکریٹری اور شہر کی محترم خواتین معتقد رعائدین رؤسا افسران واساتذہ صاحبان محکمۂ تعلیمات وطلبہ ودیگر سرپرست حضرات نے شرکت فرمائی۔

جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ پروگرام کے شروع میں عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین بہادر مشیر تعلیمات نے بصیرت افروز تقریر فرمائی اور تحریک کے "مالہ وماعلیہ" پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ محکمہ تعلیمات نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ اپنے پلیٹ فارم پر رام پور کی مختلف جماعتوں کے اس قسم کے علمی اور ادبی جلسے منعقد کرے جن میں شریک ہوکر ہر خیال اور ہر عقیدے کے لوگوں میں وحدت فکر

بنیاد پڑسکے جو رفتہ رفتہ اعلیٰ مجلس اتحاد کی شکل اختیار کرلے اور اس طرح عہد حاضر کی تمام ترقیوں کے ساتھ افراد کے دماغوں میں تازہ بتازہ روشنی پیدا ہو سکے وہ زندگی کی نئی قدروں سے واقف ہوں اور زندگی کی جد و جہد میں تمدن جدید کے اسلحہ سے آراستہ و پیراستہ نظر آئیں تقریر کے آخری حصہ میں آپ نے صدر عالی وقار (مرشدزادہ آفاق نواب ولی عہد بہادر) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ نے بچوں کی تمناؤں کے ساتھ گہری موافقت فرمائی ہے اور امید ہے کہ آپ کی آیندہ قیادت و حمایت سے یہ چھوٹا سا پودا ایک بار آور درخت ثابت ہوگا

اس کے بعد بچوں نے اپنا متنوع اور دلچسپ پروگرام پیش کیا جو مفید معلوماتی ادبی مقالوں مضاحیہ مضمونوں مکالموں اعلانوں عمدہ نظموں اور سبق آموز ڈراموں پر مشتمل تھا۔ اس میں بعض چیزیں خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ مثلاً بچوں کا تمثیلی مشاعرہ ڈراما "آخری سبق" "بچوں کے انوکھے جواب" چچا چھکن۔ مضمون بطرس طلبہ کے کورس اور فارسی تقریر۔

تمثیلی مشاعرہ کے بعد عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر بہادر نے اپنی عالمانہ تقریر میں محکمۂ تعلیمات کی تحریکوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اور بچوں کے کتاب خانے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا "جس طرح ان بچوں کو صدر محترم جیسی معروف و نمایاں شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے اسی طرح ان کی عمارت کو بھی امتیازی شرف حاصل ہوگا" آپ نے وعدہ فرمایا کہ "حکومت رامپور اس کتاب خانے کے لیے شایان شان عمارت کا انتظام کرے گی"۔ آپ نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ جلسے کی کامیابی کا سب سے اہم مظاہرہ حضور عالی (صدر جلسہ) کی تشریف آوری ہے"۔

عالی مرتبت وزیر اعظم کی تقریر کے بعد جناب مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتاب خانہ سرکاری نے ولولہ خیز تقریر فرمائی کتاب خانوں کے قیام کی ضرورت اور کتاب بینی کے فوائد پر روشنی ڈال کر آپ نے طالب علمانہ زندگی کے پرورش خیالات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "مجھ میں مدرسہ کی تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنی علمی برتری اور استادوں سے بھی فوقیت کا غلط احساس پیدا ہو گیا تھا اور وہ اس وقت دور ہوا جب مجھے سرکاری کتاب خانے میں کتابوں کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا" عرشی صاحب نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ "ہماری دماغی اور صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان قوتوں کو غذا پہنچانے کا بہترین ذریعہ کتابوں کی سیر ہے اور یہ کام کتاب خانوں کے قیام اور ان کے استعمال سے پورا ہو سکتا ہے"۔

عرشی صاحب کے بعد مرشدزادہ آفاق نواب ولی عہد بہادر نے فاضلانہ تقریر فرمائی جو اپنی نوعیت اور اہمیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

حاضرین نے مغرب کی نماز کے وقفہ میں جبکہ رسم افتتاح ادا ہوئی اس چھوٹی سی نمائش کا دلچسپی سے معائنہ فرمایا جو محکمۂ تعلیمات کی طرف سے ترتیب دی گئی تھی نمائش میں بچوں کے کتاب خانے کی دیدہ زیب کتابوں رسالوں

اخباروں خوشخطی کے نمونوں اور رنگین تصویروں اور اسکولوں سے آئی ہوئی عمدہ عمدہ چیزوں کو نہایت سلیقہ سے لگایا گیا تھا جلسہ ختم ہونے کے بعد بھی لوگ کثیر تعداد میں نمائشی اشیا کو ملاحظہ فرماتے رہے بجلی کی روشنی اور لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے حاضرین نے پروگرام کا پورا پورا لطف اُٹھایا۔

(ہیڈ ماسٹر باقر اسکول)

سرکلر محکمۂ تعلیمات

بابت پرائیوٹ ٹیوشن

سا نے محکمۂ تعلیم کے تمام مدرسین کے متعلق حال ہی میں یہ امر دریافت کیا تھا کہ ان میں سے کون کون حضرات پرائیوٹ ٹیوشن کرتے ہیں، ایسی ٹیوشنوں اور طلبہ زیر تعلیم کی تعداد کیا ہے اور وہ اس کام میں روزانہ کتنا وقت صرف کرتے ہیں۔ موصولہ رپورٹوں سے جو صورت حال میرے علم میں آئی ہے اس کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں صریح ہدایات استادوں کی ہدایت کے لیے جاری کر دی جائیں تاکہ آئندہ افسران متعلقہ کی نگرانی میں ان پر احتیاط کے ساتھ عمل کیا جائے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ مدرسوں کی ایک بہت بڑی تعداد، خصوصاً شہر اور تحصیلات کے صدر مقام پر، علاوہ مدرسے میں تعلیم دینے کے پرائیوٹ طور پر طلبہ کو پڑھاتے ہیں اور جہاں بعض استاد صرف ایک طالب علم کو پڑھاتے ہیں وہاں ایسے استاد بھی ہیں جو بیک وقت پانچ چھ ٹیوشن تک رکھتے ہیں جن میں طلبہ کی تعداد ایک درجن سے بھی زیادہ ہے!۔ یہ بات کئی لحاظ سے قابل اعتراض ہے۔ اول تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسوں میں پڑھائی اس قدر ناکمل یا والدین کے نقطۂ نظر سے ناکافی ہوتی ہے کہ وہ پرائیوٹ تعلیم کا انتظام ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ مدرسے کی تعلیم پر ایک ایسا الزام ہے جس کو دور کرنے کی ہیڈ ماسٹر اور ہر استاد کو کوشش کرنی چاہیئے۔ میرے خیال میں اکثر اوسط قابلیت کے بچوں کو مدرسے میں پڑھنے کے بعد گھر پر استادوں سے پڑھنے کی ضرورت ہی نہ ہونا چاہیئے اور اسکول کے کام کی تنظیم اس طرح کرنی ضروری ہے کہ انھیں یہ سہارا نہ لینا پڑے۔ دوسرے، جو استاد دن میں کئی کئی گھنٹے مدرسے کے وقت کے علاوہ اس کام میں صرف کرتے ہیں ان سے یہ توقع رکھنا بیکار ہے کہ وہ اپنا مطالعہ اور تعلیمی تیاری جاری رکھ سکیں گے۔ جب ان کی فرصت کا بیشتر وقت اس کام میں صرف ہو جائے گا تو وہ تعلیمی کتب مطالعہ اور اسباق کی تیاری کیسے کر سکتے ہیں؟ لہٰذا فنی ترقی کے خیال سے بھی یہ طریقہ مستحسن اور مفید نہیں۔ تیسرے اس طریقے میں یہ اندیشہ ہے کہ طلبہ اپنے اوپر اعتماد کرنے اور مدرسے کے کام میں پوری دلچسپی لینے کے بجائے پرائیوٹ استادوں پر بہت زیادہ بھروسا کرنے لگتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ امتحان میں ان سے نامناسب

مراعات کی توقع کرتے ہیں جو اخلاقی اعتبار سے قابل اعتراض ہے۔ ٹیوشنوں پر زیادہ وقت صرف کرنے کا ایک بہت بُرا نتیجہ جو میرے مشاہدے اور علم میں آیا ہے یہ ہے کہ بعض استاد اپنے دوسرے منصبی فرائض کی طرف سے غفلت اور پہلوتہی کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ جب انہیں کسی ایسے کام پر لگایا جاتا ہے جس میں زیادہ وقت اور محنت صرف کرنے کی ضرورت ہے تو وہ حتی الامکان اس سے بچنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی ٹیوشنوں میں حرج واقع نہ ہو۔ یہ بات حد درجہ افسوسناک ہے۔ میں ان مالی مشکلات سے بخوبی واقف ہوں جن کی وجہ سے استادوں کو مجبور ہو کر اس قسم کا کام کرنا پڑتا ہے اور اس حد تک یہ شغل ان کے فرائض منصبی کے راستے میں حائل نہ ہو۔ میں آج کل کے حالات میں اس کی اجازت دینے کو تیار ہوں۔ لیکن کوئی محکمہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے کارکن اس حد تک دوسرے تنخواہ یاب کاموں میں شریک ہوں کہ ان کے اصل فرائض کی ادائیگی مشکل ہو جائے۔

ان امور کے پیش نظر استادوں کے ٹیوشن کے متعلق مندرجۂ ذیل قواعد اور ہدایات تمام اطلاع کے لئے جاری کی جاتی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان اور افسران معائنہ کا فرض ہوگا کہ وہ ان کی پابندی کرائیں۔

۱۔ ہر ادارے میں ایک رجسٹر رکھا جائے گا جس میں تمام استادوں کے نام، ٹیوشنوں کی تعداد اور وقت اور طلبہ کے نام درج ہوں گے اور اس میں وقتاً فوقتاً حسب ضرورت اندراجات کیے جائیں گے۔ معائنہ کے وقت افسران معائنہ اس رجسٹر کی پڑتال کریں گے۔

۲۔ ہر استاد کو ٹیوشن کرنے سے پہلے افسر مجاز کی تحریری اجازت لینی ضروری ہوگی۔ پرنسپل صاحب کالج، ہیڈ ماسٹر صاحبان ثانوی مدارس اور انسپکٹر صاحب مدارس اس بات کے مجاز ہوں گے کہ اپنے ماتحت مدرسین کو ایک ٹیوشن کرنے کی اجازت دیں۔ خاص خاص حالات میں اگر کسی استاد کا دو ٹیوشن لینا ناگزیر ہوگا تو وہ اس امر کی سفارش مجھ سے کریں گے اور اپنی وجوہ بوضاحت بیان کریں گے۔ دوسری ٹیوشن بغیر میری خاص اجازت کے نہیں لی جا سکے گی۔ دو سے زیادہ ٹیوشن لینے کی اجازت کسی حالت میں نہیں دی جائے گی۔

۳۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان ثانوی مدارس اور کالج کے اساتذہ حتی الامکان ٹیوشن لینے سے پرہیز کریں گے لیکن اگر ضروری ہو تو وہ ایک ٹیوشن لے سکتے ہیں۔ انہیں ایک سے زیادہ ٹیوشن لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

۴۔ اگر کوئی استاد ایک ہی وقت میں اور ایک ہی مقام پر دو یا تین ہم معیار طلبہ کو تعلیم دے گا تو اس کو ایک ٹیوشن سمجھا جائے گا۔ لیکن ہیڈ ماسٹران وغیرہ کا فرض ہوگا کہ وہ اس امر کی نگرانی رکھیں کہ اس رعایت سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

۵۔ اگر محکمہ کو کسی وقت بھی اس امر کا احساس ہوگا کہ کسی مدرس نے ٹیوشن لینے کی وجہ سے اپنے مفوضہ یا مجوزہ فرائض کے بارے میں غفلت برتی ہے تو ٹیوشن کرنے کی اجازت واپس لے لی جائے گی۔

مجھے امید ہے کہ محکمہ کے تمام استاد اور افسران ہدایات کی پابندی کریں گے اور موجودہ رجحان کی روک تھام میں مدد دیں گے جس کی وجہ سے طلبہ کی تعلیم اور اداروں کی ادائیگی فرض دونوں میں دقتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

دستخط عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب بہادر
مشیر تعلیمات حکومت رام پور

فارم ممبری

نیو ایجوکیشن فیلوشپ (رامپور)

جناب سکریٹری صاحب۔ تسلیم! میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے مقاصد کا حامی ہوں اور اس کا ممبر بننا چاہتا ہوں۔ فیس ممبری مبلغ ایک روپیہ داخلے کے فارم کے ساتھ ارسال ہے۔

دستخط ....

تاریخ ۱۹ء

پورا نام .... معیار قابلیت ....

ساکن ....

پیشہ .... عمر ....

تعلیمی ادارہ جس میں ملازم ہوں .... مدت ملازمت ....

کوئی جدید تحقیقات یا تعلیمی تجربہ ....

میں قرار کرتا ہوں کہ "نیو ایجوکیشن فیلوشپ" کے قواعد کی پابندی اور اُس کے مقاصد کو کامیاب بنانے کی کوشش کروں گا۔

دستخط ....

رجسٹر نمبر ....

دستخط سکریٹری ....

تاریخ ....

محکمہ تعلیم ریاست رامپور کا آرگن



تعلیم جدید

مدیر
مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی علیگ

چندہ سالانہ ... پانچ روپے
فی پرچہ .... آٹھ آنے

جلد۲ — بابت ماہ جنوری ۱۹۴۷ء — نمبر۱

فہرست مضامین

مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے مرتضائی پریس رام پور میں طبع کرا کے شائع کیا

استادوں سے خطاب

تعلیم اور ایک بہتر معاشرے کی تعمیر

ذیل کا مضمون اُس توسیعی خطبہ کا ایک اقتباس ہے جو عالی جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات رامپور نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ماہ مارچ ۱۹۴۶ء میں دیا تھا۔ (ادارہ)

موجودہ زمانے میں تعلیمی بحثیں زیادہ تر ایسے مسائل کے متعلق ہوتی رہی ہیں کہ فرد کی شخصیت کو کس طرح تربیت دی جائے۔ اس کی خوابیدہ قوتوں کو کس طرح بیدار کیا جائے اس کے فطری نقائص کا کس طرح علاج کیا جائے۔ انگلستان کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر نن نے اپنی تصانیف میں بہت عمدگی اور قابلیت کے ساتھ اس نظریئے کی وکالت کی ہے کہ تعلیم کا مقصد اصلی انفرادیت کی تربیت ہے اور اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ افراد کی تخلیقی جدوجہد کے بغیر دنیا میں حسن، خیر اور صداقت کا کوئی جلوہ داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ دعوےٰ صحیح ہے اور اس نازک دور میں جب بہت سے اجتماعی خطروں اور کلی تحریکوں نے فرد کو یورش میں لے لیا ہے۔ انفرادیت کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ لیکن باوجود اس اعتراف کے میں یہ خیال پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ بغیر سماج کی زندگی اور اس کے گوناگوں مطالبات اور مسائل پر غور کئے ہم نہ فرد کے متعلق کوئی نیک رائے قائم کر سکتے ہیں نہ اس کی تعلیم و تربیت کے لئے کسی موزوں اور مؤثر ماحول کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ سوسائٹی کی اجتماعی زندگی میں ہر وقت مختلف قوتوں اور اثرات کی رسہ کشی ہوتی رہتی ہے اس میں بے شمار نقیضیں کارفرما ہیں۔ مثلاً فرد اور جماعت، میراث اور تربیت، ضبط اور آزادی، حقوق اور فرائض، مادی مطالبات اور روحانی قدریں، علم اور اخلاق، دولت اور افلاس۔ لہٰذا جب ہم فرد کی تربیت کا انتظام کرتے ہیں تو اس کو کسی سماجی خلا کے لئے تیار نہیں کرتے بلکہ اس سماجی زندگی کے لئے تیار

تیار کرتے ہیں جس کا لباس ان تمام اثرات کے تانے بانے سے تیار ہوا ہے، اس لئے تعلیمی کارکنوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے ماحول کا تجزیہ کرکے یہ اندازہ کریں کہ اس میں کون سے عناصر ہیں جو فرد کی آزاد اور مکمل نشو و نما میں مخل ہوتے ہیں۔ اور کون سے اس کے لئے مفید اور سازگار ہیں لیکن اُن کے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ ایک غیر جانب دار سائنس داں کی طرح موجودہ سماج کا تجزیہ کریں انہیں تو ایک بہتر سماج کی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسکول کی چار دیواری کے اندر اس خوب تر سماج کا ایک چھوٹا سا مرقع تیار کرنا ہے اس لئے معلم کے ذہن میں یہ بات بھی واضح ہونی چاہیئے کہ مستقبل کے سماج میں کون سی قدریں اور اصول کارفرما ہوں گے اور اخلاقی اور افادی اعتبار سے کارفرما ہونے چاہئیں تاکہ مدرسے کے اثرات اُن کی تخلیق میں معین ہوں۔

بعض لوگ جن کا نعرہ یہ ہے کہ تعلیم کو سیاست سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہیئے اس خیال سے بھڑکتے ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ ایسا کرنے سے تعلیم اپنے پُر امن گوشۂ عافیت سے نکل کر میدانِ کارزار اور حلقۂ نزاع میں پہنچ جائے گی۔ اور اس طرح کہ اس کے خاموش اور سکون طلب تعمیری کام میں خلل پڑے گا۔ جو لوگ خلوص اور نیک نیتی سے یہ اعتراض کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں ہر وقت مختلف اصول اور قدریں، توہمات اور تعصبات انسانی زندگی پر تسلط حاصل کرنے کے لئے برسرِ پیکار ہیں اور یہاں قدم قدم پر خوب و ناخوب کی تمیز ضروری ہوتی ہے ایسی حالت میں تعلیم کا غیر جانب دار رہنا، یعنی اس کشمکش کو نظر انداز کردینا غیر مفید ہی نہیں ناممکن بھی ہے اس کے لئے لازم ہے کہ موجودہ نظام کی ساخت کو قبول کرے یا مسترد کرے یا اس کی ترمیم کرے اور نئی بنیادیں رکھنے کے لئے تو اکثر پرانی بنیادوں کو اکھیڑنا پڑتا ہے! ان میں سے بعض معترضین ایسے بھی ہیں جو قصداً اور مصلحتاً یہ روش اختیار کرتے ہیں کیونکہ ان کے اغراض و مقاصد اور مصلحتیں مروجہ نظامِ معاشرت اور اس کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں اس کی بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کی بدولت انہیں اپنی ذات کے لئے جلبِ منفعت کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا ہے اس لئے وہ اس میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں اور جب وہ تعلیم کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں تو اُن کا دراصل یہ مطلب ہوتا ہے کہ تعلیم کو کسی قسم کی بنیادی تبدیلی یا انقلاب کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے ورنہ مروجہ اصولوں اور سماجی اداروں کی حمایت تو نظامِ تعلیم بلا ارادہ بھی کرتا ہے اور اکثر استادوں اور پبلک کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر کسی سرمایہ داری

نظام میں تاریخ جغرافیہ، اقتصادیات وغیرہ کی تعلیم میں ان مصروفیات کو جگہ دی جائے جو اس نظام میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں یا سوشلسٹ نظام میں ان طریقوں اور اصولوں کی تائید کی جائے جو اس میں رائج ہیں تو عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ تعلیم سیاسی اعتبار سے غیر جانب دار ہے برخلاف اس کے اگر تعلیم کے ذریعے ان اصولوں اور قدروں کی اشاعت کی جائے جن کو عام لوگ یا مفاد مخصوص جن کو قوت و اختیار حاصل ہے اس وقت قبول نہیں کرتے تو فوراً تعلیم پر جنبہ داری اور غیر متعلق امور میں دخل اندازی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ معلم کو عقل اور اخلاق کی رُو سے یہ حق حاصل ہے۔ نہ وہ مروجہ نظام کی تنقید کرے اور آزادی رائے کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کرلے کہ خیالات کی جو جنگ اس کے چاروں طرف ہو رہی ہے اس میں وہ کس کا ساتھ دے گا۔ میں نے عمداً کس فریق کا ساتھ دے گا نہیں کہا کیونکہ تعلیم کا کام حق اور شرافت کی طرف داری ہے نہ کہ سیاسی جماعت یا عقیدے کے ساتھ وابستہ ہونا۔ آج کل کی پیچیدہ زندگی میں حق اور صداقت میں کسی خاص سیاسی جماعت کی مکمل اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض جماعتوں کی پالیسی دوسروں کی نسبت زیادہ ترقی پسندانہ اور بحیثیت مجموعی انسان کیلئے زیادہ مفید ہے لیکن ہر سمجھدار اور انصاف پسند شہری اور ہر معلم کو بالخصوص یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ سیاسی فرقہ بندیوں سے بلند ہو کر حق کا ساتھ دے۔ خواہ وہ اسے کہیں سے جائے یہ نقطۂ نظر ٹھیک ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اسے عام قبولیت حاصل ہونا مشکل ہے کیونکہ اس پر وہ لوگ بھی نکتہ چینی کریں گے جو انقلاب اور تبدیلی کے مخالف اور سماجی جمود کے حامی ہیں اور وہ بھی جو تعلیم کو خاص سیاسی اغراض و مقاصد کا مجہول آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ آزادی رائے میں آزادی تنقید بھی شامل ہے اور یہ لوگ تنقید کے بجائے اندھی تعمیل کے طلبگار ہیں۔ مگر بہرحال جو لوگ تعلیم کا کٹھن فرض اپنے ذمے لیتے ہیں انہیں جان بوجھ کر یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ بیشک معلم کی دولت ہر کس و ناکس کی رضامندی نہیں۔ سچ کا ساتھ دینا ہے۔

اس ضمن میں ایک بات کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ مدرسوں کا کام براہِ راست کسی خاص سیاسی یا سماجی یا اقتصادی عقیدے کی تبلیغ کرنا ہے ایسا کرنے سے طلبا کے ذہن پر ابتدا ہی سے بعض خاص قسم کے خیالات کا تسلط قائم ہو جائے گا اور ان کی آزادی فکر کی صلاحیت نشو و نما نہ پا سکے گی۔ جو ذہنی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ میری رائے میں یہ بات کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی کہ کسی نیت سے بھی تعلیم کے ذریعے طلبہ کے دماغی

دریچوں کو بند کر دیا جائے۔ جب تک ان میں غور و فکر کے بعد زندگی کے اہم انفرادی اور اجتماعی مسائل کے متعلق صحیح اور بے لاگ رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہ ہوگی اندیشہ یہ ہے کہ وہ ہر چالاک عقیدہ فروش اور سیاسی بازی گر کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ لہٰذا مدرسہ کا اصل کام یہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر کے لئے طلبہ کو صحیح معلومات اور صحیح قدروں کا سرمایہ اور تلاش حق کا جذبہ عطا کرے۔ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ اگر ان میں عقل کی کمی ہوگی یا تلاش حق کا جذبہ نہ ہوگا جس کے ذریعہ صحیح معلومات حاصل کی جاتی ہیں تو وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے اور ان کی ذہنی کیفیت اندھیرے میں تیر چلانے کی ہوگی۔ اگر ان کے دل میں صحیح قدروں کا احترام نہ ہوگا تو وہ اپنے دماغی قابلیت کا غلط اور نقصان دہ استعمال کریں گے اور اخلاقی کجروی میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا جب میں تعلیم سے معاشرتی رہبری کی توقع کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ نوجوانوں پر کوئی بنا بنایا نظامِ فکر و عمل زبردستی عائد کر دے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ ان کو ترقی پسند خیالات اور شریفانہ جذبات کی دولت سے مالا مال کرے تاکہ وہ آگے چل کر ایک بہتر سماج کی تعمیر میں شریک ہو سکیں۔

یہ تمہید کسی قدر طولانی ہو گئی لیکن چاہتا تھا کہ ابتدا ہی میں نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے اب ہمیں مختصر طور پر یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ نظامِ معاشرت کی امتیازی خصوصیات کیا کیا ہیں اور اس میں کون سے خاص اثرات اور رجحانات کام کر رہے ہیں جو اس کو آئندہ شکل دینے میں کارگر ہوں گے۔ معلم بھی بڑی حد تک اپنے گرد و پیش کے معاشرتی وسائل اور ذرائع اور محرکات ہی سے کام لیتا ہے اس کے لئے ان سے قطع نظر کر کے تربیت کرنا ناممکن ہے اور اگر ممکن بھی ہوتا تو یہ تربیت بالکل ناقص یا بے اثر رہتی۔ تعلیم دراصل انھیں تمام اجتماعی اثرات کا ایک جزو ہے اور اس جزو کو کل کے پسِ منظر میں رکھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہماری موجودہ سماج کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کی رفتار بہت بڑھ گئی ہے اور زندگی جو سو سال پہلے تک بالعموم ساکن یا سست رفتار تھی۔ انقلاب کے بھنور میں آ پھنسی ہے۔ اب صدیوں کی تبدیلیاں چند سال کے اندر اندر ہو جاتی ہیں اور ان کی باگ اتفاق کے بجائے ارادہ نے تھام لی ہے، سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے انسان کو فطرت کی غلامی اور بے بسی کی منزل سے نکال کر مختارِ فطرت بنا دیا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایسی بے اندازہ قوت دیدی ہے کہ وہ اس کی خوفناک طاقتوں کو تسخیر کر کے اپنے ماحول اور

اپنی زندگی کو بالارادہ ایک نئے سانچے میں ڈھال سکتا ہے وہی انسان جو چند صدی پیشتر فطرت کے حضور میں ایک خوف زدہ سائل کی طرح حاضر ہوتا تھا اور اس کے رازوں کی دریافت کے لئے حسنِ اتفاق کا مرہونِ منت تھا۔ اب خود اعتمادی کے ساتھ ان کی تلاش کرتا ہے اور انہیں اپنے مقاصد کی تحصیل کے لئے بے دھڑک استعمال کرتا ہے اس کے جو عجیب وغریب نتائج نکلتے ہیں اور ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لہٰذا ان کی تفصیل سے کیا حاصل ہے؟ اس کی بدولت انسان نے خشکی، ہوا اور پانی کو تسخیر کرکے دنیا کی طنابیں ملا دی ہیں اور مہینوں کے رستے پلوں میں کٹنے لگتے ہیں۔ زراعت، صنعت وحرفت اور پیداوار کے ہر شعبے میں اس کی قوت سیکڑوں گنا بڑھ گئی ہے۔ نئی ایجادوں اور دریافتوں نے خیال کے پر لگا دئے ہیں۔ اور ہر نئی بات چشم زدن میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہونچ جاتی ہے اور یہ تبدیلیاں محض زندگی کے خارجی اداروں تک محدود نہیں بلکہ انسان کی داخلی زندگی پر بھی ان کا اتنا ہی گہرا اثر پڑا ہے ان کے ردِ عمل سے پرانے رسم ورواج اور پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں خاندانی اور جماعتی زندگی کے وہ ادارے جن سے ماضی میں لوگ ایسے ہی اعتماد کے ساتھ واقف تھے جیسے کسی پہاڑ کے دامن میں رہنے والے اس کے خدوخال سے واقف ہوتے ہیں اس قدر تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ ذہن اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ زندگی کا دھارا جو صدیوں سے ایک خاص سکون اور وقار کے ساتھ بہتا تھا۔ اب دکن کے دریاؤں کی طرح بہت تیز رفتار ہو گیا ہے اور کٹھن پہاڑی رستوں سے گذرنے لگا ہے آیئے دیکھیں کہ اس انقلاب کا اثر افراد پر کیا ہوا ہے

زمانۂ ماضی میں اکثر رسوم ورواج خیالات وعقائد، اصول اور قدریں کم وبیش غیر محسوس طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتی تھیں ایک ایسے سماج میں جہاں بحیثیت مجموعی سکون ایک عمومی کیفیت ہو اور انقلاب ایک غیر معمولی بات ہو یا اس قدر آہستہ آہستہ ہوتا ہو کہ لوگوں کو اس کا احساس بھی نہ ہو۔ تقلید کی رہبری شاید کام دے سکتی ہے لیکن جب زندگی میں ہر طرف حرکت اور انقلاب کا قانون کارفرما ہو، جہاں سفر حقیقت ہو اور حضر مجاز ہو۔ جہاں انسان کا ناخنِ عقدہ کشا اور اس کی عقل رسا آئے دن نت نئے مسائل پیدا کرتی ہے۔ وہاں ہم تقلید اور عادت کے سہارے نہیں چل سکتے وہاں تقلید کے بجائے اجتہاد اور عقیدے کے بجائے فکر کی روشنی درکار ہے اس جدید سماج میں ہمیں قدم قدم پر ایسے دورا- ملتے ہیں جن میں سے ایک کو ہمیں اختیار کرنا ہے اور اگر ہم خود غور وفکر کے بعد اسے اختیا

کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو کوئی اتفاقی ریلا ہمیں اٹھا کر کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے۔ لہٰذا زندگی کی اس یورش کا مقابلہ ہم مروجہ عقاید اور خیالات سے مسلح ہو کر نہیں کر سکتے۔ اور اس بھول بھلیاں میں پرانے زمانے کے بہت سے بنے ہوئے نقشے کام نہیں دیتے اس لئے اس زمانے میں فرد پر پہلے کی نسبت بہت زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور تعلیم اس جدید تقاضے کی طرف سے روگردانی نہیں کر سکتی۔

اس صورتِ حال کا مطالبہ تعلیم کے لئے کیا ہے۔؟ ظاہر ہے کہ ایک انقلاب پذیر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے جو تعلیم دی جائے گی اسمیں ہمیں عقل و فکر کی تربیت پر خاص زور دینا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر اس متحرک سماج میں فرد اپنا توازن قایم نہیں رکھ سکتا نصاب اور طریقہ تعلیم کی تدوین میں ہمیں یہی خیال پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ان کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں کی فکری قوتوں کی نشو و نما ہو۔ ابتدائی مدارس سے لیکر یونیورسٹی تک اس بات کی کوشش ضروری ہوگی کہ طلبہ کے سامنے علم کو ایک چبائے ہوئے لقمے کے طور پر نہ پیش کیا جائے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لئے انہیں خود ذہنی اور عملی جد و جہد کرنی پڑے اور انپر بہت سی معلومات کا بار ڈالنے کے بجائے اُن کو علم حاصل کرنے کے طریقے اور اصول اور ضابطے سکھائے جائیں گے۔ مشاہدے اور تجربے سے کام لینے اور دوسروں کی رائے کو تولنے کی مشق کرائی جائے گی۔ تاکہ وہ ذہنی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اور ہمیشہ خارجی امداد اور سہارے کے محتاج نہ رہیں۔ اس امر پر زور دینا اس لئے ضروری ہے کہ باوجود کتابی تعلیم کے طلسم میں اسیر ہونے کے ہمارے کالجوں اور مدرسوں نے عقل کی تربیت پر کافی زور نہیں دیا۔ بلکہ عقل اور اخلاق میں ایک قسم کی غلط نقیض قائم کر کے ہمیشہ اخلاق کو عقل پر ترجیح دی ہے۔ گویا اپنی اور دنیا کی نجات کے لئے بے سوچے سمجھے بعض خاص اعمال کا یا اخلاقی فرایض کا بجالانا کافی ہے۔ اور اس میں عقل کو زیادہ دخل دینے کی ضرورت نہیں لیکن یہ خیال غلط ہے اور مشرقی مذاہب اور فلسفے نے بھی کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی۔ "بدھ مت" نے حماقت" کو جس کے لئے اس میں ناواقفیت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ انسانی گناہوں کی فہرست میں بہت اونچا درجہ دیا ہے۔ اور قرآن شریف میں اُن لوگوں کی صریح مذمت کی گئی ہے جو خدا کی دی ہوئی ذہنی قوتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے اُن کے دل ہیں۔ لیکن وہ سمجھتے نہیں

آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں۔ کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں۔ وہ حیوانوں جیسے ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر۔ وہ راستے سے بالکل بھٹکے ہوئے ہیں۔

لہٰذا ہماری موجودہ معاشرتی صورتِ حال اور اخلاق و مذہب کا متفقہ مطالبہ یہی ہے کہ ہم اپنی تعلیم میں قوتِ فکر کی تربیت کو خاص اہمیت دیں اور نوجوانوں میں ایسی ذہنی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ عصرِ حاضر کی دشوار زندگی میں اپنا راستہ ڈھونڈھ نکالیں۔ میرے پاس وقت نہیں کہ میں یہ بتا سکوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے سے ہماری تعلیم میں کس قدر زبردست انقلاب ہوگا لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سا وہ ناکارہ و فرسودہ اور بے معنی سامان دریا بُرد کرنا ہوگا جس سے ہمارا تعلیمی جہاز اس وقت اٹا ہوا ہے۔

مشیر تعلیمات رام پور کی مراجعت

عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب بہادر مشیر تعلیمات یونسکو کانفرنس کی شرکت کے بعد فرانس سے دسمبر کے تیسرے ہفتے میں رام پور واپس تشریف لائے ہیں۔ ادارہ تعلیم جدید نے موصوف کی خدمت میں گذارش کی ہے کہ وہ اس بین الاقوامی کانفرنس کی کارروائی اور اپنے تاثرات رسالۂ ہٰذا کیلئے مرحمت فرمادیں۔ ناظرین کرام اس اہم موضوع کو تعلیم جدید کی کسی قریبی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

تعلیمی مضامین

تعلیمی نمائش کا افتتاح

جامعہ جوبلی کی تمدنی اور تعلیمی نمائش کا افتتاح اعلیٰحضرت بندگان حضور پُرنور دام اقبالہم و ملکہم فرمانروائے ریاست رام پور نے فرمایا۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

(ادارہ)

اعلیٰحضرت۔ میرے لئے باعث صد افتخار اور درجہ ہزار مسرت ہے کہ آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام کارکنوں استادوں، اور طالب علموں کی طرف سے جامعہ کی اس ناکمل اور ہونہار بستی میں آپ کا خیر مقدم کر رہا ہوں۔

مجھے اس وقت وہ دن یاد آتا ہے جب سرکار بحیثیت ولی عہد رام پور آج سے کوئی بیس سال پہلے جامعہ کے بانی اور اول امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم و مغفور کے ہمراہ جامعہ کے کام کو ملاحظہ فرمانے تشریف لائے تھے۔ جامعہ اس وقت تھوڑے سے طالب علموں کی مشتمل تھی۔ قرول باغ میں کرایوں کے مکانوں میں چند نوجوان تعلیم کا ایک مشکل تجربہ کر رہے تھے۔ ان کے کام کو نہ تعلیمی حلقوں میں کوئی اعتبار حاصل تھا نہ سرکاری دفاتر میں، ان کے پاس نہ ساز و سامان تھا نہ زر و مال۔ مجھے یاد ہے کہ سرکار کی تشریف آوری پر گرد و غبار کو دبانے کے لئے بچوں کے کاموں کو سجا کر رکھنے کے لئے ہم نے کیا کیا جتن کئے تھے اور پھر بھی ہزار رفوگری اس جامعہ بے سر و سامانی کے بے شمار سوراخوں سے ہمارا افلاس اور ہماری ناتجربہ کاری جھانکتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ سرکار کی ژرف نگاہی نے انھیں سوراخوں سے ہماری ہمتوں اور ہمارے حوصلوں کو بھی بیتابانہ سر نکالتے دیکھا ہوگا، اس مشکل زمانہ میں ہمیں اطمینان تھا کہ حکیم صاحب ہمارے سرپرست ہیں، ہندوستان کا کون امیر اور کون غریب ہے کہ ان کے کہنے پر اور ان کے اعتماد پر ہمارے لئے ضروری وسائل فراہم نہ کردے گا۔ تھوڑے دن کی آزمائش پھر راستہ صاف ہے، لیکن قدرت کا

تھا کہ یہ آزمائش ہم نام کارکنوں کی تربیت کا سامان بنے ۔ اس لئے حکیم صاحب کا سایہ ہمارے سر سے یکا یک اٹھا لیا گیا ۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے ہمارے کام کی باگ سنبھالی ۔ مگر جلد ہی، انھوں نے بھی ہمیں اس آزمائش میں چھوڑ کر داعیِ اجل کو لبیک کہا ان سرداروں سے محروم ہو کر ہم نے جو کھویا اُسے سرکار سے زیادہ کون جانتا ہے لیکن سرکار آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ جامعہ کے اس کام کرنے والوں نے اس آزمائش سے مُنہ نہیں موڑا اور انھیں اپنی محنت کا انعام بھی یہ ہے کہ ان کی حق سے زیادہ ملا، اور یقین ہے کہ اور ملے گا ۔ آپ جیسے روشن خیال اور بیدار مغز والیانِ ریاست نے بھی ان کی سرپرستی فرمائی ۔ اور بلا شرط انھیں لاکھوں مرحمت فرما کر اُن کے کام کو سہل بنانے میں مدد دی ۔ اور ان غریبوں نے بھی حنفیوں نے اپنی اٹھنیوں، چونیوں اور روپیوں سے ماہ بماہ اور سال بہ سال انہیں اس ہمت افزا بات کا یقین دلایا کہ ان کے کام کی جڑیں قوم کے سوادِ اعظم میں جمتی جاتی ہیں اور یہ ۲۵ سال گذر ہی گئے ۔ اس میں ایک خاصا ترقی پسند تعلیمی ادارہ وجود میں آ گیا ۔ اُسے کچھ کچھ شہرت بھی حاصل ہوئی اس کا کچھ کچھ اثر بھی بڑھا، مبالغہ آمیز تعریفیں بھی ہوئیں مبالغہ آمیز تنقیدیں بھی ۔ ملک میں وہ اصلاح تعلیمی کا نقیب سمجھا جانے لگا اور ملک کے باہر بھی لوگوں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں لیکن اس میں کسی بے جا خاکساری کو دخل نہیں ۔ جب سرکار کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ہم کارکنوں کو اپنی تعریفیں سُن کر بڑی حیرت ہوئی ہے کہ ابھی تو کام کا آغاز بھی بمشکل ہوا ہے ۔ کام از سرتا پا نقائص سے پُر ہے اور پھر اس پر یہ تعریفیں ۔ خیال آتا ہے کہ یا اللہ کیا تعلیمی کام کا ملک میں یہ حال ہے کہ یہ چھوٹا سا کام اسی تعریف کا مستحق سمجھا جاتا ہے ۔ کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ تحسین کسی کوتاہی کی سزا تو نہیں ہے ۔ کہ کئے پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہنا اور ترقی کا حوصلہ چھوڑ دینا زندہ انسان کی سب سے بڑی سزا ہے ۔ جامعہ کے کام کرنے والوں کی دلی دعا ہے کہ وہ اس سزا کے مستحق کبھی نہ قرار دئے جائیں، ان کا کام ناقص ہو تو ہوا اور ضرور ہو گا مگر ان کے دل میں برابر ہو جستجو کہ خوب سے ہو خوب تر کہاں ۔ میرا گمان ہے کہ ہماری یہ دعا مقبول ہوئی ہے ۔ ہم نے اپنے ناقدوں سے بھی زیادہ اپنے عیبوں پر نظر رکھی ہے ۔ اور آج کہ اس دشوار کام پر ۲۵ سال گذر چکے ہیں ۔ ہمیں اپنے نقائص کا پورا احساس ہے اور انھیں دور کرنے کا پکا ارادہ اور جو ہم کل تک ان پچیس سال کی مشقتوں سے کچھ تھکے تھکے سے تھے ۔ آج پھر تازہ دم ہو کر اپنی کمیوں کو پورا کرنے اور راہِ ترقی پر آگے قدم بڑھانے کا عزم کرتے ہیں ۔ یہ جوبلی ماضی پر فخر کرنے کا جشن نہیں ہے بلکہ مستقبل کے عزم کا ایک موقع ہے ۔ خدا ہماری مدد فرمائے ۔ اعلیحضرت نے اس جشنِ سیمیں کا افتتاح فرمانے کی

درخواست کو قبول فرما کر ہم کارکنانِ جامعہ پر کہ پہلے سے کچھ کم مرہونِ منت و کرم نہ تھے، بڑا ہی احسان فرمایا ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس موقع پر اپنے ساتھیوں کی طرف سے آپ کو اُن کی کیفیتِ ذہنی سے آگاہ کر دوں۔

اس جشن کے آغاز کے ساتھ سرکار سے یہ التجا بھی ہے کہ آپ کے سامنے جو نمائش ترتیب دی گئی ہے اس کا افتتاح بھی اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں۔ یہ نمائش دو حصوں پر مشتمل ہے ایک حصے میں وہ چیزیں ہیں جن سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک کی زندگی میں اپنی کاوش سے کیا کیا۔ اور کیسے کیسے اضافے کئے اسے کیسے سنوارا اور سجایا اور چمکایا۔ یہ ہندوستان میں اسلامی تمدن کے بے پایاں خزانہ سے مٹھی بھر چیزیں ہیں جن سے ہمارا ذوقِ حسن و جمال اور علوم و فنون اور معاشرت میں ہمارے اسلاف کے کارنامے جھلکتے ہیں۔ اچھے انسان اپنے ماحول کو کبھی اس کی جامد حالت پر نہیں رہنے دیتے۔ اسے بہتر بناتے ہیں اس لئے کہ خود ان کو روحِ پاک کی کیفیات زنگا رنگ اپنے کو اس ماحول میں شکل کرنے کے لئے بیتاب ہوتی ہیں۔ یہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں قوم اپنی ذہنی قوتوں کا عکس دیکھ سکتی ہے اور اپنی تحصیلات کے علم اور ان پر تنقید سے ترقی کے ولولہ کو نشو و نما دیتی ہے۔ ہماری قوم نے ہندوستان کی ساری فضا اپنی روحِ پاک سے عکس جہاں آرا سے آئینہ خانہ بنا دیا تھا، اس کے بہت سے شیشے ٹوٹ گئے ہیں۔ لیکن جو کچھ اب بھی باقی ہے اس میں بھی دیکھنے والے اس ندرتِ فکر و عمل، ان تمناؤں اور ولولوں، ان حوصلوں اور ان خدمتوں، پاک اندیشیوں اور پاک نیتوں کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں، جن کے اثر سے اس برِ اعظم کی فضا کے سارے ارتعاشات میں ایک دل آویز رنگینی ہے۔

دوسرے حصے میں اس نمائش کے جامعہ کے بچوں اور طالب علموں اور مختلف شعبوں کے بعض کاموں کے نمونے آپ کے سامنے آئیں گے۔ یہ دونوں چیزیں ایک نمائش میں اس لئے یکجا کر دی گئی ہیں کہ اِن دونوں میں وہ تعلق ہے جو زمانے کے تسلسل میں۔ ماضی اور حال اور مستقبل کے درمیان ہوتا ہے۔ تمدن آفرینی کا وہ کام جس سے مسلمانوں نے ہندوستانی زندگی کے ہر گوشہ کو مالا مال کیا ہے وہ کام ختم نہیں ہوا ہے۔ اپنی تمدنی تفصیلات سے تمدن آفرینی قوتوں کو نشو و نما دینے کا اصل تعلیمی کام بھی ابھی جاری ہے۔ اور یہ قوم خدمتِ انسانیت کے منصب سے ابھی اپنے کو معزول تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اِن چھوٹے چھوٹے منصوبوں میں جن کی تکمیل میں ابھرتی ہوئی کمزور قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اور جن کے بظاہر حقیر نتیجے آج جامعہ کے بچوں کے کام کی شکل میں آپ کے سامنے

آئیں گے، یہ دراصل اس سے بہت بڑے بڑے منصوبوں کا پیش خیمہ ہیں۔ یہ بچے جو چھوٹے چھوٹے منصوبے بناتے ہیں ان منصوبوں کو پورا کرنے کے وسائل تلاش کرتے ہیں ان منصوبوں کی تکمیل میں منہمک ہو جاتے ہیں اور تکمیل کے بعد اپنے کام میں بیگانہ وار تنقید کی قیمتی عادت اپنے اندر پیدا کرتے ہیں، ان چھوٹے چھوٹے منصوبوں سے یہ بچے دراصل بڑے تمدنی کاموں کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ ان کی تیاری ناقص کوششوں کو استادوں اور کاملوں کے شاہکاروں کے پہلو بہ پہلو رکھنے کی جرأت بس اس لئے کی ہے کہ ان کے قوتوں کے سایہ میں ان میں سے بھی استاد اور کامل نکلیں گے اور تمدن آفرینی کا کبھی ختم نہ ہونے والا کام انشاءاللہ جاری رہے گا۔ اور یہ ملک رحمۃ للعالمین کے نام لیواؤں کی خدمت سے پھر ایک بار جنت نشان بن سکے گا۔ انشاءاللہ

معافی چاہتا ہوں سرکار کہ آپ کا اتنا وقت لے لیا۔ بات میں بات نکل آئی۔ مجھے تو صرف اپنی طرف سے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے سرکار کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا تھا کہ آپ نے ہم فقیروں کی محفل میں تشریف لانا منظور فرمایا۔ پھر اپنی تشریف آوری اپنی سرپرستی، اپنی اعانت، اور اپنی ریاست کے قیمتی تعاون سے فقیروں کی اس محفل کا رنگ ہی کچھ اور کر دیا اور تعلیم جیسے روکھے پھیکے کام کی اس انداز سے حوصلہ افزائی فرمائی کہ شاید کچھ دیر کو تو ہم سے زیادہ بھڑک دار کام کرنے والوں کو بھی ہم پر رشک آ جائے۔ ورنہ ہم اس جنگل میں یہ شہر کیسے بساتے جس کی رونق کو آپ نے قدم رنجہ فرما کر دوبالا فرما دیا ہے۔

مجھے صرف ان عنایات شاہانہ پر ہدیۂ تشکر پیش کرنا تھا۔ اور یہ درخواست کرتی تھی کہ جشن سیمیں اور اس نمائش کا افتتاح پر سرکار اپنے ارشادات عالیہ سے ہم سب کو سرفراز فرمائیں۔

ایک علمی بحث

جناب سر عبد القادر صاحب کی ذاتِ گرامی سے علم دوست حضرات اچھی طرح واقف ہیں موصوف نے جامعہ کے جشن سیمیں کے سلسلہ میں تقسیم اسناد کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کا ایک جزو جو آپ کے لئے مفید ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

تقسیم اسناد کی تقریب پر یہ رسم ہے کہ خطیب وقت طلبا کو کچھ نصیحت آمیز باتیں کہتا ہے۔ میرے ذمے بھی یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ میں ان طلبا کے سامنے کچھ نصائح پیش کروں جو اس علمی ماحول سے باہر جانے اور عمل کے دنیا میں قدم رکھنے کو ہیں۔ مگر کوئی مشورہ دینے سے قبل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ناصح بنا زیادہ پسند نہیں کرتا ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگراں
ناصح خود یافتم کم در جہاں

میں خود اپنی عمر کے ستر سال سے زیادہ برس بسر کر لینے کے باوجود ابھی محتاجِ نصیحت ہوں۔ تو میں نوجوانوں کو کیا نصیحت دوں۔ جوانی کا عموماً یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہر چیز کو آزمانے اور غلطیاں کرنے کے بعد تجربہ کے راستہ سے صحیح نظریے قایم کرنا چاہتی ہے اور دوسروں کے تجربوں پر انحصار کرنا نہیں چاہتی۔ میں چند ایسے اصولی امور کی طرف توجہ دلاتا ہوں جن کو آپ دلیل راہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

پہلا اصول جو زندگی میں داخل ہوتے ہی اختیار کرنا چاہیئے وہ رواداری ہے یعنی کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری جماعت کی رائے یا عقیدے کو صرف اس بنا پر غلط یا ناقابل قبول نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ آپ کی رائے یا عقیدے سے مختلف ہے۔ بلکہ ہر رائے کے سننے اور اس پر غور کرنے کے بعد اس کے موافق اور مخالف دلائل سن کر فیصلہ کرنا چاہیئے اس عادت کی کمی اور عدم رواداری ہمارے ملک میں طرح طرح کی تکالیف کا باعث ہے اور بہت سے جھگڑے اور فساد رواداری نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان پڑھ لوگ اور کم پڑھے ہوئے زیادہ تر تنگ خیال ہوتے ہیں اور اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو اصحاب اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہو چکے ہیں انہیں روشن خیالی سیکھنی چاہیئے۔ اس کا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی اپنی رائے نہو۔ یا ہوا کا ہر جھونکا ان کی رائے کو بدلتا رہے اگر دوسروں کی رائیں سننے کے بعد وہ اپنی یا اپنی جماعت کی رائے کو قابلِ ترجیح سمجھیں تو اس پر ضرور قائم رہیں اور دوسروں کو دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کریں لیکن یہ نامناسب ہے کہ اختلافِ رائے کی وجہ سے دوسروں کو بدظنی کی نگاہ سے دیکھیں یا ان کی نیتوں پہ حملے کریں یا ان سے میل جول منقطع کردیں۔

دوسروں پر بدظنی بڑھتے بڑھتے باہمی نفرت کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور کسی ملک کے باشندوں کے لئے باہمی مخاصمت یا نفرت سے زیادہ کوئی بیماری نہیں ہوسکتی۔ ہم آج کل ہندوستان کی تاریخ کے جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں بدقسمتی سے یہ بیماری زوروں پر ہے اور ملک کے اطراف و جوانب سے فرقہ وارانہ فسادات اور کشت و خون کی خبریں آرہی ہیں اور کلکتہ و بمبئی جیسے بڑے شہروں میں اس وقت تک ہزاروں جانیں تلف ہوچکی ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ لوگ زخمی ہوکر ہسپتالوں میں چلے گئے ہیں اور بعض پر اور بھی مذموم قسم کے حملے ہوئے ہیں جا بجا لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگ رہی ہیں۔ کہیں تقریروں اور جلسوں کی ممانعت ہے۔ کہیں پانچ سے زیادہ آدمی مل کر نہیں نکل سکتے۔ کہیں شام کے بعد گھر سے نہیں نکل سکتے۔ از راہِ انصاف کہیئے کہ یہ بھی کوئی زیست کا طور ہے۔ ہم چلے تھے مزید آزادی کو بڑھانے۔ اور رہی سہی کو بھی کھو کر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی ایک ضروری شرط کو بھول گئے ہیں۔ اور آزادی جب حاصل ہوتی ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے اس کو محدود رکھنا سیکھ جائے اور کسی معاملے میں حد سے نہ گذرے، نہ دوسروں کو برا بھلا کہہ کر انہیں اشتعال دے اور نہ اشتعال سے دست و حوصلہ بڑھائے۔ اس جلتی آگ پر پانی ڈالنا آپ لوگوں کا کام ہے اگر اس جامعہ سے سند یافتہ نوجوان اور اسی طرح کے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہ عزم کرلیں کہ وہ اپنی تقریر اور تحریر سے اور مجموعی اثر سے باہمی صلح کی کوشش کریں گے اور لڑائی جھگڑے کو مٹانے میں ساعی ہوں گے ملک کی زہریلی اور مکدر فضا صاف ہوسکتی ہے۔

اغلب ہے کہ آپ میں سے کئی فنِ اخبار نویسی کو جو ایک معزز اور آزاد مشغلہ ہے، اختیار کریں گے۔ ان سے میں یہی کہونگا کہ اگر اخبار نویس کی غریبانہ زندگی کو دوسرے کمائی والے پیشوں پر اس کی آزادی کے لحاظ سے ترجیح دی ہے تو کسی لالچ یا طمع کو اور آزادانہ طرزِ عمل کے راستے میں حائل نہ ہونے دیں اور یہ نہ پروا کریں کہ آپ کے اخ

کس قسم کی رپورٹ پسند ہو گی۔ بلکہ یہ دیکھیں کہ صداقت کا کیا تقاضہ ہے۔ آپ اپنے آپ کو صداقت کا مزدور سمجھیں نہ کہ زید، عمر کا ملازم۔ اس سلسلہ میں یہ جتا دینا بیجا نہ ہو گا کہ اخباری زندگی میں حال مسلمانوں کا حصہ جتنا ہونا چاہیئے اس سے بہت کم ہے۔ اور اس میں زیادہ نوجوانوں کی شمولیت کی ضرورت ہے جتنی مفید تحریکیں ملک یا ملت کی ترقی کے لئے درکار ہوں۔ وہ اخبارات اور ان کے خبر رساں کارندوں کے بغیر پنپ نہیں سکتیں۔ اور جو لوگ اخباروں کو صحیح واقعات کی اطلاع دیتے رہتے ہیں وہ ایک بھاری خدمت کر رہے ہیں۔ خواہ اس خدمت کا معاوضہ نسبتاً قلیل ہو۔

اخبارات اور اُن کے نامہ نگار اگر رواداری اور صلح پسندی کی راہ اختیار کریں تو وہ اپنے وطن عزیز کے ایک بڑے مسئلے یعنی ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کے حل میں معتد بہ امداد دے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ اہمیت رکھتا تھا اور ملک کی قسمت کا فیصلہ اس کے منصفانہ حل پر موقوف ہے مگر اس بیسویں صدی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان میں یوں تو بہت سی قومیں آباد ہیں مگر یہ دو تعداد میں زیادہ ہیں۔ اور اپنی اپنی تاریخی اور تمدنی روایات کی مالک ہیں۔ ان میں اگر اتفاق ہو تو ہندوستان بڑی سے بڑی دول میں شمار ہو سکتا ہے۔ اور ان میں اگر اندرونی مخاصمت اور نفاق رہے تو ہندوستان باوجود اپنی جغرافیائی بڑائی اور اپنی زمین کی خداداد زرخیزی کے کمزور ملک ہو گا۔ اس لئے قوم و ملت کے بہی خواہوں کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ باہمی اتفاق اور محبت کی تلقین کریں۔

علمی اور قلمی پیشوں کے سوا بھی بہت سے ذرائع جائز معاش کی تلاش کے ہیں اور اسی لئے اس درسگاہ میں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ دست کاری اور ہنر پر زور دیا گیا ہے آپ بھی اپنے اپنے سیکھے ہوئے ہنر سے کام لیں گے۔ اس جامعہ نے دست کاری کے درجے کو پہلے سے بلند کر دیا ہے اور اگر اس ارادے کی تکمیل میں کامیاب ہوئی کہ موجودہ دست کاری کی جماعتوں کو توسیع کر کے اپنے صنعتی شعبے کو ایک پالی ٹکنک بنا دے، جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ تو دست کاری کا رتبہ اور بھی بڑھ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جامعہ میں پڑھے لکھے طالب علم نہ صرف خود اپنے اپنے ہنر کو ذریعہ معاش بنائیں۔ بلکہ اس اصول کی تبلیغ کریں۔ اور وہ جھجک جو ابھی تک بعض دلوں میں ہے کہ وہ پیشہ قلم کو نسبتاً بہتر اور ہاتھ سے کام کرنے کو کم معزز سمجھتے ہیں لوگوں کی طبائع سے نکل جائے۔ کسی ملک کے عوام میں وہ خودداری جو آزادی کی بنیاد ہے پیدا

نہیں ہو سکتی۔ جب تک اہل حرفت و صنعت کو نظر حقارت سے دیکھنے کا رواج ہو۔ انگریزوں نے ڈیڑھ دو سو برس ہمارے ملک میں اتنی دور سے آکر حکومت کی ہے۔ اُن کی کامیابی کا ایک راز یہی تھا کہ وہ حرفت اور صنعت اور تجارت کو باعزت کام سمجھتے تھے جس شخص نے دخانی انجن ایجاد کر کے قوموں کی قسمت اور نظام کو دفعتاً پلٹا دے دیا وہ صنّاع ہی تھا ان کے ملک میں بہت سے گھرانوں کے نام ان کے پیشوں سے متعلق ہیں۔ سمتھ بہت مشہور کام ہے اس کے معنی لوہار کے ہیں۔ مختلف پیشوں کے لوگوں نے انگلستان میں اور دیگر حصص یورپ میں اپنے گلڈ یعنی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں نے اپنی برادری کی مجالس شوریٰ کے لئے بڑے عالیشان ایوان قائم کئے ہیں جن میں سے بہت سے اب تک موجود ہیں اور ان کے جلسوں میں جب ان ہنر کے پیشہ ور شامل ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا اعزاز اسی طرح کرتے ہیں جیسے سیاسی پارلیمنٹ کے رکن کرتے ہیں۔ ہر رکن دوسرے کو آنریبل کہکر خطاب کرتا ہے اور قابل عزت سمجھتا ہے۔ ان میں سے بعض انجمنیں زمانہ بھر کی دولت جمع کر کے ایسی مالا مال ہو گئی ہیں کہ ان کے ... دعوتوں کے موقع پر چاندی سونے کے برتنوں کا مجموعہ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔

تجارت کو سب ترقی یافتہ قومیں سلطنت سے بڑھ کر سمجھتی ہیں اور موجودہ صدی کی دو عالمگیر لڑائیاں، دراصل تجارتی اور اقتصادی اسباب سے ہوئی ہیں۔ کیونکہ یہ اصول تو گذشتہ جنگ عظیم کے وقت طے ہو گیا تھا کہ کسی فاتح ملک کو مفتوح ممالک پر مستقل قبضہ رکھنے کی اجازت نہیں ہو گی اور شکست پانے والی قومیں بھی اپنے ملک کی زمینوں سے محروم نہ کی جائیں گی ... ان کا اصلی جھگڑا یہ تھا کہ تجارتی منڈیوں پر کسی ایک قوم کی ٹھیکیداری نہ رہے۔ اب ... حکومت برطانیہ نے ہمیں کچھ ملکی اور سیاسی اختیارات دینے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اس کی ... بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا سیاسی اقتدار اٹھا لینے کے بعد اپنا تجارتی تعلق ہندوستان سے ... چاہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان والوں سے اور خاص کر یہاں کے تجارت پیشہ لوگوں سے ان کے تعلقات دوستانہ رہیں گے تو جو مالی نفع ہندوستان سے انگلستان کو حاصل ہوتا رہا ہے بیشتر حصہ جاری رہ سکے گا۔ وہ پہلے یہاں تجارت پیشہ ہی بن کر آئے تھے۔ پھر انہوں نے ... اور فوجداری اختیار کر لی۔ اور ملک گیر بن گئے۔ ہمارے لوگ اپنی پہلی تجارت کھو بیٹھے مصنوعات میں اُن کے دست نگر ہونے پر قانع ہو گئے۔ اب ہندوستان میں صنعت کے زندہ کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ آپ لوگ بھی علیٰ قدر ...

زندگی کی اس دوڑ میں شریک ہوں۔ محنت اور سرمایہ تو ہر میدان میں درکار ہے مگر صنعت اور تجارت کی ترقی کے لئے اور کاموں سے زیادہ انہماک ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اپنی حکومت کے زمانہ میں اپنی سپاہ گری پر اس قدر ناز تھا کہ وہ تجارت سے بہت حد تک غافل رہے برعکس اس کے ہندوؤں کو تجارت سے گہرا تعلق تھا۔ انہوں نے اس زمانہ میں اس صیغے میں بہت کچھ ترقی کی ہے، گو ابھی انہیں بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں دونوں مل کر کام کریں تو بہت زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں بعض محدود کمپنیوں میں ہندو اور مسلمان مل کر کام کر رہے ہیں۔ لیکن عام طور پر میلان یہی ہے کہ ہندو ہندو کمپنیاں اور مسلمان مسلمان کمپنیاں قائم کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر تو اشتراک عمل میں سہولت ہوتی ہے مگر انجام کار یہ میلان ایک دوسرے سے علیحدگی کی طرف لے جاتا ہے اور جس مغائرت کی شکایت کی جاتی ہے وہ بڑھتی رہتی ہے حالانکہ یہی وہ میدان ہے جس میں مل کر کام کرنے کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس میں تنگ دلی خواہ ایک جانب سے ہو یا دوسری سے، دور ہو جانی چاہیئے۔ اور اسے دور کرنے کی کوشش میں اس جامعہ کے طلبا کو خاص طور پر حصہ لینا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ایسے اشخاص رہے ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے ہیں اور جنہوں نے اپنے ہندو ہم وطنوں کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

استادوں کا کتاب خانہ

ششماہی رپورٹ

رامپور کے تمام اسکولوں میں علیحدہ علیحدہ کتاب خانے ہیں جہاں سے اساتذہ اور طلبہ کتابیں حاصل کرکے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مرکزی حکومت ان کتاب خانوں میں سے کسی ایک کو بھی چلا نہیں۔ نہ بچوں کے لئے اور نہ استادوں کے لئے ایسا کتاب خانہ کوئی نہ تھا جسے بچے اپنا کہہ سکتے یا استاد اپنا بناتے۔ جہاں کتابوں ہی سے سیکھنے کا عمل نہ ہوتا بلکہ آپس کے میل جول سے ذہنی اور سماجی زندگی کی بہت سی راہیں کھلتی۔ خواجہ غلام السیدین صاحب نے ان دونوں ضرورتوں کو دو کتاب خانے قائم کرکے پورا کیا۔ ایک بچوں کے لئے اور ایک استادوں کے لئے۔

کسی عمارت میں الماریوں میں کتابیں چن دینے سے کتاب خانہ کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ کتابوں میں چھپے ہوئے خزانوں کو اپنانے کی کوشش نہ کیجائے رامپور میں لوگ اس کے عادی ہی نہ تھے کہ کسی مرکزی کتاب خانے میں روزانہ جمع ہوں اور وہاں سے کتابیں حاصل کرکے ان سے فائدہ اٹھائیں یا اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں آپس کی گفتگو سے ایسے مسائل کا حل تلاش کریں جن کے حل سے سب کو فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ کتاب خانے کے افتتاح کے موقع پر تمہیدی تقریر میں خواجہ صاحب نے اپنے مقصد کی تشریح کردی تھی اور بتا دیا تھا کہ "کسی کتاب خانہ کا محض قائم ہوجانا کافی نہیں کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک کتب خانہ کتابوں کا گھر ہونے کی بجائے کتابوں کا مدفن بن جائے۔ کتاب خانے میں جان ان لوگوں

پڑتی ہے جو اس کو استعمال کرتے ہیں اور اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں اگر کوئی کتاب خانہ اپنے ممبروں کے لئے زندہ تہذیبی مرکز بن جائے۔ اگر لوگ وہاں سے نہ صرف کتابیں اور رسالے حاصل کرکے پڑھیں بلکہ مشترک دلچسپی کے مباحث پر تبادلہ خیال بھی کریں اور ایسے جلسوں اور تقریروں کا انتظام بھی کیا جائے جس میں سب لوگ ایک دوسرے کے ذاتی مطالعے اور تحقیق و تفتیش سے فائدہ اٹھا سکیں اور اس طرح ایک ذہنی بیداری اور رونق کی فضا پیدا ہو جائے تو وہ کتب خانہ لوگوں کے ادبی ذوق اور علمی شوق پر بہت گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔ شاید کسی عام کتب خانہ میں یہ فضا پیدا کرنا مشکل ہے لیکن استادوں کے اس کتب خانے میں جہاں زیادہ تر ایک ہی قسم اور ایک ہی مذاق کے لوگ جمع ہوں گے جن میں اشتراک مقاصد کی وجہ سے یک جہتی ہوگی۔ اس قسم کی فضا پیدا کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ۵ مئی ۱۹۴۶ء کی شام کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ کے مبارک ہاتھوں "استادوں کے کتاب خانے" کا افتتاح عمل میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب خانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس اقدام کو بہت سراہا۔ اور امید ظاہر فرمائی کہ اساتذہ صاحبان اسے کتابوں کا قبرستان بنانے کی بجائے ایک زندہ تعلیمی ادارہ بنائیں گے جس سے اُن کی پیشہ ورانہ اور ذہنی زندگی کی ترقی میں بہت کچھ امداد میسر آسکے گی۔

یہ تمام مقاصد صرف اس طرح پورے نہیں ہو سکتے تھے کہ ایک مقررہ وقت میں ایک مقام پر اساتذہ صاحبان گاہے ماہے فرداً فرداً تشریف لاکر اخبار و کتب بینی کرتے رہیں۔ بلکہ اس کے لئے اشد ضرورت تھی کہ ہر مہینہ ایک یا دو بار استاد صاحبان کا اجتماع ہو۔ اپنے تجربات بیان فرمائیں۔ دوسروں کے افکار و معلومات سے فائدہ حاصل کریں چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر مہینہ کتاب خانہ کا جلسہ ہوتا رہا جس کی صدارت بالترتیب حسب ذیل حضرات نے فرمائی۔

(۱) جناب ملک محب اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول شہر۔
(۲) جناب سید سفارش حسین صاحب ہیڈ ماسٹر حامدیہ ہائی اسکول۔
(۳) جناب پرشوتم سرن صاحب جوہری۔ ٹیچر رضا انٹر کالج
(۴) جناب عبدالحفیظ خاں صاحب ٹیچر ذوالفقار اسکول
(۵) عالی مرتبت صاحب وزیر تعلیمات بہادر رامپور۔

(۶) عالی مرتبت صاحب لامبر صاحب بہادر رام پور

حسب ذیل موضوعات پر مندرجہ تحت حضرات نے مقالے پڑھے جو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔

(۱) ہندوستان کی تعلیمی حالت پر ایک سرسری نظر (جناب سید محمد سالم صاحب ٹیچر ٹریننگ

(۲) برطانیہ کی تعلیمی حالت۔ (جناب احمد رضا خاں صاحب لیکچرار رضا انٹر کالج۔

(۳) دنیا کے دوسرے ملکوں میں تعلیم کی رفتار (جناب لطیف احمد خاں صاحب ٹیچر ذو الفقار اسکول۔

(۴) نمونے کا ثانوی اسکول (جناب سید احمد صاحب ٹیچر حامد ہائی اسکول۔

(۵) اقبال بحیثیت مفکر تعلیم۔ (جناب واحد حسین خاں صاحب ٹیچر باقر اسکول

(۶) تعلیمی اقتباسات۔ (جناب لطیف احمد خاں صاحب ٹیچر ذو الفقار

(۷) تعلیم بالغاں۔ (جناب سید ظریف احمد صاحب علوی سپروائزر تعلیم۔

(۸) آسٹریلیا کے تعلیمی حالات۔ (عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب بہادر

مباحثہ:۔ شریر بچے اور ان کی اصلاح کے طریقے: بحث پر حسب مختلف جلسوں میں تقریریں اور بحثیں فرمائیں۔

۱۔ جناب مرزا سجاد علی خاں صاحب ہیڈ ماسٹر ماڈل اسکول۔

۲۔ جناب شوکت حسین خاں صاحب ہیڈ ماسٹر ٹریننگ اسکول

۳۔ جناب احمد رضا خاں صاحب لیکچرار رضا انٹر کالج۔

۴۔ جناب سید اشفاق حسین صاحب فریدی ٹیچر حامد ہائی اسکول۔

۵۔ جناب محمد شاہ خاں صاحب

ہر جلسہ میں جناب ناظم صاحب استادوں کا کتاب خانہ اپنی ماہانہ تفصیل [illegible] مطالعہ کنندگان کی تعداد اور کتب تجربہ کے اعداد و شمار حاضرین کی معلومات ماہ وار حسب اندراج رجسٹر۔ فہرست اور چارٹ پیش فرما کر کتاب خانہ کی ماہانہ [illegible] روشنی ڈالتے رہے۔

کتاب خانہ کی اہمیت کے پیش نظر کام کو زیادہ [illegible] کے لئے حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک مجلس مشاورت [illegible]

۱۔ جناب سید نصیر الحسن صاحب

جناب محمد شفیق صاحب لیکچرار رضا انٹر کالج
جناب سیدی شاہ صاحب ہیڈ ماسٹر مرتضیٰ اسکول ۔
جناب اشرف علی صاحب فاروقی ٹیچر مرتضیٰ اسکول
جناب سید اختر علی صاحب ہیڈ ماسٹر ذوالفقار اسکول
جناب لطیف احمد خاں صاحب ٹیچر ذوالفقار اسکول ۔
جناب سید سفارش حسین صاحب ہیڈ ماسٹر حامد ہائی اسکول ۔
جناب اشفاق حسین صاحب زیدی ٹیچر حامد ہائی اسکول ۔
جناب مرزا سجاد علی خاں صاحب ہیڈ ماسٹر ماڈل اسکول ۔
جناب اللہ خاں صاحب ہیڈ ماسٹر باقر اسکول
جناب حسین خاں صاحب ٹیچر باقر اسکول ۔
جناب ... حسن صاحب انسپکٹر مدارس رامپور

... تک مختلف مدارس کے ۴۸ حضرات کتب خانہ کے باقاعدہ ممبر ہیں۔ کتب خانے میں ... کثیر تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ نئی کتابوں کا مزید انتظام زیر غور ہے ماہانہ رسائل اور روزانہ اخبارات بزبان اردو و انگریزی کی تعداد ۱۰ ہے ۔ اس تعداد میں اضافہ زیر غور ہے ۔ امید ہے کہ جلد از جلد کتب اور اخبارات نیز رسائل کی تعداد میں خواہ اضافہ ہو سکے گا ۔

ماہانہ جلسے تو ہو [redacted] ہی رہیں گے مگر ...
... عیت کا [redacted] جس کے سکم ... ی بی جو اس کی
مشاورت جناب سید احمد علی ... اور مجرد بیانات سکھانے سے پہلے
اس کی تربیت کی جائے ۔ ان تجربوں کے لئے وہ
... مناظر ... اور میدانوں کی سیر کا انتظام کرتا تھا ۔ اسی لئے اس کے نظام تعلیم کو
"تعلیم اشیاء کا طریق کار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

ایڈلر اور تعلیم بذریعہ تخلیق اشیاء

ایڈلر کا یہ عقیدہ تھا کہ محض اشیاء کی تعلیم ہی کافی نہیں ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اشیاء کی تخلیق کا کام بھی

راعی و رعایا کے بیچ فرق کو اساتذہ اور ان کے افسرانِ متعلقہ کے درمیان سے اٹھا دیا اس موقع پر ناظم صاحب کتاب خانہ سخت علالت کی بنا پر شرکت جلسہ نہ فرما سکے۔ لہٰذا جناب مرزا سجاد علی خاں صاحب ہیڈ ماسٹر ماڈل اسکول نے ناظم صاحب موصوف کے فرائض انجام دے۔

ان تمام جلسوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ استاد صاحبان مل جل کر اس بار کو برداشت کریں جو حکومت نے ان کے سپرد کیا ہے۔ اپنے تجربات اور اپنی معلومات سے دوسرے کم جاننے والے ساتھیوں کو فائدہ پہونچائیں۔ اپنی دقتیں اور مشکلات آپس کے بحث و مباحثہ سے حل کریں اور اس طرح رام پور کے تعلیمی نظام کا انداز کچھ اس طرح کا بنا دیں۔ جہاں ایک وقت سب کی دقت ہو۔ جہاں ایک مسئلہ سب کا مسئلہ ہو۔ جہاں کمزور کو گرانے کا جذبہ کار فرما نہ ہو بلکہ سہارا دیا جاتا ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک حد تک کتا خانے میں یہی روح کارفرما رہی ہے۔ تقاریر تقاریر کی خاطر نہیں بلکہ اپنی معلومات دوسرے ساتھیوں تک پہونچانے کے خیال سے ہوئیں۔ بحثیں تکرار اور اپنی قابلیت جتانے کے لئے نہیں بلکہ مسائل کے حل تلاش کرنے کے خیال سے کی گئیں۔ عالی مرتبت خواجہ غلام السیدین صاحب کو کتا خانے سے جو دلچسپی ہے وہ اس لئے نہیں کہ یہ ان کے ماتحت محکمہ سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صاحب موصوف کی دلچسپی کتاب خانے سے ذاتی ہے اور اسی دلچسپی کا باعث ہے کہ جناب موصوف نے باوجود اپنی غیر معمولی مصروفیتوں کے آسٹریلیا کے تعلیمی حالات پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمانے کے لئے وقت نکال لیا۔ نیز جناب موصوف ہر وقت کتا خانے کی فلاح اور ترقی کے ذرائع سوچنے اور اپنی امداد دینے کے لئے تیار نظر آتے ہیں۔

حکومتوں کے چلائے ہوئے اچھے کاموں کو اس وقت تک کامیابی نصیب ہو ہوتی جب تک افسران متعلقہ کو ایسے کاموں سے لگاؤ اور دلچسپی نہو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اصلاحی سکیمیں کسی دوربین اور سمجھدار افسر کے نہونے کے باعث ناکامیاب ہو کر ختم ہو گئی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا اس کام میں ہمیں ایک ایسے مشیر کی ہمدردیاں نصیب ہیں جو گم کردہ راہ کو راہ دکھانے اور اندھیرے میں ٹھوکرکھانے والے کو روشنی میں لا کھڑا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس باعث سے ہمیں امید بھی ہے کہ مستقبل قریب میں کتاب خانہ محکمہ تعلیمات کا ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز بن جائے گا۔

نئی تعلیم

روسو اور تعلیم میں انفرادی تجربے نئی تعلیم کے علمبرداروں میں اوّلیت کا شرف روسو کو حاصل ہے۔ انقلاب فرانس سے چند سال پہلے اُس نے اپنی کتاب ایملی تصنیف کی جس کے بنیادی خیالات یہ ہیں۔

(۱) ہر قسم کی تعلیم کی ابتدا بچے ہی سے ہونا چاہیئے۔ بچہ کی صلاحیتوں کو آزاد کرنا اور انھیں بالغوں کی عائد کردہ پابندیوں کے بغیر نما کا موقع دینا چاہیئے۔

(۲) بچے کو اپنے ماحول کی ذاتی تجربی تحقیقات کا موقع دینا چاہیئے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے علم میں از خود اضافہ کر سکے اور بڑوں کے مذہبی یا سیاسی عقیدوں کو بچے پر ہرگز نہ ٹھونسنا چاہیئے۔

(۳) تعلیم کا ذریعہ کتابیں نہیں بلکہ خود حقیقی زندگی ہونا چاہیئے۔

روسو نے صرف تعلیمی نظریہ بنایا۔ اس کو وہ عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تعلیمی مصلحوں نے اس کے بعض زیادہ قابل عمل نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

پستالوزی اور تعلیم بذریعہ مشاہدہ اشیاء پستالوزی نے روسو کے نظریوں سے متاثر ہو کر انیسویں صدی کے نصف اوّل میں بچہ کی تعلیم کے لئے طریقوں کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ روسو کی طرح پستالوزی بھی حواس کی تربیت پر زور دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کتابوں کی تعریفیں اور مجرد بیانات سکھانے سے پہلے یہ لازمی ہے کہ تجربوں کے ذریعہ بچے کے حواس کی تربیت کی جائے۔ ان تجربوں کے لئے وہ چیزوں، مثلاً: اسط مشاہدوں اور میدانوں کی سیر کا انتظام کرتا تھا۔ اسی لئے اس کے نظام تعلیم کو "تعلیم اشیاء کا طریق کار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایڈلر اور تعلیم بذریعہ تخلیق اشیاء ایڈلر کا یہ عقیدہ تھا کہ محض اشیاء کی تعلیم ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اشیاء کی تخلیق کا کام بھی

جاری رہنا چاہیئے اور تخلیقی کام کو تعلیم کا باقاعدہ حصّہ بنانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے انیسویں صدی کے آخری رُبع میں شہر نیویارک میں اخلاقی تربیت کا جو مدرسہ قائم کیا اسکی ہر ابتدائی جماعت میں چار گھنٹے فی ہفتہ کا تعمیری یا تخلیقی کام لازمی قرار دیا گیا۔

فرابل اور "بچوں کا باغ"

فرابل کے کنڈر گارٹن (بچوں کا باغ) کی تعلیم کی بنیاد بچے کی نمو پذیری ہے۔ نمو پذیری کا مفہوم اس کے نزدیک یہ ہے کہ بچے کی باطنی صلاحیتوں کو باہر نکالا جائے۔ فرابل نے روحانیت پر بہت زور دیا۔ وہ عینیت پرست تھا۔ اور اس تصور کا قایل تھا کہ نمو پذیری لامحدود اور لافانی کی سمت ہوتی ہے وہ تخلیقی اور بچے کام کر کے سیکھنے پر زور دیتا تھا وہ مدرسہ کو ایک ایسی زندہ سماج بنانا چاہتا تھا جس کے کاموں میں بچے پوری طرح شرکت کر سکیں۔

ہربرٹ اور بچے کی نفسیات

ہربرٹ نے بچے کی نفسیات پر بہت زور دیا وہ پڑھانا شروع کرنے سے پہلے بچے کا مطالعہ کرنا بہت ضروری سمجھتا تھا۔ وہ انفرادی اختلافات کی اہمیت کا قایل تھا اور تعلیم کی کامیابی کے لئے بچے کی دلچسپی کو لازمی شرط قرار دیتا تھا۔ ہربرٹ کے طریقہ تعلیم میں استاد کا کام بہت [illegible] ہے۔ بچہ کو چونکہ وہ ناواقف اور استاد کو واقف مانتا ہے اس لئے اس کے نزدیک [illegible] یہ فرض ہے کہ جن چیزوں سے وہ واقف ہے ان کے بارے میں بچوں کی ناواقفیت کو دور [illegible] ہربرٹ نے استاد کے تعلیمی کام کو پانچ باقاعدہ تدریجی اقدامات میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) تیاری (۲) پیشی (۳) مقابلہ (۴) عمومی بیان اور (۵) تطبیق۔

جان ڈیوی اور اس کا تجربی فلسفہ

ہم عصر تعلیمی مفکروں میں سب سے زیادہ [illegible] نام جان ڈیوی کا ہے۔ امریکہ کے نئے مدرسہ کے طریقہ تعلیم کو بدلنے میں اس کا اثر سب سے زیادہ ہے اور دنیا کے تمام ترقی پسند معلم اس کی رہنمائی کو تسلیم کرتے ہیں وہ امریکہ سے باہر دوسرے ملکوں، یعنی چین و ترکی اور روس [illegible] تعلیم کو نئی تنظیم دینے کے کام میں جا چکا ہے۔ اس کو شروع ہی سے فلسفہ سے بہت دلچسپی رہی امریکہ کی یونیورسٹیوں میں وہ اس مضمون کا درس دیتا رہا ہے ابتدا میں یہ عینیت پسند تھا [illegible] فلسفہ عملیت[1] کا قائل ہو گیا اور آج اس کا شمار عام طور پر تجربی (یا اختیاری) فلسفہ کے ما[illegible]

---

[1] یہ نظریہ کہ کسی چیز کا معیار حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کا انسانی اغراض و مفاد سے تعلق ہو۔

کیا جاتا ہے۔ ڈیوئی کے نزدیک فلسفہ کا کام یہ معلوم کرنا نہیں ہے کہ ہم دنیا کو کس طرح جانتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم دنیا پر کس طرح قابو پا سکتے ہیں۔ اور اس کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس کے نظریہ کے مطابق فلسفہ سماجی جھگڑوں کے مطالعہ کا نام ہے خصوصاً ان جھگڑوں کے مطالعہ کا جو جدید سماج کی تین مبینہ قوتوں یعنی جمہوریت، صنعت اور سائنس کے تعلقات کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں" اس مفہوم کے مطابق فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ "آدمیوں کے ان خیالات میں صفائی پیدا کرے جو اپنے زمانے کے سماجی و اخلاقی جھگڑوں سے متعلق ان کے ذہن میں پیدا ہوں" اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تجربی طریقہ ہی کو اختیار کر کے سماجی مسئلوں تک پہونچا جا سکتا ہے۔ نظریہ اور طریقہ دونوں کے لحاظ سے تجربی فلسفہ تمام چیزوں کو تجربی سمجھتا ہے۔ کوئی چیز قایم اور دایم نہیں ہے، کائنات خود تغیر کی حالت میں ہے۔ اس لئے دائمی حقیقتوں کے بارے میں صاف ستھرے اور پختہ و پیوستہ فارمولے وضع کرنا نہ صرف یہ کہ ناممکن ہے بلکہ ایک فعل عبث ہے تجربی فلسفہ کا ماننے والا مافوق الفطرت دنیا سے انکار کرتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ آخر میں انسان کو راستہ خود ہی مقرر کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے آدمی اسی وقت ایک کارگذار سماجی زندگی کے تعمیر کرنے کی توقع قایم کر سکتا ہے، جب وہ اپنے پیچیدہ مسئلوں کو حل کرنے کے لئے تجربی طریقوں کو اختیار کرے۔ تبدیلی کے عمل پر قابو پانے کے لئے جس جد و جہد میں آدمی مصروف ہے اس میں اس کو اپنی تخلیقی ذہانت ہی پر بھروسہ کرنا ہوگا۔

جان ڈیوئی کے تعلیمی اصول

ڈیوئی اور اس کے پیرووں کے جم غفیر کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایسی سماجی اہلیت پیدا کرنا ہے جس کے ذریعے ایک آدمی زندگی کے عام مشغلوں میں شرکت کرنے کے قابل بن جائے۔ ایک مثالی مدرسہ کو ایک باعمل اور باحرکت سماج ہونا چاہیئے جس میں بچہ اپنے تجربوں کے ذریعہ ضروری باتیں سیکھ سکے یہاں بچے کی زندگی کو خود تعلیم ہونا چاہیئے۔ یہاں نمو پذیری میں بتدریج اضافہ ہوتا رہنا چاہیئے ترقی کی ہر حالت میں بعد کی ترقی کے بیج موجود رہنا چاہیئیں۔ فلسفہ عملیت اور فلسفہ تجربی دونوں بچے کو ایک ایسی شخصیت سمجھتے ہیں جس میں برابر نشو و نما اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یہ مدرسہ کو محض ایک ایسا آلہ سمجھتے ہیں جس سے اس نشو و نما اور تبدیلی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بزرگوں کی عقل اور ان کا علم مدرسہ میں جو کچھ بچہ سیکھے اس پر شرطیں عاید کر دیں لیکن ہر بچے یا

ان کے گروہ کی ایک منفرد حیثیت تو ضرور ہی تسلیم کرنا چاہیئے۔ بچے کو اپنی ذاتی زندگی بسر کرنا ہے اور اسے ایک ایسے مستقبل کا سامنا کرنا ہے جو نئے اور غیر حل شدہ مسائل سے معمور ہوگا بزرگ یہ تو تجویز کر سکتے ہیں کہ بچہ کو کیا سیکھنا چاہیئے لیکن اس واقفیت کو مناسب طریقہ پر استعمال کرنے کا کام آخر میں خود بچے ہی کو کرنا پڑے گا۔ پورے تعلیمی عمل کی روح یہ ہونا چاہیے کہ نمو پذیر بچہ اپنے تمدنی ورثہ میں سے انتخاب کرنا اور اس کو نئی تنظیم دینا سیکھے اور وقت آنے پر بدلتی اور بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی ضرورتوں کے مطابق اس تمدنی ورثہ کو نئے سانچے میں ڈھال سکے اس کے اندر اس اہلیت کو پیدا کرنے کے لیے تخلیقی قوتوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اس فضا میں جبر اور عقیدوں کی تعلیم کی گنجائش بہت کم ہے اگر ان کا استعمال ضروری ہی سمجھا جائے تو جہاں تک ہو سکے کم سے کم اور بدرجہ مجبوری استعمال کرنا چاہیئے۔ فلسفہ تجربی کے حامی خالقیت پر بہت زور دیتے ہیں لیکن یہ خالقیت اتفاقی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی رہنمائی کرنا چاہیئے۔ یہ خالص انفرادی چیز بھی نہیں ہے۔ اپنی بہترین شکل میں یہ خالقیت ایسے انکشاف اور مہم جوئی کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس میں ایک شخص کے ساتھی پوری طرح اس کے شریک ہوتے ہیں۔ اوپر کی اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) تعلیم محض زندگی کی تیاری نہیں بلکہ خود زندگی ہے۔

(۲) تعلیم نمو پذیری ہے اور جب تک نمو پذیری باقی رہتی ہے تعلیم بھی جاری رہتا ہے۔

(۳) تعلیم جمع کیے ہوئے تجربہ کی مسلسل تجدید ہے۔

(۴) تعلیم ایک سماجی عمل ہے اور مدرسہ کو ایک جمہوری جماعت ہونا چاہیئے۔

فرابل اور ہربرٹ سے ڈیوی کا مقابلہ

جان ڈیوی کے خیالات پر اپنے سے پہلے کے مفکروں خصوصاً فرابل اور ہربرٹ کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ فرابل کے کنڈرگارٹن کا بنیادی تصور نمو پذیری تھا، اس کو ڈیوی نے بھی قبول کیا لیکن اس نے اس بات کو نہیں مانا کہ نمو پذیری باطنی صلاحیتوں کے ابھرنے کا نام ہے۔ تصوف اور علامت پرستی کو بھی ڈیوی نے نظریہ عملیت کے پیرو ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا کیونکہ ان کا بیشتر حصہ مابعد الطبیعاتی تھا۔ اور کنڈرگارٹن کو عملی طور پر چلانے کے لئے ہرا[illegible] نہ تھا۔ فرابل نے روحانیت پر جو زور دیا تھا وہ بھی ڈیوی جیسے فلسفہ تجربی کے ماننے والے کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ فرابل چونکہ اپنے فلسفے کے لحاظ سے عینیت پسند تھا اس لئے وہ [illegible]

اور لافانی کی سمت نمو پذیری کا قائل تھا لیکن ڈیوئی کے نزدیک کسی بعید منزل کی جانب نمو پذیری اس لئے ناممکن ہے کہ اس قسم کی منزل کا قائم اور غیر متحرک ہونا ضروری ہے اس کے نزدیک تعلیم ایک مسلسل عمل ہے جس کی کوئی قائم منزل نہیں ہے لیکن کئی باتوں میں فرائبل اور ڈیوئی باہم متفق ہیں دونوں خالقیت پر زور دیتے ہیں اگرچہ مختلف طریقوں پر دونوں کرکے سیکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ دونوں مدرسے کو ایک زندہ سماج سمجھتے ہیں جس کے اندر بچے سماجی کاموں میں پوری طرح شرکت کرتے ہیں۔

ہربرٹ کے طریقوں اور اس کی شقوں میں چونکہ باقاعدگی بہت زیادہ ہے اس لئے ڈیوئی کے نزدیک یہ بہت زیادہ قابل اعتراض ہیں، چنانچہ وہ ہربرٹ کی مخصوص کتاب خوانی کو زیادہ تباہی سمجھ کر اور یہ کہکر کہ اس میں طلبہ کی ذاتی فاعلیت کا موقع کم ہے مسترد کر دیتا ہے ڈیوئی کے نزدیک ہربرٹ کے مدرسے میں استاد کی نگرانی بہت زیادہ اور بچہ کی مرکزیت ناکافی ہوتی ہے۔ یہ بہت بے لوچ بہت زیادہ حکم پسند اور ناکافی جمہوریت پسند ہوتا ہے ہربرٹ کے یہاں جو نظری ذہنیت پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے اُسے بھی ڈیوئی نے مسترد کر دیا ہے لیکن جن باتوں میں دونوں کم و بیش متفق ہیں وہ یہ ہیں دونوں تعلیم کے لئے دلچسپی کو بہت اہم قرار دیتے ہیں دونوں انفرادی اختلافات کی اہمیت کے قائل ہیں دونوں بچے کو تعلیم دینے کی کوشش کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں اس کے علاوہ ہربرٹ کے "باقاعدہ اقدامات" اور ڈیوئی کے "عمل فکر" میں بھی فرق کی کوئی بڑی خلیج حائل نہیں ہے جیسا کہ ذیل کے باہمی مقابلے سے ظاہر ہو جائے گا۔

طریقہ کے لوازمات

ڈیوئی کے یہاں	ہربرٹ کے یہاں
۱۔ مشغلہ	۱۔ تیاری
۲۔ مسئلہ	۲۔ پیشی
۳۔ معلومات	۳۔ مقابلہ
۴۔ مفروضہ	۴۔ عمومی بیان
۵۔ آزمائش	۵۔ تطبیق

ہربرٹ کے طریقے میں استاد کا کام اہم سمجھا جاتا ہے۔ ڈیوئی کے طریقے میں بچے کا کام

ایک باعمل سیکھنے والا ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلا طریقہ اس چیز کو بچے تک پہونچاتا ہے جو بچے کو نامعلوم ہے لیکن استاد کو معلوم ہے۔ دوسرا طریقہ نامعلوم کے انکشاف کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ہارن کا قول ہے کہ یہ دونوں طریقے نہایت خوبی کے ساتھ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کو مختلف میدانوں میں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ہربرٹ کا طریقہ زبان، ادب، تاریخ اور خیالی میدانوں میں زیادہ باثر ہے۔ ڈیوی کا ذہنی ہنرمندی اور سائنس کے میدانوں میں جہاں کتاب کے مضامین پڑھانا ہوتا وہاں ہربرٹ مفید ثابت ہوتا ہے۔ جہاں چیزوں کے برتنے کی اہمیت مقدم ہوتی ہے وہاں ڈیوی کا۔

شکاگو میں ڈیوی کا تجرباتی مدرسہ

جان ڈیوی نے ۱۸۹۶ء میں جب وہ شکاگو یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ تھے کچھ پڑوسیوں اور رفقائے کار کے ساتھ مل کر ایک تجرباتی مدرسہ کھولا۔ یہ مدرسہ بہت ہی غیر رسمی قسم کا تھا۔ تعلیمی طریقوں کے جو مسلمہ اصول تھے وہ یہاں بہت کم نظر آتے تھے۔ مدرسہ میں کوئی مقررہ مضامین نہیں تھے اور مدرسوں میں جو تھوڑا سا فرنیچر عام طور پر نظر آتا ہے وہ بھی یہاں غائب تھا۔ تعلیمی نقاد جو اسے دیکھنے آئے وہ بہت جز بز اور پریشان ہو کر واپس گئے انہیں یہ کامل یقین تھا کہ یہ مدرسہ ہرگز نہیں چل سکے گا۔ لیکن یہ مدرسہ چلتا رہا اور آہستہ آہستہ بڑھتا۔ اور اس دوران میں مدرسوں کے مروجہ طریقوں کو چھوڑتا رہا۔

ڈیوی کا مدرسہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے واقعی تعلیمی اصولوں کے جانچ کی جگہ تھا۔ روسو کی کتاب ایمیل کو اگر مروجہ تعلیم کے خلاف ایک تحریری احتجاج مانا جا تو ڈیوی کے تجربے کو مدرسے کی صورت میں احتجاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسٹاف کے ساتھ گول میز پر مباحثے ہوتے تھے، استادوں اور والدین کے سامنے لکچر دئے جاتے تھے ڈیوی نے ان موضوعوں پر جو گفتگوئیں کیں ان کی بنیاد پر کئی مقالے تصنیف ہوگئے۔ ان میں دو کے نام "مدرسہ اور سماج" اور "بچہ اور نصاب" ہیں۔ یہ دونوں بعض ان مسئلوں سے بحث کرتے ہیں جن کو تجرباتی مدرسہ حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ مدرسہ چار سے تیرہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے تھا ان میں ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی تھی جنھیں فرابیل نے شاید پہلی بار شعوری طور پر پیش

کیا تھا ڈیوی کے مدرسہ کی بنیاد اس خیال پہ قائم کی گئی تھی کہ "بچوں کو اشتراک عمل اور باہمی فائدے کی زندگی کے لئے تیار کرنا چاہیئے"۔ چنانچہ اس بات کا اعلان کیا گیا کہ "تمام تعلیمی کاموں کی ابتدائی اساس بچہ کی جبلی اور اضطراری انداز طبیعت اور سرگرمیاں ہوتی ہیں"۔ اس لئے ہربرٹ کا طریقہ جو اس زمانہ میں مقبول تھا۔ اور جس کے اندر خارجی مواد کو پیش کرنے اور تطبیق دینے پر زور دیا جاتا تھا۔ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اس کے مقابلے میں ڈیوی کے طریقہ کی بنیاد اس چیز پر تھی۔ جسے آج عام طور پر مشغلہ کے پروگرام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں پڑھائی لکھائی اور حساب کی تثلیث یا تو بچہ کی زندگی کے مشاغل سے یا اس کے سیکھنے اور رہنے کے طریقوں سے متدرج ہوتی تھی۔ اور اس کام میں کسی معین اور مقررہ نصاب کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ مدرسہ میں قاعدانہ تعلیم اور تجربہ کی تجدید کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، سب طرح کے مشغلے ہوتے تھے جن میں ... تعمیر، فطرت سے قرب واتصال، اظہار ذات، اور اوزار کا استعمال وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ ان کے سلسلہ میں ڈیوی کا خیال یہ ہے کہ "ہمیں اس بات کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ان کے (عملی مشاغل کے) ذریعہ مدرسہ کی پوری روح بدل جاتی ہے۔ مدرسہ کو اپنے تئیں زندگی سے وابستہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بچے کا گھر بن جاتا ہے۔ جہاں وہ استاد کی رہنمائی میں خود زندگی بسر کرنا سیکھتا ہے یہ وہ جگہ نہیں رہتی جہاں وہ ایسے سبق سیکھتا ہو جن کا آنے والی کسی امکانی زندگی سے کوئی خیالی یا دور کا تعلق ہو۔ اسے مختصر پیمانے پر ایک جماعت جیسی حالت میں ایک سماج بننے کا موقع مل جاتا ہے۔

بچوں کو اس مدرسہ میں سننے کی جگہ کرنا مجہول کی جگہ عامل ہی نہیں بننا پڑتا تھا۔ بلکہ انھیں یہ بھی سیکھنا پڑتا تھا کہ وہ سماج کے لئے اپنے آپ کو کس طرح مفید اور کارگذار بنا سکتے ہیں۔ مقابلہ کی جگہ اشتراک عمل مدرسہ کی بنیادی خصوصیت تھی۔ بچے کے انفرادی رجحانات کو اشتراک عمل کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اسی کے ذریعے ان کی تعلیم اور رہنمائی کی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں مدرسہ بچے کو زندگی بن کر زندگی کے لئے تیار کرتا تھا۔ اسے مختصر پیمانے پر "زندگی کے مخصوص حالات" کو پیدا کرنا پڑتا تھا۔ ڈیوی کا دعویٰ تھا کہ پیدائش اور تخلیقی استعمال کے ذریعہ ہم کو قیمتی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے اشتراکیت ترمیم و تحریف کی جا سکتی ہے۔ اور سماج کو سماجی ترکہ کی جکڑبندیوں سے آزاد کیا جا رہا ہے

سنگ و خشت

علمی صحت و متانت

اردو میں ادبی رسائل خاصی تعداد میں نکلتے ہیں مگر ایسے تعلیمی رسالے جو علمی حیثیت رکھتے ہوں مفقود ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ریاست رامپور کے محکمۂ تعلیمات نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے "تعلیم جدید" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ نکالا ہے جس میں رامپور کی تعلیمی سرگرمیوں کی روداد کے علاوہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی رفتار تعلیم کا جائزہ بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کے مضامین میں علمی صحت و متانت کے ساتھ ادبی لطافت اور حلاوت پائی جاتی ہے اور یہ اس کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ مجھے امید ہے تعلیمی حلقوں میں "تعلیم جدید" قدر کی نظر سے دیکھا جائے اور نہ صرف رامپور میں بلکہ سارے ہندوستان میں اس رسالہ کو وہ مقبولیت حاصل ہوگی جس کا وہ مستحق ہے۔

(ڈاکٹر) سید عابد حسین۔ جامعہ نگر دہلی

طلباء کے مطالعہ کے لئے مضمون کا مطالبہ

مخدومی ۔ تسلیم

تعلیم جدید رام پور کا اکتوبر نمبر ملا ۔ اس کی ظاہری صورت اور معنوی حیثیت دونوں نے مجھے متاثر کیا ۔ ان چند صفحات میں جو کچھ ہے سب کچھ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا ہی یہ رسالہ نکلتا رہا اور اسی قسم کے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے تو اس کی افادیت ہمارے جدید تعلیمی نظریات کو بڑی قوت بخشے گی ۔ خواجہ غلام السیدین صاحب کے مضمون کا تو کہنا ہی کیا کہ وہ اس موضوع کے ماہر ہیں ۔ لطیف احمد خاں کے مضامین بھی مجھے بہت پسند آئے ۔ کاش اس رسالہ کو زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکتے ۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے رسالے کا اصل مقصد کیا ہے ۔ جو چیز مجھے کھٹکی وہ یہ تھی کہ اس میں براہِ راست طلباء کے مطالعہ کیلئے کچھ بھی نہیں ہے ۔ ممکن ہے کہ ان کیلئے کوئی دوسرا رسالہ ہی نکلتا ہو لیکن اسمیں بھی اگر ان کے لئے علمی مضامین شائع کئے جائیں اور اس کا حجم بڑھا دیا جائے تو یہ صرف رام پور کے ریاستی ماحول کی چیز نہ رہ جائے گا ۔ بلکہ پورے ملک میں تعلیم سے دلچسپی لینے والوں کے لئے ایک مفید رسالہ ثابت ہوگا ۔ مجھے امید ہے کہ یہ رسالہ آپ کی ادارت میں خوب پھلے پھولے گا ۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے ۔

(سید) احتشام حسین ۔ اردو ڈپارٹمنٹ لکھنؤ یونیورسٹی

قومی خدمت

رسالہ تعلیم جدید نظر سے گذرا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج کل صحیح قومی خدمت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ملک کی تعلیمی حالت کا سدھار کیا جائے اور اس سدھار کے لئے جتنے بھی طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں وہ کوئی بھی فروگذاشت نہ کئے جائیں۔ طریقوں کے اختیار کئے جانے میں یہ امر خصوصیت سے ملحوظ رکھا جائے کہ کوئی گوشہ قومیات سے خالی نہ رہے۔ مدرسے۔ کتاب خانے۔ کھیل کے میدان۔ کلب۔ انجمنیں بکثرت جاری ہوں اور ان میں تعلیمی افادیت کے ہر جزو کو ابھارا جائے۔ اس کے لئے ملک کو ایک نہیں بلکہ متعدد رسالہ جات ہفتہ وار تعلیمی اخبارات کا اجرا ہو تاکہ تعلیم کے صحیح مقصد کی کافی نشر و اشاعت ہو سکے۔ میرے نزدیک "تعلیم جدید" ایک بڑے اور اہم مقصد کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس کے مضامین ان امور کے حامل ہیں جن کی ہندوستان کو اشد ضرورت ہے۔ اگر ایسے ہی دو چار معیاری رسالے ہندوستان کی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا پرچار کرنے کے لئے جاری ہو جائیں تو اغلب ہے کہ رنگ تعلیم بدل جائے اور ہندوستانی استادوں میں قوم و وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ میں ریاست رام پور کے اس اقدام کو قابل صد تحسین سمجھتا ہوں۔

جناب اڈیٹر صاحب کیا آپ اپنے اس رسالہ میں بچوں کے لئے چند صفحات مخصوص نہیں فرما سکتے کیا آپ بچوں کے والدین کو تعلیم کے سلسلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتے اگر آپ کے نزدیک جزو دوئم لازمی ہو تو مہربانی فرما کر اس موضوع کے لئے بھی کچھ سطروں کی جگہ مخصوص فرما دیجئے۔ میں آپ کی کاوشوں کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں اگر کبھی کوئی کمی پاؤنگا تو انشاء اللہ بلا تکلف عرض کرونگا۔

سید محمد صادق معلم کانسٹم اسکول الکنہ

ایک تصحیح

دسمبر ۱۹۴۶ء کے تعلیم جدید میں "بچوں میں توجہ اور دلچسپی قائم رکھنا" جناب لطیف احمد خاں صاحب بی اے بی ٹی کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ یہ مضمون جناب اشرف خاں صاحب فاروقی بی اے بی ٹی کا ہے۔ فہرست مضامین مرتب کئے جانے میں غلطی ہو گئی ناظرین رسالہ ہذا اس کی تصحیح فرمالیں۔

(ادارہ)

محکمہ تعلیم ریاست رامپور کا آرگن



تعلیم جدید

تعلیم جدید

مدیر
مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی (علیگ)

چندہ سالانہ ...... پانچ روپئے
فی پرچہ ...... آٹھ آنے

جلد ۲ — رامپور ـ فروری ۱۹۴۷ء — نمبر ۲

فہرست مضامین

مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی علیگ نے مرتضیٰ الیکٹرک پریس رام پور میں چھپوا کر دفتر تعلیم جدید رامپور سے شائع کیا۔

استادوں سے خطاب

تعلیم اور ایک بہتر معاشرے کی تعمیر

(قسط دوم)

سائنس کی ترقی کا ایک اور زبردست اثر ہماری زندگی پر پڑا ہے جس کی طرف سے تعلیم غافل نہیں رہ سکتی۔ بعض نئی ایجادوں کی وجہ سے اس زمانے میں لوگوں کے خیالات اور جذبات کو متاثر کرنے کے ذرائع بہت زیادہ وسیع اور دوررس ہوگئے ہیں۔ اس صورتِ حال کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تو جمہوری تحریک کا زور ہے جس کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ سیاسی قوت اور اختیار عوام کے ہاتھ میں آئے تاکہ وہ دنیا کے مادّی اور تمدنی وسائل سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ اور دوسری طرف قیادت کے ہاتھ میں ایسے آلات آگئے ہیں جن کی مدد سے وہ عوام کے ذہن کو ماؤف یا مسخر کرکے انھیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچا سکتے ہیں اس طرح گویا جو اختیارات انھیں ایک ہاتھ سے دئیے جاتے ہیں وہ غیر محسوس طور پر دوسرے ہاتھ سے چھین لئے جاتے ہیں۔ رائے عامہ کو ڈھالنے کے ان طریقوں پر نظر ڈالیے کہ اُن کے بے پناہ مجموعی اثر کے سامنے لوگ کس طرح بے بس ہوجاتے ہیں۔ ایک اخبار جو ہمارے ملک میں ہزاروں اور دوسرے ملکوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں چھپتا ہے۔ محض اپنے جلی عنوانات، اپنے اخفائے حق اور اعلانِ باطل اپنے جھوٹے سچے اشاروں اپنی خبروں کی ترتیب اور انتخاب سے اکثر لوگوں کے سیاسی خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر ملکوں میں، جہاں خواندگی عام ہوگئی ہے لوگ سیاسی معاملات میں غور و فکر کرنے کے بجائے اخباروں کے سطحی اور ایک طرفہ مضامین سے متاثر ہوکر بنائی رائیں قبول کرلیتے ہیں یہی حال کتابوں کا ہے جن کی اشاعت اس زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کے ذریعے سے بھی مصنفین اور سرمایہ دار جو اشاعت کے وسائل پر قابض ہیں عوام کے خیالات کو اپنے مفید مطلب سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ یہی حال ریڈیو سینما اور تھیٹر وغیرہ کا ہے جن کا اثر اس وجہ سے اور زیادہ مفید (یا خطرناک) ثابت ہوتا ہے کہ وہ بظاہر آلاتِ تفریح ہیں، لیکن دراصل غیر محسوس طور پر ہمارے خیالات، جذبات اور مذاق پر

بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں اور غور کیجیے کہ ان کی رسائی کس قدر ہے؟ جس شخص یا جماعت کے پاس نشر کرنے کے آلات ہیں اس کی آواز لاسلکی کے پروں پر سوار ہو کر تمام کرۂ زمین کا طواف کر سکتی ہے۔ ایک ڈائرکٹر جو اپنے اسٹوڈیو میں کوئی ڈراما یا فلم تیار کرتا ہے۔ دور دور کے ملکوں میں لاکھوں تماشہ بینوں کو ایک خاص طریقے پر متاثر کر سکتا ہے۔ پراپیگنڈا کے ان تمام جدید ذرائع کا مجموعی اثر یہ ہے کہ فکر کی آزادی زائل ہوتی جاتی ہے اور اس کے بجائے یکسانیت خیال رواج پاتی ہے جو ترقی کے راستے میں حارج ہوتی ہے۔ اس رجحان کا ازالہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ تعلیم کے ذریعہ۔ لیکن عام طور پر تعلیم بھی اسی رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ اکثر ملکوں میں عوام کو ایک ہی قسم کی ناقص اور ناکافی تعلیم دی جاتی ہے جس کو امریکہ کے مشہور مصنف اور مبصر اپٹن سنکلر نے　　　کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ایسی تعلیم جس کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو فوج کے سپاہیوں کی طرح قدم ملا کر چلنا سکھایا جائے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اخبار اور کتابیں پڑھنا سیکھ لیتے ہیں لیکن خیالات کا تجزیہ اور تنقید نہیں کر سکتے، تقریریں سنتے ہیں لیکن دل خوش لفاظی اور تلخ حقیقت میں تمیز نہیں کر سکتے اور جذباتی اپیلوں کو عقلی دلائل سمجھنے لگتے ہیں تھیٹر اور سینما میں کھیل دیکھتے ہیں لیکن اوچھے اور گھٹیا کھیلوں اور اعلیٰ درجے کے ڈراما میں اور بد مذاق گیتوں اور عمدہ موسیقی میں فرق نہیں کر سکتے۔ یعنی ان کے ذوق و ذہانت کا معیار اس قدر گرا ہوا ہے کہ نہ وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ سائنس کے ان جدید آلات سے جن کا واقعی کام تہذیب کے خزانوں کو عام کرنا ہے لیکن یہ صورتِ حال ایک جمہوری سماج کے لئے سراسر خطرناک ہے کیونکہ اس کی کامیابی کے لئے شرط اول یہ ہے کہ رائے عامہ بیدار اور باخبر ہو تاکہ وہ اپنے مفاد کی نگرانی کر سکے اور اجتماعی پالیسی کے تعین میں حصہ لے سکے شاید ایک حکمی سوسائٹی میں عوام کی صحیح تعلیم اس قدر ضروری نہیں کیونکہ ان کا کام محض حکم کی پابندی ہے وہاں تو چند با اختیار لوگوں کا قابل تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہونا کافی ہے لیکن جہاں سماج کی تنظیم جمہوری اصولوں پر کی جائے اور فرد کی شخصیت کا احترام مدنظر ہو وہاں اس طرح تعلیم دینا ضروری ہے کہ وہ ان وسیع تر امکانات سے فائدہ اٹھا سکے جو اس سماج میں موجود ہیں آخر ایک جمہوری سماج کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ یہی کہ وہ تمام افراد اور جماعتوں کی نشو و نما کے لئے ایک موزوں ماحول مہیا کر لیتی ہے، فرد کی تربیت آزادی کے فضا میں کرنا چاہتی ہے انسانوں کو

ایک سانچے میں ڈھال کر خیالات میں یکسانیت پیدا کرنا نہیں چاہتی بلکہ تنوع کا خیر مقدم کرتی ہے اور افراد کی امتیازی خصوصیات کی نشو و نما چاہتی ہے کیونکہ اسی میں زندگی اور تہذیب کی دولت مندی کا راز پنہاں ہے وہ ہر معاملہ میں حکومت کی رائے کو منزل من اللہ بنا کر پیش نہیں کرتی بلکہ بحث و مباحثہ اور نقد و تنقید کی قائل ہے تاکہ تبادلۂ خیالات کے ذریعہ لوگ ظن و تخمین کی منزلوں سے گذر کر حق اور صداقت تک پہونچ سکیں جس حد تک ایک جمہوری سوسائٹی واقعتًا ان اصولوں کو پیش نظر رکھے گی تعلیم ان کا خیر مقدم کرے گی کیونکہ یہی چیزیں اس کے مقاصد میں بھی شامل ہیں یعنی شخصیت کا احترام اور اس کے بے اندازہ امکانات کا احساس، تلاش حق کا جذبہ اور امتیازی صفات کی نشو و نما کے ذریعہ تہذیب و تمدن کی رنگا رنگی۔

یہ جمہوریت کی مثالی تصویر ہے جس کو صرف وہی لوگ مسترد کر سکتے ہیں جو سرے سے ان قدروں کے قائل ہی نہیں، لیکن اس پر جو تنقید اور اعتراض عام طور پر کئے جاتے ہیں ان میں جمہوریت کی وہ ناقص شکل پیش نظر ہوتی ہے جو آجکل دنیا میں پائی جاتی ہے واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک بیشتر قومیں صرف سیاسی جمہوریت کی منزل تک پہونچی ہیں جس کی بدولت ہر شخص کو انتخاب میں رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے لیکن یہ رز کھا پھیکا حق انہیں کہاں تک لے جا سکتا ہے؟ اس کا نتیجہ محض اتنا ہوا ہے کہ انسانوں کے بجائے ان کے ووٹوں کی قدر ہونے لگی ہے جن کو حاصل کرنے کے لئے اہل غرض ہر طرح کے جائز اور ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں سیاست کے خود غرض بازی گر، دولت کے بے درد پجاری قوت و اختیار کے بے اصول طالب اور اخباروں کے ضمیر فروش مالک سب اپنے اپنے مطلب کے لئے عوام کو بے وقوف بنا کر انہیں ان کے حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اکثر اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بعض احساس مند لوگ سرے سے جمہوریت ہی کے مخالف ہو گئے ہیں لیکن دراصل مخالفت ان اسباب کی کرنی چاہیئے جن کی وجہ سے جمہوریت عوام کے حق میں کام نہیں کر پاتی بلکہ مخصوص مفاد اور اغراض کا آلۂ کار بن کر رہ گئی ہے جب تک یہ صورت حال قائم ہے واقعتًا "جلال بادشاہی" اور "جمہوری تماشے" میں کوئی خاص فرق نہیں لیکن یہ تصور جمہوریت کے حقیقی تصور کا نہیں، بلکہ اس ناقص اور نامکمل جمہوریت کا ہے جس پر دنیا قانع ہو گئی ہے۔ جمہوریت کے پورے امکانات اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتے جب تک اس کی بنیادیں وسیع نہ کی جائیں

اور جو اصول سیاست کے میدان میں تسلیم کیا گیا ہے یعنی تمام افراد کو یکساں حقوق ملنے چاہئیں وہی معاشی اور تہذیبی زندگی میں کارفرما ہو۔ جب تک دنیا کے مادی وسائل اور تہذیب کی دولت کی منصفانہ تقسیم نہ ہوگی۔ سیاسی حقوق کی نام نہاد برابری بالکل بے معنی ہے۔ عدل و مساوات کا یہ مطالبہ نہ صرف اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو عقل و انصاف کی رو سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ محتاجی اور فاقہ کشی اور دوسری مادی محرومیوں سے محفوظ رہے۔ بلکہ یہ وجہ بھی ہے کہ انسانی زندگی کی مادی بنیادوں کو استوار کئے بغیر تہذیبی زندگی کی عمارت بھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔ جب تک اقتصادی کشمکش اس قدر سخت اور شدید ہوگی کہ انسان کا سارا وقت اور توجہ اور اس کی تمام قوتیں اس میں اسیر ہو کر رہ جائیں وہ نہ تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے نہ اس کے خزانوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر کی ایک بڑی خوبی اور صداقت یہ ہے کہ اس میں انسانی تہذیب اور معاشرتی اور اقتصادی حالات کے باہمی رشتے کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کی جس نے سرمایہ داری نظام میں جنم لیا ہے، بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے سائنس اور صنعت و حرفت کے وسائل سے کام لے کر اقتصادی، سماجی اور تہذیبی جمہوریت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک جماعتی تصور سے مغلوب ہو کر اس کے مفکروں اور وکیلوں نے اس چیز کو غیر ضروری یا ناممکن قرار دے دیا یہ دونوں الفاظ علیحدہ علیحدہ تشریح طلب ہیں کیونکہ جب تک اس سماج کے تصور میں وضاحت پیدا نہ ہو جس کی تعمیر میں تعلیم کو حصہ لینا ہے اس وقت تک مستقبل کی تعلیم کے خد و خال بھی صاف نظر نہیں آئیں گے۔

کیا ایسے سماج کی تشکیل غیر ضروری ہے؟ یہ بحث دراصل فلسفے، اخلاق اور انسانی اعیان کی ہے اور منطق کے ذریعہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ دنیا کے مادی وسائل اور علم، آرٹ اور تہذیب کی دولت کو سب انسانوں کے لئے کھول دینا اس کو کسی خاص طبقے یا بعض افراد تک محدود رکھنے سے بہتر ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب سے انسان نے اخلاقی شعور کی منزل میں قدم رکھا ہے مذہب اور اخلاق کی اور دنیا کے تمام نیک اور شریف انسانوں کی تعلیم یہی رہی ہے کہ "اپنے" اور "غیر" کے فرق سے بلند ہو کر انسانی وحدت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ اور جو اچھی چیزیں ہم خود اپنے لئے چاہتے ہیں وہی اپنے ہمسایوں کے لئے طلب کرنی چاہئیں البتہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ "ہمسائے" کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اس زمانے میں جب نقل و حرکت کے

جدید وسائل اور کاروبار اور صنعت و حرفت کی بین الاقوامی تنظیم نے دنیا کو سمیٹ کر فاصلے کا احساس ختم کر دیا ہے۔ "ہمسایہ" کی تعریف میں صرف وہی لوگ شامل نہیں جو ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں اور جن کی شکل و صورت اور روزمرہ کی زندگی سے ہم واقف ہیں بلکہ انسانی کنبے کے تمام افراد خواہ وہ کسی قوم یا مذہب یا ملک کے ہوں اس میں آجاتے ہیں۔ ایک مشہور سوال جو فکر انسانی کا ایک مستقل جزو بن گیا ہے وہ یہ ہے کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" اس کا جواب یقیناً یہ ہے کہ میں ہوں اور دنیا میں جس قدر انسان ہیں وہ سب میرے بھائی بہن ہیں اور جب تک میں ان کے آرام اور آسائش اور ان کی تعلیم و ترقی کے لئے کوشش نہ کروں۔ میرا ذاتی آرام اور آسائش بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی گیا تو بے کار اور بے فیض ہے" اس زمانے میں واقعاً صورتِ حال کا تقاضہ یہ ہے کہ یا تو مل جل کر کام کرو ورنہ فنا ہو جاؤ گے۔ سب کا بھلا چاہو ورنہ تمہارا بھی بھلا نہ ہو سکے گا۔ اجتماعی ذمہ داری کے اس اصول کو قرآن شریف کی ایک آیت میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "اس آگ سے ڈرو کہ اگر وہ بھڑکی تو تم میں سے صرف اُن لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے خاص کر کے ظلم کیا ہے بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے" یعنی ظلم اور بے انصافی کے ساتھ معاملہ کر لینا یا اس کو چپ چاپ سہ لینا بھی اتنا ہی بڑا اخلاقی اور معاشرتی جرم ہے جس قدر ظلم میں فعالی حیثیت سے شریک ہونا۔ لہٰذا دوسروں کی بہبود کے لئے جد و جہد کرنا اور ان کی محرومیاں دور کرنے کی کوشش کرنا دراصل خود اپنے تحفظ اور ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔

موجودہ تہذیب کے یقیناً بہت بڑے بڑے کارنامے ہیں لیکن اس نے اپنی فراغت اور آسودگی اور تہذیب کی دولت کو بعض خاص طبقوں تک محدود رکھا ہے اور باقی کو کسی بلند سماجی سطح پر لانے کے لئے کوئی منظم جد و جہد نہیں کی۔ اس لئے نگاہِ حقیقت شناس میں اُن لوگوں کی دولت چوری کے مال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اُن کی تہذیب سطحی اور کھوکھلی ہے۔ یہ لوگ اپنے ایک مصنوعی گوشۂ عافیت میں محصور ہو کر ان چیزوں سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں لیکن ان کے گرد و پیش کی زندگی جو افلاس و جہالت، بیماری، اور ذہن و ذوق کی کم مائگی سے عاجز آئی ہوئی ہے ان کے قلعوں کے چاروں طرف بھری ہوئی منڈلا رہی ہے۔ کیا اس حالت میں کوئی دردمند دل اس عام بدنصیبی اور محرومی سے اثر لئے بغیر رہ سکتا ہے؟ مجھے اکثر ایک مصنف کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ہم لوگوں دیعنی اونچے

طبقے والوں کی زندگی میں جو کچھ جلوہ تہذیب و نفاست کا نظر آتا ہے وہ عوام کی تیرہ و تار زندگی کو نچوڑ کر حاصل کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس تہذیب اور نفاست کی بنیاد دوسروں کی محرومی اور تصرف بے جا پر رکھی گئی ہو وہ کبھی دیر پا یا حیات بخش نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا انصاف اور شرافت اور دانش مندانہ خود غرضی سب کا تقاضا یہی ہے، کہ مستقبل کے معاشرتی نظام میں کسی ایک جماعت کے مخصوص مفاد کا اہتمام نہ کیا جائے بلکہ ایک ایسا ماحول تیار کرنا چاہیئے جس میں سب لوگوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کی مناسب نشو و نما کا انتظام ہو اور اس طرح عام خوش حالی اور تہذیب کا معیار بلند کیا جائے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ آیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا اثباتی جواب اخلاق مذہب کے تقاضوں کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت حال کی بنا پر دیا جا سکتا ہے، سائینس اور صنعت و حرفت کی حالیہ ترقی سے پہلے انسان بڑی حد تک فطرت کی قوتوں کا غلام تھا اور احتیاج کی زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ فطرت کی آغوش ہر قسم کے مادی خزانوں اور قدرتی طاقتوں سے پُر تھی لیکن یا تو اس کی وہاں تک رسائی نہ ہوتی تھی یا وہ انہیں حاصل نہ کر سکتا تھا یا ان سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا اس لئے اس کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ مادی اور تہذیبی زندگی کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایسی فراوانی کے ساتھ اسباب مہیا کر سکے کہ وہ سب انسانوں کے لئے کافی ہوں اور تھوڑی سی ضروری اور قابل قدر چیزوں کے بہت سے طلبگار تھے اور اس کا نتیجہ چھین جھپٹ، تصرف و تغلب جماعتی کش مکش اور مقابلہ اور رقابت کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ کام کی تہہ میں بالعموم یہ جذبہ نہ تھا کہ نوعِ انسانی کی خدمت کی جائے یا اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار کیا جائے بلکہ یہ جذبہ محرکہ ذاتی کمانا تھا خواہ اس کی وجہ سے دوسروں پر کچھ بھی گذرے۔ یہ خیال اس قدر شدت کے ساتھ لوگوں کے ذہن پر مسلط ہے کہ وہ نفع کمانے کے علاوہ کسی اور بہتر قوت محرکہ کے وجود ہی سے منکر ہیں یا کم سے کم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ عام ہو سکتا ہے۔ بہر حال ماضی میں جو صورت رہی ہو، گذشتہ نصف صدی میں سائنس کی ترقی اور اس کے استعمال سے حالات بالکل بدل گئے ہیں اور انسان کے ہاتھ میں اس قدر قوت آگئی ہے کہ اگر وہ اسے سمجھداری اور انصاف کے ساتھ استعمال کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانوں کی اکثریت اپنی زندگی کو کولھو کے بیل کی طرح محض روزی کا چکر لگانے میں ضائع کرے اور علم، تہذیب، اور آرٹ کے ان تمام بیش بہا خزانوں سے محروم رہے

جہاں انسانی کی جدوجہد سے حاصل ہیں، بھاپ، بجلی اور پٹرول کی بدولت انسان کی قوت پیداوار میں ہزاروں گنا اضافہ ہوگیا اور اگر ایٹم کی قوت بھی اس کے ہاتھ میں آگئی اور اس نے اس کو خودکشی کے لیے استعمال نہ کیا تو یہ طاقت لاکھوں گنا زیادہ ہو جائے گی۔ اس وقت بھی ماہرین فن کا یہ اندازہ ہے کہ سائنس اور دانش مندی کے امتزاج سے (جو بدقسمتی سے اب تک نہیں ہو سکا!) دنیا کا کام اس طرح منظم کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص دن میں صرف چار گھنٹے کام کرے اور انسانوں کی تمام مادی ضروریات پوری ہو جائیں اور اس شان سے پوری ہوں کہ سب لوگ اطمینان، خوش حالی اور اعصابی آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ جو چیز ہمارے اس منزل تک پہونچنے میں حائل ہے وہ نہ فطرت کی تنگ دستی اور بے مہری ہے، نہ انسانی فطرت کی ناقابل علاج خود غرضی، وہ عام انسانوں کی جہالت اور بے بسی ہے جو ان کو حقیقت حال سے بے خبر اور اتحاد عمل سے دور رکھتی ہے اور ارباب اختیار کی خود غرضی، چالاکی اور اخلاقی بے حسی ہے جو اس معاشرتی المیہ سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کو اپنے مصالح کے خلاف سمجھتی ہے۔ یعنی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے سامان سب موجود ہے لیکن دماغ میں روشنی اور دل میں گداز نہیں جو اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس صورت حال کا نہایت معنی آفریں نقشہ علامہ اقبال نے اپنی ایک چھوٹی سی نظم میں کھینچا ہے جس کا عنوان ہے "دور حاضرہ کا انسان"

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار　　　عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عصر حاضر کے ہنرد آزما مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے محض ذہن بیدار کافی نہیں بلکہ (اگر میں مذہبی اصطلاح استعمال کر سکتا ہوں تو) قلب مومن کی ضرورت بھی ہے جس میں اس احساس کی شمع روشن ہو کہ "تمام انسانوں کی متاع مشترک ہے جس کو بعض افراد یا خاص طبقوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس احساس کو صوفیائے مشرق کی اصطلاح اور اقبال کی شاعری میں "عشق" کہا گیا ہے جو وجدانی طور پر ان گہری حقیقتوں تک پہونچ جاتا ہے۔ جہاں عقل کی رسائی نہیں ہوتی اور انسانی وحدت

سچا احساس انہیں گہری حقیقتوں میں سے ایک ہے اس میں وہ تمام اخلاقی اور سماجی قدریں پنہاں ہیں جو انسان کی زندگی کو حیوانوں کے معیار سے بلند کر کے انسانیت کے صحیح مقام تک لے جاتی ہیں اور جنگل کے بے امان قانون کے بجائے انصاف کا شریفانہ قانون رائج کرتی ہیں، جب تک انسان اس اخلاقی شعور میں ترقی نہ کرے اس کی ذہنی ترقیاں نہ صرف بے فیض ہیں بلکہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں، جیسا گذشتہ سو برس کی تاریخ نے ثابت کر دکھایا ہے، ایک فرانسیسی مفکر ڈاکٹر میرٹ کا یہ قول دہرانے اور غور کرنے کے قابل ہے۔ یعنی اصلی ترقی وہ ہے جو انسان　　　　کی صفت میں کرتا ہے اس کے مقابلے میں باقی تمام ترقیاں ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہاں　　　　کا لفظ جس معنی میں استعمال ہوا ہے اس میں رواداری انسان دوستی، وسیع القلبی۔ دردمندی، محبت، مروت، غرض وہ تمام صفات شامل ہیں جن کی وجہ سے ایک انسان دوسروں کے درد دکھ کو اپنا سمجھ کے اس میں شریک ہو جاتا ہے اور جن کی بدولت وہ رقابت اور نفرت کی خلیج کو رفاقت اور مفاہمت کے پلوں سے پاٹ دیتا ہے، انسان کی تمام ترقیوں کو پرکھنے کے لئے یہی ایک کسوٹی ہے کہ آیا ترقیاں انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں اور ان کی سوئی ہوئی انسانیت جگاتی ہیں یا ان میں زیادہ فصل پیدا کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے بعض علوم و فنون کی ترقی بغیر مقدم کے قابل ہے، مثلاً طب کی جدید دریافتوں نے انسان کو بہت سی بیماریوں سے نجات دے کر اس کے دکھ میں کمی کی ہے۔ اور اس کی صحت اور عمر میں اضافہ کیا ہے علم نفسیات کے جدید مشاہدوں اور تحقیقات کی بدولت سب مجرموں، پاگلوں اور نارمل منکف بچوں کی دماغی حالت بہتر طریقے پر معلوم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہم ان کے ساتھ زیادہ ہمدردی اور سمجھداری کا سلوک کرتے ہیں۔ اور ان سے زیادہ قابل مواخذہ ان سماجی حالات کو سمجھتے ہیں جو اس بدنفسی کا باعث ہوئے ہیں اسی طرح مزدوروں کے حقوق اور ان کی صحت وغیرہ کی حفاظت کے لئے قوانین پاس کئے گئے ہیں یہ تمام ترقیاں اس لئے قابل قدر ہیں کہ ان کی پشت پر انسانی ہمدردی کا جذبہ ہے اور اس حقیقت کا احترام کہ تمدن کی بنیاد انصاف پر رکھنی چاہیئے۔ برخلاف اس کے بعض تکنیکی ترقیاں ایسی ہیں جن کا فائدہ امکانی ہے یقینی نہیں مثلاً صنعت و حرفت کا نیا نظام یا وسائل آمد و رفت کی

سرعت یہ اسی حد تک خیر و برکت کا باعث ہیں جب تک اس جذبے کے تابع رہ کر کام کریں لیکن بعض ایسی ہیں جو دنیا کے لئے سراسر تباہی اور بربادی کا باعث ہوتی ہیں، مثلاً فن جنگ اور آلات جنگ میں ترقی جس کا شاہکار وہ ایٹم بم ہے جس نے صدیوں کے اخلاقی اصولوں اور مروتوں کو چشم زدن میں بھلا دیا یا سرمایہ داری کی وہ تنظیم جس نے سماج میں احتیاج اور افلاس کو وحشت جمع کر دیا ہے یا نسل اور رنگ اور قوم اور مملکت کے نامبارک بتوں کی پرستش جس نے انسانوں سے ان کی ذہنی آزادی اور اخلاقی احساس دونوں کو چھین لیا ہے اور ان کے درمیان ایسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ انسانی وحدت کا تصور لوگوں کو ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے۔

اس مسموم فضا سے متاثر ہو کر تعلیم بھی اکثر اپنے راستے سے بھٹک جاتی ہے کبھی تو اس قدر اعلان اور دیدہ دلیری کے ساتھ جیسے جرمنی یا اٹلی میں ہوا اور زیادہ تر ایسے خاموش اور غیر محسوس طریقے پر کہ لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ آج کل بھی باوجود ان بلند آہنگ دعووں کے جو کئے جا رہے ہیں اکثر ملکوں میں (جن میں جمہوری اور کلی ملک سبھی شامل ہیں!) تعلیم اُن فاسد خیالات سے متاثر ہو کر بجائے ایک عالمگیر   کی تلقین کرنے کے محبت، مروت اور ہمدردی کو جغرافی حدود میں مقید کرنا چاہتی ہے۔ گویا رواداری سے اصولاً اچھی چیز ہے لیکن اختلاف رائے کرنے والوں کے ساتھ رواداری برتنا شرافت نہیں بلکہ کمزوری ہے! گویا ہمدردی کے استعمال میں اول خویش بعدہٗ درویش کا طریقہ بھی غلط ہے اور اس کا آغاز و انجام خویش ہی تک رہنا چاہیئے۔ گویا انصاف کو محض ذاتی اور انفرادی معاملات میں برتنا چاہیئے۔ جماعتی تعلقات کا اور کاروبار میں اس پر کاربند ہونا ضروری نہیں اور بین الاقوامی سیاست میں اس سے کام لینا خارج از بحث ہے۔ کیونکہ امن کے زمانے میں ایسا کرنے سے قومی مفاد کے لئے خطرہ ہے اور جنگ کے زمانہ میں اس کا نام لینا بھی جرم ہے جس معاشرت کی بنیاد اس قسم کے خیالات اور عقائد پر رکھی جائے گی اور تعلیم نام نہاد انفرادیت اور حُبِ وطن کی خاطر ان قدروں کو اشاعت کرے گی۔ اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ اس دعوے کا ثبوت دینے کے لئے کسی دلیل یا حجت کی ضرورت نہیں۔ گذشتہ تیس سال کی تاریخ میں یہ حقیقت خون کے حرفوں میں لکھی جا سکے گی موجود ہے! لہٰذا زمانے کی حالت اور ضروریات اس امر کی مقتضی ہیں کہ ہم اپنی تعلیم کے اخلاقی نصب العین میں ایک

انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس انقلاب کی رہنمائی کے لئے ایک مرکزی خیال کی ضرورت ہے جو مختلف اور منتشر رجحانات میں یکسوئی پیدا کر سکے۔ تہذیب کی تاریخ کے مختلف زمانوں میں مختلف مرکزی خیالات کا تسلط رہا ہے اور انہوں نے ہی اپنے زمانہ کو ایک مخصوص انفرادیت بخشی ہے مثلاً قدیم یونانی تہذیب اور چینی تہذیب اور مغل تہذیب کے ایک دور میں حسن شناسی اور حسن آفرینی کو، جو یقیناً ایک قدر مطلق ہے، زندگی میں مقام اعزاز حاصل تھا بعض زمانے ایسے گذرے ہیں جس میں سب سے زیادہ زور تلاش حق اور طلب علم پر دیا گیا ہے۔ یورپ کے دور تاریکی کے بعد اسلام کی علمی ترقیاں اور اس زمانے میں مختلف علوم بالخصوص سائنس کا فروغ اس رجحان طبیعت کے مظاہر ہیں لیکن ہم اس وقت انسانی ارتقاء کے جس نازک دور میں سے گذر رہے ہیں اس میں خیر کی قدر مطلق کو حسن اور حق کی اقدار مطلقہ پر فوقیت حاصل ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے اخلاقی اور سماجی مسائل ہمارے علمی اور جمالی مسائل سے بھی زیادہ اہم اور توجہ طلب ہیں اور خیر کے بھی اس وسیع تصور پر زور دینے کی ضرورت ہے جو انفرادی زندگی کے معاملات تک محدود نہو بلکہ جماعتی اور بین الاقوامی تعلقات پر بھی محیط ہو اور جس کا جذبۂ محرکہ یہ ہو کہ دنیا میں عدل کی حکمرانی قائم کرنی ہے۔ اس آئیڈیل کے سامنے دوسرے تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی پرکھ بھی اسی کسوٹی پر ہوگی کہ وہ کس حد تک اس مرکزی جذبے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یعنی حسن آفرینی ایک اچھی چیز ہے لیکن اگر وہ چند افراد یا کسی خاص طبقے کا سرمایہ تعیش بن کر رہ جائے اور عوام کی زندگی آرٹ کے جلووں سے بالکل محروم ہو تو نگاہِ نکتہ سنج میں اس کی کوئی وقعت نہیں اسی طرح علم وعقل کی ترقی انسانی ارتقاء کا ستون ہے اور اس کے بغیر انسانی زندگی تاریک ہے لیکن اگر علم پوری سماجی زندگی کی آبیاری نہ کرے اور کچھ لوگوں کے ہاتھ میں آکر دوسروں کی حق تلفی اور تصرف کا ذریعہ بن جائے تو وہ محض بیکار ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے اس علم کی لگام بھی خیر کے ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے۔

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست — نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

اور اس ضمن میں "مومن" کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ عدل کا علمبردار ہے اور ظلم اور ناانصافی کا دشمن خواہ وہ دنیا میں کہیں پائی جائے۔ وہ اس بارے میں نسل یا رنگ یا مذہب یا جغرافیہ کی حد بندی کا قائل نہیں وہ سچ کا ساتھ دیتا ہے خواہ وہ اس کے نفس کے خلاف ہو اور حق کی حمایت کرتا ہے خواہ وہ اس کے جماعتی اور قومی مفاد کے لئے مضر ہو وہ محاسبہ نفس کے

ناگوار فرض سے نہیں کتراتا اور اپنی خوبیوں سے زیادہ دوسروں کی خوبیوں اور دوسروں کے عیوب سے زیادہ اپنے عیبوں پر نظر رکھتا ہے اس میں حب وطن کا جذبہ صادق ہوتا ہے وہ اپنی اخلاقی اقدار اور اپنے علمی کارناموں پر فخر کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں کی اچھی باتوں کا معترف اور اپنی کمزوریوں کا نقاد بھی ہے۔ جب تک تعلیم ایسی متوازن اور انصاف پسند طبیعتیں پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوگی، اس وقت تک نہ تعلیم کی گتھی سلجھے گی نہ معاشرت کی۔

تعلیمی مضامین

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ۲۵ سالہ روئداد

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ۲۵ سالہ جشن سیمیں کے موقع پر شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نے جو روئداد پیش فرمائی اسکی پہلی قسط آپکے ملاحظہ کے لئے ذیل میں درج کی جاتی ہے اس کی زبان اور ادبی نکات کے علاوہ اس میں جو تعلیمی گر موجود ہیں وہ عصر حاضر کے معلموں کے لئے روشن درس ہیں۔

(ادارہ)

(خاص تعلیم جدید کے لئے)

اعلیٰ حضرت، محترم امیر جامعہ، خواتین اور حضرات۔

آج مجھے آپ کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچیس سالہ روئداد کا خلاصہ پیش کرنا ہے پچیس سال اور کیسے پچیس سال، یہ کام جب شروع ہوا تھا تو کتنے تھے جن کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس پر پچیس سال بھی گذر جائیں گے۔ خاصی طویل مدت ہوتی ہے پچیس سال کی اور پھر قوموں کی زندگی میں یہی پچیس سال ایک لمحہ سے بھی کم ہوتے ہیں، لیکن باوجود اپنی طوالت کے یہ زمانہ بے رنگ مرور کا مرادف بھی ہو سکتا ہے۔ اور حیات قومی کا بھی ایک لمحہ اپنی تخلیقی لمحہ ہونے کی وجہ سے صدیوں پر بھاری ہو سکتا ہے۔ ان گذرے ہوئے پچیس سال کی روئداد کس اسلوب سے پیش کروں، اس مدت میں عزائم اور فسخ عزائم، ولولوں، اور بدمزگیوں، مشقتوں اور سہل انگاریوں، دل بستگیوں اور دل شکستگیوں، شبہوں اور اعتمادوں، امیدوں اور مایوسیوں، تھپکیوں اور گھرکیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کو کیسی کیسی مثالیں سامنے آئی ہیں اور یہ سب لفظ جو میں نے بولے یہ صرف برائے گفتن نہیں ان میں سے سب کی مثالیں اس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں، اس روئداد میں ان کا ذکر کروں تو داستان بہت طویل ہو جائے گی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر خدمت قومی کا کوئی کام نیک نیتی کر

خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہر چند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دستگیری فرماتا ہے، متزلزل قدموں کو ثبات عطا ہوتا ہے، دل ٹوٹا بھی جاتا ہے مگر پھر جوڑا بھی جاتا ہے۔

دلِ شکستہ در آں کوئے می کنند درست
چناں کہ خود نہ شناسی کہ از کجا شکست

ان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا، شرط یہ ہے کہ عسر کو اس کی رضا جوئی میں جھیلا جائے اور یسر کو اسی کی راہ میں پیش قدمی کے لئے سہولت اور مرحمت جانا جائے۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کردوں، آپ سب کو یاد ہوگا اس لئے کہ باوجود حافظہ کی معروف ناپائداری کے وہ آسانی سے بھلا سکنے کی بات نہیں کہ کوئی دس سال کی انتہائی ہیجانی اور تلاطمی بے چینی نے ۲۰ء میں مسلمانان ہند کی ایک عمومی حرکت نے تحریک خلافت کو شکل اختیار کی، ساری دنیا میں ملت اسلامیہ پر جو گذر رہی تھی اس سے ہندوستان کے مسلمان بےخبر اور غیر متاثر تھے۔ اپنی جماعتی خدمت کی زبونی سے بھی باوجود صد غفلت، یہ آنکھیں بند نہ کرسکتے تھے مایوسی بھی تھی، غصہ بھی تھا، اور بے ہاتھ پاؤں مارے اپنے خاتمہ کا خیر مقدم کرنے کو بھی یہ تیار نہ تھے کہ جسم جماعتی میں کہیں زندگی کی رمق باقی تھی اور جس طرح کسی شدید مرض کے حملے میں جسم اپنی ساری قوتوں کو سمیٹ کر ایک بار دفع مرض کی جان توڑ کوشش کرتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ ہندیہ نے اپنی ساری ناتوان توانائیوں کو مجتمع کرکے صورت حال کے مقابلہ کا تہیہ کیا تھا جس طرح جسم کے سارے نظام ہائے اعضا اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس کی اس مصیبت میں آخری معرکہ کے لئے کمربستہ ہوکر کتابوں اور حکیموں کے اندازہ سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں اسی طرح جسم اجتماعی کا حال ہوتا ہے۔ اس تلاطم کے زمانہ میں مسلمانان ہند نے اسی قسم کی ایک کوشش کی تھی، تعلیمی نظام اعضا کے فعل کا نتیجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے، تعلیم کے کام کا پرسکون دھیا ہے اور ایک انقلاب انگیز سیاسی ملی کی ہنگامہ آرائی کا یہ تعلق بادی النظر میں کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس دورِ انقلاب میں جامعہ کے نام سے اُن عام نیم شعوری اور تحت شعوری تعلیمی منصوبوں نے ایک شکل اختیار کی، جو ایک عرصے سے مسلمانوں کے اہل فکر و عمل کو ایک صحیح قومی تعلیمی نظم کے ترتیب دینے پر اکسا رہے تھے۔ اس میں محمد قاسم کی تمناؤں، سید احمد خاں کی آرزوؤں، سید محمود کی تجویزوں، وقارالملک کے ارادوں اعلیحضرت کی سلطانیہ کالج جیسی اسکیمیں عرض خدمت اور احیائے ملت کی بہت سی چھوٹی بڑی کوششوں کا پرتو ہے

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفہ بنیادی سے غافل نہیں ہے، اور جب بھی اپنی زندگی کے باقی رہنے اور ترقی دینے کی غرض متوجہ ہوتی ہے تو اسے تعلیم اور صحیح تعلیم ہی کی راہ پر گامزن ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہماری قومی زندگی کا شیرازہ جو خود ہمارے ہاتھوں بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، بکھرا تو ہم نے دیوبند اور علی گڑھ میں اسے پھر سے جوڑنے کی سعی شروع کی۔ اس صدی کے ربع اول میں مسلمان جس عالمگیر ابتلا میں رہے اس میں انہوں نے جامعہ ملیہ قائم کی۔ یہ قوم میں صحیح زندگی کے ہونے کا ثبوت ہے لیکن اس رمق زندگی کا یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب صحت کا کچھ شائبہ بھی جسم جماعتی میں ہو تو وہ اپنے ہیجانات کا اظہار ہسٹریا جیسے تشنجی ہنگاموں میں نہیں کرتی بلکہ اس بحرانی قوت کو دھیمے دھیمے مگر منزل مقصود کی طرف یقینی طور پر چلنے والے ارادوں کا خزانہ توانائی بنا دیتی ہے۔ یہ سبق ہے ہماری قوم کو کہ وہ اپنے جوش و خروش کو گھنٹوں اور دنوں کے اندر خالی نعروں اور جلسوں میں منتشر کرنے بلکہ صبر طلب و صبر آزما تعمیری مساعی میں اسے برسوں، قرنوں بلکہ صدیوں پر پھیلانا سیکھے۔ میں نے کہا کہ یہ جامعہ ثبوت ہے اور سبق۔ البتہ بہت ہی کمزور سا ثبوت اور بہت ہی روکھا پھیکا سبق۔ کیا عجب ہے کہ تائید ایزدی ہو تو کام کرنے والوں کی استقامت اور قوم کی پذیرائی اس ثبوت کو بہت قوی اور اس سبق کو بہت دل نشین بنا دے۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس جامعہ میں احیائے ملی کی بہت سی تعلیمی تجویزوں کا سنگم ہے اس حقیقت کا اظہار تھا ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم مغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دارالعلوم کی مسجد جامع میں اس کام کا افتتاح۔ عجب زمانہ تھا وہ خدا نشہ جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔ یہ جرمانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی دیتے تھے۔ خودغرضوں کی ہر وقت جکڑے رہنے والی زنجیروں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے متلاشی سفارشوں کے لئے سرگرداں اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کر دیں اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت کے لئے وقف کر دیں لیکن عمر بھر خودغرضی کی تکرار سے بے غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی۔ اس بے غرضی کا رخ بھی جاذب توجہ ہنگاموں کی طرف گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف تقریروں کی طرف نئی نئی وضع کے لباسوں کی

طرف بڑھا جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت اس جوش اور اس خلوص کو ایک پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے اور میں متعدد ساتھیوں کے بھی جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود و قامت، قید، جلاوطنی، علالت و تفکرات جنہوں نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے لیکن جس کی روشن آنکھیں یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے سب کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے۔ ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سرد سامان کو چھوڑ کر بے سرو سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ یہ دنیتی فائدہ کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرۃ زیادہ عزیز تھی؛ وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا۔ ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔

اس کام کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے وابستہ رہے، حکیم اجمل خاں مرحوم اس کے پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے۔ اور مولانا محمد علی مرحوم پہلے شیخ الجامعہ، حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری، خاموش خدمت کا سبق دیا، حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں۔ اور ان کی نظر حال کی ترقیوں اور مستقبل کے امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو، ہم نے ان سب قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور ہونے کا سبق سیکھا، حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دلفریب تبسم کے پردے میں یوں چھپانا جانتے تھے جیسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے۔ تکلیف میں مسکراتے رہنے کی عادت ہم نے ان سے سیکھی۔

پھر مولانا محمد علی اس عہد کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنہیں قدرت نے ذہنی قوتوں کے ساتھ تعب و درد کی بیتابی بھی ارزانی فرمائی ہے اُن کا ذہن انہیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انہیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے۔ جامعہ کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانے فرزانے کی شاگردی اور رہبری کا بھی شرف حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمی قلب ملی جو مایوسیوں میں امیدوار اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے اور اگر چہ بے کسیگی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پا کر بسا اوقات لیکے لیکن ہمہ دولتے ہم پر ترس کھایا اور زبانِ حال سے فرمایا۔

بر سادگی تو جسم آدم دریں بازار
کہ تنگ دستی و امیدواری گذری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دل شکستہ ویران قدر کرنا سکھا دیا تھا اور ہم بھی عرفی ہی کے الفاظ میں اپنے منکیشل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ۔

عرفی دلِ آباد بہ یک جو نہ خرد عشق
من ہم دلِ ویراں بہ دو عالم نفروشم۔

لیکن مولانا محمد علی زیادہ دن جامعہ میں نہ رہ سکے تھے کہ سیاست نے انہیں پھر طلب کیا اور ہمارے ملک میں تو سیاست کا انجام اکثر قید و بند اور دار و رسن کی شکل میں ظاہر ہوا ہے کراچی کے مشہور مقدمہ کے بعد مولانا قید کر لئے گئے اور ہمارے کام کی باگ عبد المجید خواجہ صاحب نے سنبھالی ہماری خوش قسمتی ہے کہ خواجہ صاحب امیر جامعہ کی حیثیت سے آج ہم میں موجود ہیں اور میں جامعہ کے تمام کارکنوں کی طرف سے ان کی خدمت میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ ان کی رہنمائی نے جامعہ کو اس ڈھنگ پر چلا دیا جس پر وہ آج تک چلتی رہی ہے، خواجہ صاحب نے جامعہ کے خالص تعلیمی مشن کو سب سیاسی کام کرنے والوں سے منوایا۔ اور جامعہ نے تہیہ کیا کہ وہ تعلیمی کام کو تعلیمی کام کی حیثیت سے کرے گی، اور اس میں تعلیمی آزادی کو بطور اصول بنیادی کے ہمیشہ پیش نظر رکھے گی۔ اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی او غیرت مندی کا اصول سیاست کی دھوپ چھاؤں سے

بے تعلقی آ گئی اور وقتی منصوبوں اور پائیدار اور دیر طلب کاموں میں مؤخر الذکر کی اہمیت کا اقرار
نہ ہونے کے لئے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے اور اگرچہ بسا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں
پیدا ہوئیں لیکن دلیری سے اس پر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینیوں کو بھی ان کی نکتہ چینیوں کا
قصور دکھائے بغیر مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ
ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست خصوصاً ہمارے ملک
میں ایک پہاڑی نالہ ہے۔ آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے تعلیمی کام ایک دھیمے
دھیمے بہنے والا سدا بہار دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بلکہ گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے
دلوں کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کر لیتا ہے۔ سیاست استحکام وجود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً
ہنگامی ہے، اقتدار اور طاقت کی عاشق ہے لازماً صبر طلب۔ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب
رکھتی ہے جو ... سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت، اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم
سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت، سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا
پہلا منصوبہ ہی اتنا لمبا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے راہرو کا
رخ متعین کرتی ہے۔

ملالِ عالمیاں دم بدم دگرگون است
منم کہ مدت عمرم بیک ملال گذشت

بہرحال جامعہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی خارجی اثرات سے جو
تعلیمی آزادی میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے
دور میں کہ شاید تنگ دستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو اور رک رک کر آگے بڑھنے
کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو ہاتھ سے نہ دیں گے

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفہ کو کماحقہٗ ادا کرنے کے
لئے آزادی کی ضرورت ہم پر آغاز کار ہی میں روشن ہو گئی تھی۔ اس وظیفہ کو ادا کرنے کا کام بڑا
دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہو گیا جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب
شیخ الجامعہ کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے اور پھر کچھ عرصہ بعد حکیم اجمل خاں صاحب کا سایہ ہمارے
سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب ہو گا اس سے ہمارے
کام کو روح اور اس کے اسلوب کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر انصاری

انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے ان کی محبت اور شفقت ان کی فراخ دلی اور ان کی ہمدردی اُن کی بُرائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ میں اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے۔ اور ہم شکر گذاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیت خلافت اٹھاتی رہی لیکن سیاسی دریا کے اتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا۔ حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لئے وسائل فراہم کرتے تھے آخری زمانہ میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصہ قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کچھ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے میں نے خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورہ سے اُن کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ کے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف ابنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اس کے بند کرنے کا فیصلہ کریں تو مجھے اس فیصلہ کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرما دیں۔ تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارہ کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں۔ تو اس کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ ابنا کی خدمت میں بھیجا اور انہیں فیصلہ کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا۔ سیاسی ردِ عمل نے ساری امنگیں دبا دی تھیں۔ ایک عام انتشاری حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لئے جسے حکومت وقت بھی نہ کرتی ہو جو اپنی بے سروسامانی کے باعث خود بھی ظاہر بیں نظروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ کون روپیہ دینے پر تیار نظر آتا۔ چنانچہ ہمارے ابنا کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیئے، روپیہ فراہم نہیں کیا جا سکتا، اور بہت سوں نے کہ شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور خیرخواہ تھے اور یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصہ کو زندہ رکھنے کا خیال قابل تعریف تو ہے لیکن قابلِ عمل نہیں۔ اس خیال کو چھوڑ دو اور کوئی اور مفید کام کرو اس فیصلہ اور اس مشورہ میں تجربہ و زمانہ شناسی، مصلحت اور احتیاط سبھی کچھ ہو لیکن اور جرأت کی ضرورت تھی لیکن یہ چیزیں الحمدللہ کہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ میں نے اس خط کے ساتھ جس کا ذکر کیا۔ ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کرتے تھے۔ انہیں بتایا تھا

کر دیا گیا اور اساتذہ کا فیصلہ یہ بھی ہوگا کہ جامعہ کو بند کر دو۔ کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی حصہ کو بچا لیں۔ روپیہ نہیں ہے، قرض ہے، جلد روپیہ ملنے کی کوئی توقع بھی بظاہر نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں۔ بچوں کو بلا کر کم سے کم سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت برا ہوگا۔ کہیے کیا ارادہ ہے! ان کا جواب آیا۔ سب کا، بلا استثنا سب کا، کہ کام کو جاری رکھنا چاہیے اس وقت روپیہ نہ ہوگا۔ بلا معاوضہ کام کریں گے۔ ایک دوسرے کو سہارا دیں گے لیکن ایک بار کوشش کر کے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لیے ضروری تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا۔ لہٰذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان خوب ہوا، مہینوں کئی کو ایک پیسہ معاوضہ کا نہیں دیا جا سکا لیکن ہم سب نے جامعہ کے انتظام میں ایک بنیادی تبدیلی کر لی۔ سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہو گئے سب وہ جن کے دل کو لگی تھی اس کام کے ذمہ دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملی کے نام سے قائم کی گئی۔ جس میں چند بنیادی اساتذہ کے علاوہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے، ساتھیوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا، اس شرط پر کہ وہ بیس سال تک یا تا حیات اگر زندگی بیس سال سے پہلے ختم ہو جائے جامعہ کی خدمت کریں گے اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۰۰ روپے ماہوار سے زائد طلب نہ کریں گے۔ حالات نے آج تک کسی ایک رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔ اب انجمن میں ۲۲ ارکین ہیں اور ہمارے دوسرے ساتھی جو ابھی رکن نہیں ہیں وہ بھی ارکین ہی کی پابندیوں کے ساتھ جامعہ کے کام کو ایک اچھا عبادت کا کام سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے محترم مولانا ابو الکلام آزاد نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ مدراس کا دورہ فرمایا اور ان کے اثر اور کوشش سے مال محمد کی تنگی میں سے وہ سخت وقت گذر گیا۔

(باقی آئندہ)

نئی تعلیم

ڈیوئی کے نظریوں پر فلسفیانہ تنقید

یہ صحیح ہے کہ بیسویں صدی کی تعلیم پر ڈیوئی کا بہت زبردست اثر پڑا ہے لیکن یہ خیال کرنا درست نہیں ہے کہ امریکہ میں ہر جگہ ان کے نظریوں کو قبول کیا جاتا ہے۔ ان کے نظریہ کو زیادہ تر فلسفۂ عملیت اور فلسفۂ تجربیت کے پیرو مانتے ہیں لیکن واقعیت پسند اور عینیت پسند اس کو مسترد کرتے ہیں۔ فلسفۂ واقعیت کے پیرووں کے نزدیک زندگی کی شکل بدلنا اتنا اہم نہیں ہے جتنا حقیقی زندگی کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا ہے۔ لیکن تعلیمی میدان میں واقعیت پسندوں نے بہت کم کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے فکر کو زیادہ تر نظری فلسفہ تک محدود رکھا ہے۔ اس کے برعکس عینیت پسندوں نے تعلیم میں بھی زندگی اور پائداری کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے گروہ کی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ اس میں اٹلی کا گیورلی جنٹائل پہلے جرمنی اور اب سوئزرلینڈ کا پال گےہیب، فرانس کا وکٹر کزن اور انگلستان کا مے سنکلیر شامل ہیں۔ امریکہ کے عینیت پسندوں کی فہرست میں جوسیا رائس ڈبلیو ٹی ہیرس اور ہرمن ایچ ہارن شامل ہیں۔ ان میں ہارن ڈیوئی کا تیز لیکن ہمدرد نقاد ہے۔ ڈیوئی کی طرح ہارن نے بھی اپنے خیالات کو متعدد تصانیف میں ظاہر کیا ہے جن میں حسب ذیل شامل ہیں "تعلیم کا فلسفہ" "تعلیم میں عینیت پرستی" "اختیار اور انسان کی ذمہ داری" "نئی تعلیم" "جان ڈیوئی کا فلسفہ" اور "تعلیم کا جمہوری فلسفہ"۔ آخرالذکر کتاب سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی اور اس کا مطالعہ ڈیوئی کی کتاب "جمہوریت اور تعلیم" کے ساتھ بطور تنقید کے کرنا بہت ضروری ہے۔

عینیت پسندوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ تعلیم لازمی طور پر تقلید کا نام ہے لیکن وہ اس تصور کو بھی مسترد کرتے ہیں کہ تعلیم صرف خالقیت اور اختراعیت ہے۔ عینیت پسند کے نزدیک تعلیم کو تمام تر تقلید ہے نہ تمام تر اختراعیت۔ بچہ تقلید بھی کرتا ہے اور تخلیق بھی۔ جو باتیں اسے سادہ اور ظاہری حقیقت معلوم ہوتی ہیں انہیں وہ قبول کر لیتا ہے لیکن اسے

نئی قدروں کو پیدا کرنا بھی ضرور سیکھنا چاہیئے۔ فلسفۂ عملیت کے پیرؤں کی مخالفت میں عینیت پسند اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ تعلیم تجربہ کی تردید کا نام ہے۔ عینیت پسند کے نزدیک جس چیز کی تجدید ماننے سرے سے تعمیر کی جاتی ہے وہ تجربہ نہیں بلکہ سماجی اور انفرادی زندگی کا وہ مثالی نمونہ ہے جو تجربہ سے ماقبل موجود ہوتا ہے۔ عینیت پسند کے نزدیک انسان کی اپنی شخصیت آزاد ہے اور تعلیم کا کام یہ ہے کہ اس آزاد شخصیت کو نمو دے۔ جہاں تک امکانات کا تعلق ہے انسان کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے اس لئے اس کی تعلیم ہمیشہ ناقص رہتی ہے۔ لیکن عینیت پسند کے نزدیک تعلیم کی ایک قائم اور متعین منزل مقصود ضرور ہے اس کے خیال کے مطابق تعلیم محض نمو پذیری اور مسلسل مطابقت اور پھر از سرِ نو مطابقت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ لامحدود کی سمت نمو پذیری ہے لیکن فلسفۂ عملیت کے ماننے والے کو یہ چیز مبہم معلوم ہوتی ہے اور وہ اسے پوری طرح قابلِ عمل نہیں سمجھتا۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ عینیت پسند روح پر زور دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انسان محض علم حیات کے نامی وجود نہیں ہے بلکہ زندہ مشینوں سے زیادہ اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان زندہ روحیں ہیں۔ ہارن نے لکھا ہے "عینیت پسند زمین کو آسمان سے ملا دیتا ہے۔ انسان کو وہ لامحدود کی اولاد سمجھتا ہے۔ یہ ناقابلِ عمل بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔ یہ علم میں علم کی خاطر بھی اعتقاد رکھتا ہے اور زندگی کی خاطر بھی۔ یہ زندگی اور تعلیم کے لئے ایک ایسی مطلق منزل کو تسلیم کرتا ہے جس کی طرف چل کر انسان اپنا صحیح کھوج لگا سکتا ہے۔ یہ انسان کی الوہی ابتدا اور لاثانی انتہا کو قبول کرتا ہے۔"

جونس ایل مریم اور بچہ کی زندگی سے مربوط نصاب اور نظام اوقات

تعلیمی نظریہ کو عملی طور پر جدید شکل دینے میں جونس ایل مریم کا نام بہت ممتاز نظر آتا ہے ڈیوی کی طرح مریم نے بھی ۱۹۰۴ء میں ایک تجربی مدرسہ مسوری کی یونیورسٹی میں قایم کیا جہاں وہ بارہ سال تک ایک انقلابی نصاب کا تجربہ کرتا رہا۔ مریم کا عقیدہ تھا کہ تعلیم ایسی چیز نہیں ہے جسے باہر سے ٹھونسا جا سکے بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو بچہ کے باطنی امکانات کو ابھار کر باہر لاتی ہے ڈیوی کی طرح مریم بھی مروجہ تعلیم کی روایت پرستی کو توڑنا چاہتا تھا اپنے تجربہ کی سہولت کی خاطر اس نے مدرسہ کے نصاب اور مدرسہ کے فرنیچر کو خیرباد کہا اس کی خواہش یہ تھی کہ ایسا نصاب بنایا جائے جو بچہ کی زندگی سے مربوط ہو۔ اس نے مشغلوں کا پروگرام شروع کیا جس میں تفریحی سیر،

تیسری کام، مشاہدہ اور مباحثہ کا حصہ بہت اہم تھا۔ کچھ عرصہ بعد مریم اس نتیجے پر پہونچی کہ مدرسہ کے دن کو بغیر کسی قسم کی تقسیم کے رائج کئے چلانے، بنانا قابل عمل ہے چنانچہ آہستہ آہستہ مشاغل اور سامان کی ایک چوگونہ تقسیم رائج ہوگئی۔ یعنی (۱) مشاہدہ (۲) کھیل (۳) کہانیاں اور (۴) ہاتھ کا کام۔ ظاہر ہے یہ سب ہر برٹ کے مدرسہ کے مقابلے میں فرائبل کے کنڈرگارٹن سے زیادہ مشابہ ہے۔ مریم کا پروگرام اسکول کے دن کا لحاظ رکھتے ہوئے نوے نوے منٹ کے چار گھنٹوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ یہ چیز روایتی اسکول کے دن سے جس میں دس یا بیس منٹ کے وقفوں کے بعد مقررہ طور پر کتاب خوانی کرائی جاتی تھی بہت مختلف تھی۔ مریم کی اس جدت نے صرف کتاب خوانی کی پرانی روایت ہی کو نہیں توڑا بلکہ اس نے معلم اور متعلم دونوں کے اندر لچک پیدا کر دی۔ اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس بات کو سمجھنے کے لئے ثابت کر دیا کہ مدرسہ کا دن محض گھڑی کی پابندی کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔

فرانسس ڈبلیو پارکر کا مدرسہ اور پراجکٹ طریقے کی تلاش

کرنل فرانسس ڈبلیو پارکر امریکہ کا اول درجے کا معلم تھا۔ اس نے مضامین کے روایتی نصاب میں تو کوئی ترمیم نہیں کی لیکن وہ اپنی زندگی بھر اس خیال کی تبلیغ کرتا رہا کہ تعلیم نام ہے بچے کی پوری شخصیت کی نشوونما کا۔ معلموں پر جو اس کا زبردست اثر تھا اس کی بناء پر اس کا شمار بھی ڈیوی کے ساتھ اُن لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے امریکہ کی بیسویں صدی کی تعلیم کو نئی شکل دینے میں بہت اہم حصہ لیا۔ پارکر کے انتقال سے ایک سال قبل اس کے نام پر ایک تجربی مدرسہ ۱۹۰۱ء میں شروع کیا گیا۔ اس کی بانی فلورا جے کک تھی۔ اور سولہ معلم اس کے اسٹاف میں شامل تھے جن میں سے اکثر کرنل پارکر کے ساتھ کک کاؤنٹی نارمل اسکول میں کام کرچکے تھے۔ ڈیوی اور مریم کے اسکولوں کی طرح یہ مدرسہ بھی رسمی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتا تھا ان تجربی مدرسوں کی طرح یہ بھی مضامین کی واضح تقسیموں کو ختم کرنا چاہتا تھا یہ بھی پراجکٹ کے طریقے کی جانب اپنا راستہ ٹٹول رہا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس طریقہ کی کوئی متعین شکل ظاہر نہ ہوسکی تھی۔ فرانسس ڈبلیو پارکر کے مدرسہ کی سرپرستی میں ۱۹۱۲ء سے سال ناموں کے شایع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس قسم کے آٹھ سال نامے شایع ہوئے اور ان میں اس مدرسے کے کام اور اس کے فلسفے کے بارے میں نہایت اچھے بیانات موجود ہیں۔ اس کی پہلی جلد میں اس

مدرسے کے معلموں کے مندرجہ ذیل نتائج فکر کو درج کیا گیا تھا۔

جس کام کو طلبہ خود شروع کرتے ہیں اس سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہونچتا ہے

بچے کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان کی قوتِ اقدام کی تربیت کی جائے۔ بچے کو جن

چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے ان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا بہترین موقع نکالا جا سکتا ہے

اخلاقی اور ذہنی ترقی کی بہترین شرط یہ ہے کہ متوازن ذمہ داری کے ساتھ طلبہ کو

آزادی دی جائے۔

اصلی ساز و سامان کے ذریعہ حقیقی تجربہ تعلیم کے لئے لازمی چیز ہے۔

صحیح تعلیم کے لئے اظہار کے مختلف النوع مواقع بہت ضروری ہیں۔

سماجی محرک، کام کا سب سے موثر اور مفید محرک ہے۔

غرض یہ نصب العین تھے جو اس اسکول کے چلانے میں کار فرما تھا۔ ابتدائی جماعتوں

میں بصورت مجموعی بارہ جماعتیں ہوتی تھیں مضمونوں کی شعبہ وار تقسیم ختم کر دی گئی تھی اور

ان کی جگہ مطالعہ کے وسیع واحدے بنا دئے گئے تھے اور جماعتی زندگی، یونانیوں کی

زندگی، نو آبادیوں کی زندگی وغیرہ کو مرکز بنا کر اس کے گرد انہیں اکٹھا کیا جاتا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہائی اسکولوں کے نصاب میں تجربہ کا کوئی موقع نہ تھا، کالج اور

یونیورسٹی کا یہاں اقتدار قائم تھا۔ اور اس کی وجہ سے وہاں تجربے کرنے ممکن نہ تھے

تھے۔ امریکہ کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی یہی صورت تھی اور آج تک ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے

ادارے داخلے کے شرائط کے ذریعے ثانوی مدرسوں پر براہِ راست نگرانی قائم رکھ سکتے تھے

جس کی وجہ سے تعلیمی تجربے خصوصاً نصاب کے معاملے میں بہت مشکل تھے لیکن اب کچھ سالوں سے

خصوصاً امریکہ میں ثانوی مدرسے بھی اپنی کچھ بیڑیوں کے توڑنے میں کامیاب ہو رہے ہیں

متحدہ اقوام کا تعلیمی سائنٹفک اور تہذیبی ادارہ یونیسکو

اس مضمون کا بیشتر حصہ نیشنل ہیرالڈ کے نامہ نگار خصوصی مسٹر کینیڈی کے مضمون "یو، ان، ای، ایس، سی، او کیا ہے؟" سے ماخوذ ہے۔

اس عالمگیر جنگ کے بعد دنیا کی تمام طاقتیں اور بڑے بڑے دماغ اس بات کی انتھک کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا کی تمام قوموں کو ایک ہی ذہنی مرکز پر جمع کیا جائے یہ کوئی بالکل نیا خیال نہیں ہے یہ اس جنگ کے پہلے بھی زندہ قوموں کے ذہن میں تھا لیکن حالات نے اس کو عملی جامہ نہیں پہننے دیا۔ یہ لڑائی صرف سیاسی اور اقتصادی لڑائی نہ تھی بلکہ یہ دو مختلف اصولوں اور زندگی کے دو متضاد فلسفوں کی جنگ تھی، جرمنی اور اٹلی یا نازیت اور فسطائیت دنیا کو اپنے مرکز پر لے جانے کی کوشش میں تھے جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے، اگر نازیت کو فتح ہو جاتی تو کیا ہوتا وہ بھی دنیا میں اپنا نظام قائم کرتے اور دنیا کو ایک ذہنی مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کرتے، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ ہمارے لئے ضرر رساں ہوتا یا فائدہ مند، برطانیہ اور اس کے ساتھی یا دوسرے الفاظ میں ناصرانِ جمہوریت اور آزادی اپنا فلسفۂ زندگی برقرار رکھنے کے لئے جنگ کر رہے تھے اور انہیں کامیابی ہوئی اب وہ ــــ نہیں بلکہ دنیا کی ساری طاقتیں اس فکر میں ہیں کہ تمام قوموں کو اس طرح ملایا جائے بلکہ قوموں کے افراد کو اس طرح ایک واحد ذہنی مرکز پر لایا جائے کہ آئندہ کبھی نفرت کے جذبات اور ذہنی کشمکش بہیمیت اور بربریت کے جامے میں ظاہر ہو کر ایک دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز نہ کر دیں۔

ساری دنیا کے لئے ایک ایسے واحد نظام کی خواہش جو اپنی آغوش میں امن و آشتی لیے ہو، کبھی متحدہ اقوام کے ادارے یو۔ این۔ او اور کبھی متحدہ اقوام کا تعلیمی سائنٹفک اور تہذیبی ادارے کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہے۔ یو، این، او سلطنتوں اور حکومتوں کو اس طرح جکڑ بند کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں نہ ہو سکیں اور طاقتور قومیں ذاتی اغراض کی بنا پر کمزور قوموں کو دبانے کے لئے کشت و خون نہ کر سکیں۔ یو، ان، ای، ایس، سی، او کا مقصد بھی یہی ہے۔ یہ ادارہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ قوموں کے افراد کو ایک ہی ذہنی مرکز پر لایا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور ان میں نفرت کے بجائے موالفت قائم ہو جائے۔ جب تک افراد کے دلوں میں

یہ جذبہ پیدا نہ کیا جائے گا۔ دنیا میں امن نہیں ہوگا۔ اور صرف صلح کے کاغذی معاہدے دنیا کو خونریزی سے نہیں بچا سکتے۔ مختلف قوموں کے افراد کو کس طرح ایک ذہنی مرکز پر لایا جائے یہ اہم کام یو، ان، ای، ایس، سی، او کے پروگرام اور طریقۂ عمل پر ایک نظر کرنے سے معلوم ہوگا یہ ادارہ دنیا کے باشندوں کو اس طرح سے شعبۂ علم کی تعلیم دے گا کہ وہ رواداری اور مساوات کی زندگی بسر کر سکیں اور ایک دوسرے کی زندگی سے بخوبی واقفیت حاصل کر کے ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔

سائنس کی دنیا میں وہ مختلف اقوام کے سائنس دانوں کو آپس میں ربط و ضبط بڑھانے میں مدد دیگا تاکہ اس علم کے بڑھتے ہوئے تجربات میں تبادلۂ خیالات کا موقع مل سکے اور دنیا کے ان حصوں میں جہاں لوگ اس علم میں پیچھے رہ گئے ہیں ایسے ادارے کھولے جائیں گے جو ان کو دنیا کے ساتھ قدم بقدم چلنے میں مدد دے سکیں گے۔ سوشل سائنس اور خصوصیت سے عوام کی تعلیم کے لئے اس ادارے کے سامنے نفسیاتی پہلو ضرور رہیں گے۔ اسی طرح سے فلسفہ و ادب کا دامن صرف مغرب تک محدود نہیں رہے گا بلکہ وہ مشرق اور خصوصیت سے چین، ہندوستان اور ایران سے مصر تک پھیلا ہوا ہوگا۔ کیونکہ یہ ملک کسی طرح ادب اور فنِ عمارات میں قدیم یونان اور روم سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ بہت سے ملکوں کے شعبۂ تعلیم کو بھی سدھارنے کی ضرورت ہے سب سے پہلے تعلیمی اصطلاحات کو ہر مقام کے لحاظ سے ایک اچھے معیار پر لایا جائے شعبۂ تعلیم میں ایک ایسا عملی پہلو بھی نکلتا ہے جو آنے والی نسلوں کو ایک واحد ذہنی مرکز پر لانے میں بہت مدد دے گا وہ یہ ہے کہ درسی کتابوں کو اور ان میں بھی خاص طور سے جغرافیہ تاریخ اور علم تمدن کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ ان میں سے وہ تمام واقعات اور خیالات جو قوموں میں کشیدگی غلط فہمی پیدا کر سکتے ہوں نکال دیئے جائیں۔ اس طرح خود بخود ایسی درسی کتابیں نکل آئیں گی جو بین الاقوامی ایکے کی ذہنیت پیدا کر سکیں گی۔

فنونِ لطیفہ البتہ ہر ملک و قوم کے علیحدہ علیحدہ رہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ صدیوں کی تہذیب تمدن اور جغرافیائی حالات کی آغوش میں پلے ہیں اور ان کو ان اثرات سے جدا کرنے میں نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے یو ان ای ایس سی او کا یہ فرض ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ کی دلچسپی کو عوام میں اور خاص کر دنیا کے صنعتی حصوں میں از سرِ نو پیدا کرنے کی کوشش کرے اس کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ فنونِ لطیفہ کے پرانے مرکز صنعتی دنیا کے زیر اثر آکر اپنی اس آخری لیکن قابل قدر قومیت اور تہذیب کے نشان کو کھو نہ بیٹھیں وہ نقصان جو اس جنگ کی وجہ سے فنونِ لطیفہ کو

کتب خانے اور عجائب خانے تباہ ہو جانے سے پہونچا ہے اس کی فوراً تلافی کی جائے اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ ان ذرائع سے فنون لطیفہ کو عوام کے قریب تر لایا جائے۔ موجودہ زمانے میں پریس ریڈیو اور فلم وغیرہ ایسے ذرائع ہیں جن سے قومیں بغیر کسی دقت کے ایک دوسرے سے مل سکتی ہیں اور انھیں ذرائع سے تعلیم و تہذیب و سائنس دنیا کے عوام تک بآسانی پہونچائے جا سکتے ہیں موجودہ سائنس کی ترقی نے اس بین الاقوامی ادارے کو وہ نعمت دی ہے جس کے بغیر اس کی آواز دنیا تک پہونچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو جو تفریق مذہب ملت فائدہ پہونچا سکے اس کو اپنے پروگرام میں ہر شعبۂ علم کو مناسب جگہ دیجائے اور ان کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کیجائے تاکہ لوگ ان سے صحیح دلچسپی لے سکیں۔

سب سے زیادہ جسکی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان ذرائع کو غیر جانبداری سے استعمال کیا جائے اور سچ پر پردہ نہ ڈالا جائے کیونکہ اسوقت بھی دنیا میں مختلف زندگی کے فلسفے موجود ہیں اگر ان کی درمیانی خلیج بڑھ گئی اور غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں تو ان کا ٹکرانا ایک یقینی امر ہو جائے گا۔ نتیجہ میں ہم کو ایک ایسی خطرناک عالمگیر جنگ سے سابقہ پڑیگا جو تہذیب و تمدن کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا مشرقی و مغربی ممالک کے فلسفۂ زندگی کا فرق آج کا فرق نہیں ہے، ان دونوں فلسفوں کا اختلاف خاص طور پر اس بات میں ہے کہ فرد کا سماج سے کیا تعلق ہونا چاہیئے۔ دوسرے اختلاف بھی اسی سے پیدا ہو گئے ہیں اسی وجہ سے ان کے اخلاق اور عادات انکی تعلیم و تربیت کے طریقے ان کے سیاسی اقتصادی اور تمدنی نظریے بالکل مختلف ہیں اہل مشرق و اہل مغرب میں رواداری میل اور محبت قائم کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اہل مغرب اپنے رویے کو بدل لیں اور مشرق کی تہذیب کو مضحکہ خیز انداز میں پیش کرکے نفرت کے جذبات نہ ابھاریں۔ اخبار نیشنل ہیرالڈ مورخہ ۴ر دسمبر ۱۹۴۶ء اپنے سب ایڈیٹوریل میں اہل مغرب کے اس رویے کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ "دنیا میں مختلف ملکوں کے عام لوگوں کو آپس میں ملانے کی کبھی کوشش نہیں ہوئی اور یہ لوگ ایک دوسرے کو صرف سینما کے پردے ہی پر دیکھ سکتے ہیں۔ ہالی وڈ فلموں نے مشرق کو دنیا کے سامنے کچھ اسطرح پیش کیا ہے کہ وہ ظلم و تشدد، مہاراجاؤں، فقیروں، سپیروں اور نٹوں کا مسکن بن کے رہ گیا ہے۔ اہل مشرق اپنے کوائف لیلے ایسی فلموں میں دیکھتے ہیں جس میں لڑکیاں ساری کی طرح کا لباس پہن کر ناچتی یا گردن مٹکاتی نظر آتی ہیں (یا وہ اپنے کو ڈی رمنس کیم" اور "گنگا دین" ایسے فلموں میں پاتے ہیں)

جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے جو یو، ان، ای، ایس، سی، او میں بحیثیت ہندوستان کے نمائندے

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

عوام کا کالج

رام پور بہت عرصہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور اپنی علمی سرگرمی کے باعث "بخارائے ہند" کے برگزیدہ لقب سے یاد کیا جاتا رہا ہے لیکن جس طرح ساری دنیا میں علم بعض مخصوص شخصیتوں کی ملکیت رہا ہے۔ اور عوام اس دولت سے محروم رہے ہیں اسی طرح رام پور کے عوام بھی بحیثیت مجموعی اس گنج گرانمایہ سے مستفید نہ ہو سکے۔ رام پور کی شمع علم ہندوستان کے دور و دراز گوشوں کو روشن کرتی رہی اور رامپور کے عوام چراغ تلے اندھیرے کے مصداق اس کی ضیا پاشیوں سے اپنی آنکھوں کو منور نہ کر سکے اور امرا کی اس صریحی سماجی اور تمدنی ناانصافی کا شکار رہے کہ انہوں نے علم کی دولت کو بھی اپنے لئے مختص کر رکھا تھا۔

یہ "افسانۂ عہد کہن" کچھ ایسا خوشگوار نہ تھا کہ حساس لوگ اسے سنتے اور سر ہلاتے رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلی ہوئی اور علمی اجارہ داری" کی تباہ کن روایات کی بیخ کنی کی جانے لگی زمانے کے اطوار بدلے اور علم کی دولت عام کئے جانے کی مہم شروع ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس گیارہ سال کی قلیل مدت میں خواندگی میں معتدبہ اضافہ ہوا لیکن یہاں کی عام بے علمی کے پیش نظر اس درجہ اضافہ بھی کسی طرح اطمینان بخش نہ تھا۔ بہت کچھ کام کیا گیا تھا لیکن ابھی اس سے کہیں زیادہ کام باقی تھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں خواندگی کی شرح فیصدی ۵ رہی تھی اور جب اس کا موازنہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے کیا گیا تو انتہائی تکلیف دہ تفاوت نظر آیا۔ حکومت کے ارباب حل و عقد کو فطری طور پر زیادہ انہماک کے ساتھ جہالت کے خلاف نبرد آزما ہونا پڑا اور اس مرتبہ اس مہم کے سر کرنے کے لئے باضابطہ شدید اور فیصلہ کن حملہ شروع کیا گیا۔ عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر نے ایک جگہ اپنے سفر انگلستان کے تاثرات کے

ذیل میں فرمایا" اب حکومت اور پبلک اس بات پر قانع نہ ہو گی کہ عوام کو بہلانے کے لئے چند گھٹیا قسم کے ادارے قائم کر دئے جائیں جو مختصر اور مستعار عمارتوں میں قائم ہوں جہاں معمولی قابلیت اور شخصیت کے تھکے ہوئے استاد تعلیم دیں اور جہاں بالغوں کے لئے محض چند رسمی مضامین یا مفید ہنر سکھانے کا انتظام ہو اور ادب، آرٹ، شاعری، سیاسی، اور معاشی مضامین اور سائنس کی انقلاب آفریں تعلیم سے انہیں محروم رکھا جائے" چنانچہ اس مرتبہ حملہ کی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔ بجائے ایک کے دو محاذوں پر جنگ شروع کی گئی یعنی ایک طرف تو بچوں کیلئے تعلیم لازمی قرار دیگئی اور دوسری طرف بالغوں کی تعلیم کے لئے انتظامات کئے گئے۔ تعلیم کی اشاعت کے لئے محض بچوں کی تعلیم پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا ورنہ خاطر خواہ نتائج دیکھنے کیلئے عمر نوح اور صبر ایوب کی ضرورت پیش آئے۔ بالغوں کی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حکومت ہند کی بعد جنگ کی تعلیمی اسکیم میں ساٹھ کروڑ روپیہ صرف کر کے بیس سال کی مدت میں نو کروڑ بالغوں کو تعلیم دلانے کی تجویز کی گئی ہے۔ ریاست میں تعلیم بالغان کے مراکز اور عوام کے کالج کا قیام اسی دوسرے محاذ سے متعلق ہیں۔

عوام کے کالج کی ضرورت

دنیا کے بعض ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں بیشمار علمی اور ادبی انجمنیں ادارے اور کتب خانے قائم ہیں وہاں بھی اسی قسم کے اداروں کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے جو نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی پذیرائی کر سکیں بلکہ بالغ عوام کی علمی اور تہذیبی سطح کو بلند سے بلند تر کرنے میں مد ہوں چنانچہ امریکہ میں اسی ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وسیع پیمانے پر معقول انتظامات کئے گئے ہیں۔ انگلستان میں کاؤنٹی کالجوں کے قیام کی تجویز طے ہو چکی ہے۔ ڈنمارک میں عوام کے مدرسوں کی بنا ڈالی جا چکی ہے اسی طرح روس بھی اس کوشش میں کسی سے پیچھے نہیں جب ان متمدن اور تعلیمی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں اس قسم کے اداروں کی ضرورت کو عملاً تسلیم کیا جا چکا ہے تو ہندوستان جیسے پسماندہ ملک میں اور خصوصاً رامپور میں "عوام کے کالج" کی اہمیت ظاہر ہے اس کے باوجود بڑی عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں یہ کالج اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے اور اگر یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا تو ممکن ہے کہ ملک میں بالغوں کی تعلیم کے اس طریقہ کو وسیع پیمانے پر اختیار کیا جائے۔

اغراض و مقاصد

کالج کے پیش نظر حسب ذیل مقاصد ہیں۔ جو باشندگان رامپور کی انفرادی اور جماعتی ترقی کے لئے یقیناً مفید ہیں۔ (۱) لوگوں کی معلومات عامہ میں اضافہ کرنا اور ہندوستان اور دنیا کی مختلف تحریکات سے باخبر کرنا (۲) زبان کا صحیح استعمال سکھانا اور

اظہار خیالات پر قادر کرنا (۳) "شہریت" کے اصولوں سماجی ذمہ داریوں کے احساس اور حقوق و فرائض کے صحیح تصورات سے آشنا کرنا (۴) لوگوں کو ہندوستان کی بڑی بڑی شخصیتوں سے روشناس کرانا (۵) فنونِ لطیفہ کے ذریعے تخیل کو بیدار کرنا (۶) جسمانی ورزش اور تربیت کے لئے سہولتیں فراہم کرنا (۷) مذہب کے پاک اصولوں کی ترویج کرنا (۸) عزت نفس، رواداری اور خدمتِ خلق کے جذبات کی تربیت کرنا۔ زندگی کے متعلق ایک آزاد اور متوازن نقطۂ نظر پیدا کرنا (۹) رامپور کی تہذیبی خصوصیات کی حفاظت کرنا۔ کالج کا نظریۂ حیات جس کو طلبا کے ذہن و دماغ میں بالواسطہ طور پر راسخ کرنے کی کوشش کیجاتی ہے یہ ہے "ضمیر پاک، خیال بلند، ذوق لطیف۔"

طریقۂ کار

بالغوں کی تعلیم کا کام جتنا ضروری مفید اور نیک ہے اتنا ہی کٹھن ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ بوڑھے طوطوں کو پڑھانا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو فطری طور پر ہر شخص اپنی معلومات میں اضافہ کرنا اور اپنے شعور کی تربیت کرکے ترقی کے مراحل طے کرنا چاہتا ہے لیکن معاملاتِ دنیا اور کشمکش حیات میں پھنسنے کے بعد اس کی فطری صلاحیتیں کچھ اس طرح زنگ آلود ہو جاتی ہیں کہ ان پر جلا کرنے کی امنگ بھی دبیں باقی نہیں رہتی ان حالات میں درسی تعلیم کے مروجہ رسمی طریقے ضرورت سے زیادہ خشک غیر دلچسپ اور ناقابل عمل ہو جاتے ہیں اس خیال کے پیش نظر عوام کے کالج میں تعلیم کے بالواسطہ طریقے پر عمل کیا جارہا ہے بجائے حروف تہجی حفظ کرانے اور تختیاں سیاہ کرانے کے عوام کی نظر میں وسعت پیدا کرنے اور ان کے عام شعور کو بلند کرنے کے لئے روزانہ تقاریر کا ایک سلسلہ جاری کیا گیا ہے جس میں معاشی معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، سائنسی، وغیرہ مختلف النوع مباحث پر روشنی ڈالی جاتی ہے اس طرح نئی نئی معلومات لوگوں کے حافظہ پر بے مصرف بوجھ نہیں بنتیں بلکہ ان کی عام فراست کا ایک جزو بن جاتی ہیں۔ مضامین کے انتخاب یا بالفاظ دیگر نصاب کی تدوین کا حق زیادہ تر عوام ہی کو دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اپنی ضروریات اور ذہنی میلانات کے اعتبار سے خود اپنے لئے ایک راستہ تلاش کرلیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ لوگوں سے مشورے طلب کئے جائیں اور حتی الوسع ان پر عمل کیا جائے۔ یہ مشورے تبادلہ خیالات کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں نیز اس کے لئے ایک کتاب المشورہ کالج میں رکھی گئی ہے کالج کے اساتذہ حق استادی کو کم سے کم کام میں لاتے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کے ذریعے لوگوں میں غیر محسوس طریقے پر طلب علم کا "احساس" پیدا کرنے اور نئی نئی معلومات میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

سماج کے قیام کے بعد سے اب تک متعدد تقاریر کرائی جا چکی ہیں جن میں سے بعض کے مضامین مشتے نمونہ از خروارے کے بطور درج ذیل کیے جاتے ہیں (۱) رامپور کی قدیم تہذیب (۲) رامپور کی ادبی تاریخ (۳) رامپور کو ایک صنعتی مرکز کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ (۴) بات چیت (۵) اپٹن سنکلیر کی تصانیف۔ آسٹریلیا کی زندگی (۶) آسمان کی سیر (۷) دنیا کی سیر (۸) موجودہ زمانے کے معاشی مسائل (۹) رفتار زمانہ (۱۰) مجوزہ آئین کی روشنی میں ریاستوں کا مستقبل (۱۱) صحت انسانی (۱۲) تربیت جسمانی (۱۳) وجود باری تعالےٰ (۱۴) اسلامی رواداری (۱۵) ذمہ داراتہ شہریت (۱۶) جنگ کے بعد کی اقتصادی تجاویز (۱۷) روس کے باشندوں کا طرز زندگی (۱۸) پروپیگنڈا (۱۹) ریڈیو کی ایجاد (۲۰) تعلیم جدید وغیرہ وغیرہ۔

تقاریر کے علاوہ وقتاً فوقتاً ادبی محفلیں، مشاعرے، مباحثے، چہار بیت، بیت بازی کے مقابلے وغیرہ کرائے جاتے ہیں جو اپنے طور پر مفید ہونے کے علاوہ تبدیلی ذائقہ کا کام دیتے ہیں بعض بعض مباحثے مثلاً "رامپور کے شہر کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے" نہایت خیال انگیز اور دلچسپ ثابت ہوئے۔ آرٹ کلاس بھی قائم کی گئی لیکن اس میں بہت کم لوگوں نے دلچسپی لی جس کی وجہ سے سردست اسے ملتوی کر دیا گیا ہے لیکن یہ احساس اشک شوئی کے لئے کافی ہے کہ کم از کم ایک طالب علم مسمی سید عظمت میاں صاحب رامپور کے اہل ذوق حضرات سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ذہنی مرکز کی نشستیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے کافی مفید اور عام دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ تقریباً تمام ادبی تقاریر میں سامعین کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سوالات کر کے اپنی تسکین کر سکیں اور تقریر کے بعض اچھوتے پہلوؤں کو بے نقاب کرا سکیں اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ سامعین کو بھی سوالات کی شکل میں اظہار خیالات کا موقع ملتا ہے اور اس طرح انکی جھجک رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔

اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے کہ جو لوگ بعض مجبوریوں کی بنا پر اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر کھانے کمانے کے بکھیڑوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اپنی علمی تشنگی کو پورے طور پر نہیں بجھا سکے ہیں ان کیلئے مناسب ذہنی غذا فراہم کی جائے۔ چنانچہ دارالمطالعہ میں ہندی اردو اور انگریزی رسالوں اور اخبارات کا انتظام کیا گیا ہے کتابوں کی تعداد تقریباً نوسو ابھی کم ہے لیکن جتنی کتابیں بھی موجود ہیں منتخب اور مختلف مذاقوں کے اعتبار سے معیاری رکھی جا سکتی ہیں زیادہ پڑھے لکھے حضرات کی دلچسپی کے لئے ادبی مرکز قائم کیا گیا تھا جس میں مہینے میں دو مرتبہ علمی و ادبی مقالے پڑھے جاتے تھے خیال تھا کہ ان متنوع

مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا لیکن افسوس کہ یہ مرکز ادبا کی بے توجہی کا شکار ہو گیا اور فی الحال اس کی نشستیں نہیں ہو رہی ہیں۔

تربیت جسمانی اور صحت عامہ کا تعلق چونکہ نظریات سے زیادہ عمل سے ہے اس لئے صحت کے عام اصولوں پر تقاریر کرانے کے علاوہ بیرونی کھیلوں مثلاً والی بال بیڈمنٹن اور فٹ بال کا انتظام کیا گیا ہے۔ حال ہی میں ہوٹ کی باقاعدہ تعلیم بھی شروع کرا دی گئی ہے۔ اندرونی کھیلوں میں کیرم بورڈ فٹ تعلیمی تاش شطرنج اور پنگ پانگ وغیرہ کا بھی انتظام ہے۔ آئے دن ان کھیلوں کے ٹورنامنٹ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ریڈیو پر اچھا خاصا جمگھٹ رہتا ہے اور خبروں کے سننے میں لوگ خصوصی دلچسپی لیتے ہیں

کالج کی افادیت اس ادارہ کی رکنیت عوام کے لئے عام ہے اور کسی قسم کی فیس بھی نہیں لی جاتی ہے۔ آجکل کالج ۵ بجے شام سے آٹھ بجے رات تک کھلتا ہے اور یہ وقت اس خیال سے رکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے روزانہ کے مشاغل سے فرصت پا کر اسمیں دلچسپی لے سکیں لیکن مجھے اس موقع پر نہایت صفائی کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس ادارے سے عوام کو جتنا فائدہ پہونچنا چاہیئے نہیں پہونچ رہا ہے۔ اور یہ بھی تک رامپور کے عوام کی سماجی اور ادبی دلچسپیوں کا مرکز کہلانے کا مستحق نہیں ہے یہ ادارے کی ناکامی ہے۔ یوں تو روزانہ حاضری اوسطاً ۵۰ اور ۶۰ کے درمیان ہوتی ہے اور بعض اوقات عمارت کی تنگی کا بھی احساس ہونے لگتا ہے لیکن ان میں سے زیادہ تعداد اسکولوں اور کالج کے طلبا کی ہوتی ہے اور سول ملازمین جو اس ادارے سے مستفید ہونے کے سبب سے زیادہ مستحق ہیں بڑی حد تک محروم ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ دفتری ذمہ داریوں کے بوجھ اور انہماک سے ان کی تحصیل علم کی خواہش افسردہ ہو گئی ہو۔ غالباً اسی خیال کے پیش نظر انگلستان کے تعلیمی ایکٹ ۴۴ء میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ کاونٹی کالجوں میں حاضری کے لئے کانوں اور کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے والے مزدوروں کو چھٹی مع تنخواہ دی جاتی ہے یہاں تک کہ زراعت پیشہ لوگوں کو بھی سال میں آٹھ ہفتے ان کالجوں سے مستفید ہونے کی پابندی کی گئی ہے۔ اس غیر دلچسپی کو دور کرنے کا ہمارے پاس سردست ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر میخوان چو محمل را گراں بینی



تعلیم جدید

مدیر
مرزا اسجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی (علیگ)

چندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

جلد ۲ رامپور - مارچ ۱۹۴۷ء نمبر ۳

فہرست مضامین

مرزا اسجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی علیگ نے مرتضی پرنٹنگ پریس میں طبع کرا کے دفتر تعلیم جدید سے شائع کیا

تبحرِ علمی کا اعتراف

نقل مراسلہ مورخہ ۱۲ / دسمبر ۱۹۴۶ء منجانب جناب ریو برٹ جے بسٹ صاحب آنریری نیڈرل سکریٹری دی نیو ایجوکیشن فیلوشپ فیڈرل کونسل (آسٹریلیا) کلیمنٹ لیوس ایسٹ انسٹی ٹیوٹ پرائیوٹ بیگ اڈیلیڈ ساؤتھ آسٹریلیا۔

بنام

عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر بہادر ریاست رام پور۔

آسٹریلیا کی نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی مجلسِ عمل آپ کی (ریاست رام پور کی) گورنمنٹ کی انتہائی ممنون ہے کہ اس نے پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب کو بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کی اجازت دی۔ جو حال ہی میں آسٹریلیا میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ "تعلیم بین الاقوامی سمجھوتے کی بنا پر ہونا چاہئے"

کانفرنس مذکور میں پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب کی ہر پیش کش نہایت اونچی اور ہر مقالہ معیاری سمجھا گیا۔ نہ صرف موصوف کے مقالہ جات کی گوشہ گوشہ میں قدر افزائی کی گئی بلکہ موصوف آسٹریلیا میں جہاں بھی تشریف لے گئے لوگ ان کے غیر معمولی نصب العین علمی، اعتقادات ان کی خوش اخلاقی اور شخصیت کے گرویدہ ہو کر ان کے گہرے دوست بنتے گئے۔

گرم جوش انسانیت سے منضرف موصوف کی اور اکی تحریکات نے جو اُن کے گہرے مطالعہ اور علمی بلندی کا نتیجہ تھیں لوگوں کے حافظے پر غیر فانی نقوش قائم کر دئے۔

اس امرِ واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کانفرنس مذکور کے مقاصد کے تحت موصوف نے جو کچھ پیش کیا وہ بلند پایہ اور معیاری تسلیم کیا گیا۔

میرا پُر خلوص شکریہ قبول فرمائیے۔

خواجہ غلام السیدین صاحب کا بارن کمیشن پر انتخاب

ذیل میں اس اہم تجویز کی نقل درج کی جاتی ہے جس کی رُو سے انٹر پراونشل بورڈ فار اینگلو انڈین اینڈ یورپین ایجوکیشن منعقدہ ۷ ۔ ۸ جنوری ۴۷ء نے عالی مرتبت جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات ریاست رامپور کے جواہر علمی کو پرکھتے ہوئے موصوف کو بارن کمیشن پر منتخب کیا ۔

تجویز

کانفرنس ہذا بارن کمیشن کی قیمتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے مفید عملیات کو اپنی کارگذاریوں میں بصد افتخار شامل کر لی ہے ۔ اور خواجہ غلام السیدین صاحب کا بہ اتفاق آرا کمیشن مذکور پر منتخب کیا جانا کمیشن کی عین خوش قسمتی تصور کرتی ہے ۔ موصوف کا نوٹ مشمولہ رپورٹ نہایت دلچسپی سے پڑھا گیا ۔

کانفرنس نے خواجہ صاحب کی ان ہمدردانہ توجہات کا شکریہ ادا کیا جو انھوں نے اینگلو انڈین تعلیم کے سلسلہ میں ظاہر فرمائیں ۔ ناظم کانفرنس ہذا کو ہدایت کی گئی کہ وہ انجمن کے اس اظہار امتنان و تشکر کو جو خواجہ صاحب سے متعلق ہے بذریعہ انٹر پراونشل بورڈ کمیشن کے دوسرے ممبران کو روانہ کر دیں ۔

اپنوں سے شکوہ

میں اساتذۂ رام پور سے شکوہ کر رہا ہوں اور ذیل کی سطور میں اُن ہی سے خطاب ہے۔ "تعلیم جدید" کو آپ کی خدمت کرتے ہوئے پورا ایک سال ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس ماہنامہ کا مقصد حقیقی یہ رہا کہ وہ مختلف ذرائع سے آپ سب میں تعلیمی کیفیات پیدا کرتا رہے۔ شرقی و مغربی ماہرین تعلیم کے اعتقادات ان کے پیغامات ان کے نئے نئے تجربات آپ تک پہونچاتا رہے اور ان ترقی پذیر ممالک کے طریقہائے تعلیم کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا رہے جو آنے والی نسلوں میں بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کو مقدر جانتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ "تعلیم جدید" کے چند صفحات "دنیا میں رفتار تعلیم" کے زیر عنوان مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ اور اُن صفحات پر اکثر و بیشتر روس۔ جرمنی۔ جاپان امریکہ اور انگلستان کی تعلیمی ترقیوں کے ذکر و اذکار کا چرچا رہا۔ چند صفحات "سنگ و خشت" کے عنوان سے محض اس لئے نامزد کئے گئے تھے کہ آپ اپنے اس جریدۂ تعلیم کے ذریعہ اپنے تعلیمی خیالات۔ اپنے تجربات اور اپنی مشکلات پر نہ صرف اپنے مقامی ہم پیشہ بھائیوں سے بلکہ بیرون رامپور کے استادوں سے بھی تبادلۂ خیال کرتے رہیں گے اور اس طرح تعلیم جدید آپ کے اور دوسرے مقامات کے اساتذہ کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کر سکے گا جو نہ صرف آپ کے تعلیمی تجربات کی رفتار کو تیز کرنے میں ممد ہو۔ بلکہ آپ کے حقوق کے تحفظ میں بھی بڑی حد تک معین ہو سکے۔ مگر مجھے اس امر کا شکوہ ہے کہ ایسے مفید اور کارآمد صفحات قریب قریب اب تک آپ کی توجہ کے محتاج اور آپکے افکار سے محروم رہے

میں نے بحیثیت مدیر رسالہ نہیں بلکہ برادری کے ایک ادنےٰ فرد ہونے کی حیثیت سے بہت سے دروازے کھٹکھٹائے لیکن واللہ اعلم کیوں ہر دروازہ سے ناکام ہی واپس ہوا۔ اپنوں سے غیر اچھے جنہوں نے ایک رسمی سی التجا پر "سنگ و خشت" کے صفحات میں اپنی باہا مونی برسائے۔ آپنے لاہور، لکھنؤ، پٹنہ، دہلی اور نیز امریکہ کے استادوں کے مراسلات ملاحظہ فرمائیں گے لیکن رام پور کے استادوں کی جانب سے نہ ایک شکایت سنی ہوگی نہ

کسی ایک نئے تجربہ کا مشاہدہ کیا ہوگا۔

آپ کی گھریلو مصروفیات معلوم۔ آپ کے پیشہ کی دقیقت تسلیم۔ آپ کے ذاتی افکار و حوادث مسلم۔ لیکن فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ قومی و ملکی خدمت کی اہمیت بھی ایسی ہے جو فروگذاشت نہیں کی جا سکتی یہ کام بغیر کسی عملی تحریک کے انجام نہیں پا سکتا۔ اس سلسلہ میں آپ کی بیداری لازمی اور آپکی ذہنی فعالی ضروری ہے۔

"ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں" "اکثر و بیشتر ناظم" "عوام کا کالج" "ناظم بچوں کا کتاب خانہ" "ناظم" "استادوں کا کتاب خانہ" ہیڈ ماسٹر صاحبان۔ ٹریننگ اسکول۔ ذوالفقار اسکول و باقر اسکول کے تاثرات سے سرگرم عمل رہے۔ میں ان حضرات کا ممنون ہوں کہ موصوفین نے میری التجا پر مجھسے پُرخلوص تعاون فرما کر ریاست کی تعلیمی کاوشوں کو ابھارنے اور نمایاں ہونے میں میری امداد فرمائی۔

اب بھی وقت بہت کچھ باقی ہے۔ کیا آپ ازراہِ فرض شناسی آج سے اپنی تعلیمی جد و جہد کو سلسلہ جنباں فرما کر اوراق ہذا ہی کو نہیں بلکہ اپنی برادری والوں کو ممنون ہونے کا موقع دیں گے۔

حقیر مدیر

اُستادوں سے خطاب

نئی شاہراہوں کیلئے سیاسی اور انسانی مقتضیات

(قسط اول)

عالی جناب خواجہ غلام السیدین صاحب کے اس خطبہ کے چند اقتباسات ترجمہ کرکے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں جو موصوف نے ٹری وینڈرم میں منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس کے لئے تیار کیا تھا۔

میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں، کہ آپ حضرات اس امر کو تسلیم کر چکے ہیں کہ دُنیا موجودہ حالات کے ماتحت نئی شاہراہوں کی ضرورت کا کس قدر شدت سے پرچار کر رہی ہے۔ سیاست داں منتظمین، سماجی کارکن اور ماہرین تعلیم اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ کوئی تبدیلی اور سماجی تنظیم بارآور نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ تعلیم بالغاں کی اشاعت نہ صرف وسیع پیمانے پر بلکہ نہایت تیز رفتاری اور فراخ دلی سے نہ کی جائے۔ عہد ماضی میں بھی اکثر شخصیتوں اور جماعتوں کی دور رس نگاہوں نے اس کارِ خاص کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیری کا اندازہ کرلیا تھا۔ انہیں اس امر کا احساس تھا کہ ۲۵ کروڑ انسانوں کو تعلیم دینا کوئی آسان کام نہیں، آج بھی ہم اس نوعیت کے مصلحت آمیز الفاظ اپنے تنگیٔ خیال کو پوشیدہ کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں لیکن دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے گذشتہ بیس تیس برس کے عرصہ میں زندگی کی نبض اور خیالات کی تحریک نے کافی سرعت حاصل کرلی ہے۔ دوسرے ملکوں کی پنج سالہ تجاویز ہماری نظروں کے سامنے ہیں موجودہ جنگ نے ہمیں اس بات کو یاد کرا دیا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے لئے انسان کی کاوشیں کیسے کیسے معجزات پیش کر سکتی ہیں۔ جدید ذرائع پیغام رسانی مثلاً پریس۔ ریڈیو۔ سینما نوجوانوں کی تعلیم میں کتنا حصہ لے سکتے ہیں۔ اس تبدیل شدہ صورتِ حال کے ماتحت

یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ہم تعلیم کے منقح طلب مسئلہ سے دست بردار ہو جائیں یا اس کی طرف سے بالکل خاموش ہو جائیں۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم تعلیم کی اشاعت کے لئے مردانہ وار پیش قدمیاں کرتے رہیں۔ واضح ہو کہ ہماری فن کارانہ ذکاوت ہی سماجی، اقتصادی یا تعلیمی تنظیم کی مہم کو ذی اثر پیمانوں پر سر کر سکتی ہے۔ ....

ہم سیاسی حیثیت سے ایک انقلابی دور سے گذر رہے ہیں۔ یہ انقلاب ہمارے ملک کے مستقبل کی تشکیل کرکے رہے گا۔ تلخ سے تلخ مخالفتیں ہلاکت آمیز شورشیں اور خونریزیاں جو ہماری تہذیب و روایات کے نقطۂ نظر سے قومی زندگی کے لئے سم قاتل ہیں جلد یا بدیر فرو ہو کر رہیں گی۔ جب افقِ حیات پر گرجنے والے ادبار کے بادل چھٹ جائیں گے۔ ہمارے خرمنِ ہستی پر بار بار گرنے والی بجلیاں ماند پڑ جائیں گی اور ہماری ملکی فضا پاک و صاف ہو جائے گی تو ہم ایسی دنیا میں سانس لیں گے جہاں خیال اور روح کی آزادی اور ذہنی بیداری کا دور دورہ ہوگا لیکن حقیقت بینوں پر یہ امر واضح ہے کہ صرف سیاسی آزادی ہی لوگوں یا فرقوں میں امن عامّہ کا باعث نہیں ہو سکتی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ قومیں جو محض سیاسی حیثیت سے آزاد ہیں دوسری ایسی رسموں کی قید و بند میں پھنسی ہوئی ہیں جو انہیں آزاد زندگی گذارنے کا موقع نہیں دیتیں کیونکہ ان کے اندر اس شریف جذبے اور بے غرضانہ کوششوں کا فقدان ہے جو انجام بخیر ہونے میں معین ہو سکیں۔ درحقیقت لوگ اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہیں رکھ سکتے جب تک ان میں وہ بیدار مغزی نہ ہو جس کے بنیاد سیاسی تعلیم اور اصول جمہوریت پر ہے اگر ہمارے اندر بلند نظری ہے اور ہم سیاسی آزادی کو سماجی آزادی اور اقتصادی جمہوریت کا سنگ بنیاد سمجھتے ہیں تو ہم کو یقیناً تعلیم عامّہ کا معیار بلند کرنا پڑے گا۔ ورنہ بصورت دیگر خطرہ یہ ہے کہ آزادی گو اہلِ دماغ لیکن خود غرض افراد اپنے مفاد ذاتی کے لئے استعمال کریں گے تعلیم بالغاں کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان خطرات کو دور کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہونگے۔

دورِ حاضر میں شعور کی نبضیں بہت حساس واقع ہوتی ہیں۔ میں زمانہ کے عام رجحانات سے بحث کر رہا ہوں۔ میرا روئے سخن ان گراں قدر ہستیوں کی طرف نہیں ہے جن کے دل

انسانی عظمتوں کی ہمسازی کا دم بھر رہے ہیں۔ کتنی تلخ اور غم انگیز یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہم وطنوں کی اکثریت مادّی ہو یا روحانی، تہذیبی ہو یا تمدنی ہر حیثیت سے خالی ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ موجودہ دور کے انسان کو کافی سے زائد ایسے تہذیبی اور مادّی ذرائع حاصل ہیں جن کی قوت امکان عملی طور پر غیر محدود ہے، لیکن ہم غریبوں کی بے کیف اور غیر مطمئن زندگیاں جو دل و دماغ کی فطری اور گراں قدر فعالی کی دولت اور اقتصادی تحفظ سے محروم ہیں۔ ابھی تک جاہل طبقہ کی رہنمائی میں صرف ہو رہی ہیں۔

میرے خیال میں بیسویں صدی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ عوام کی ناقابل حل مشکلوں کو آسان کیا جائے اور انہیں پستی سے ابھار کر بلندی پر لایا جائے۔

لوگوں کا موجودہ مذاق صرف اس بات سے مطمئن نہیں ہوتا کہ وہ کسان یا مزدور جو ہر روز بامشقت کرتے رہتے ہیں ان کے لئے صرف یہ خیال کافی ہے کہ وہ فاقہ کشی کے مصائب سے بچے رہیں یا یہ کہ ان کو تھوڑی سی ابتدائی تعلیم دے دی جائے۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں ان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ان میں بھی اتنی استعداد ہونی چاہیئے کہ وہ دماغی اور روحانی مسرتوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ان کی بھی آنکھیں حسین منظر کا مشاہدہ کرنے اور کان موسیقیت کی ہم آہنگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ بھی ادب، آرٹ، ڈراما اور اسی قسم کے دوسرے زندگی کے خوش نما پہلوؤں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا یہ حق بجانب ہوگا کہ ان کو قدرت کے ان گراں بہا خزانوں سے محروم کر دیا جائے۔ جو اب تک سرمایہ دار طبقہ نے اپنے لئے مخصوص کر رکھے ہیں۔ موجودہ رسم و رواج کی پابندیاں اس نظریہ کے منافی ہیں۔ اسی لئے تعلیم کی نشر و اشاعت میں تعلیم بالغاں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن بھلا نری کھری کتابی تعلیم ہمارے لئے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس قسم کی تعلیم جس قدر جلد حاصل کی جاتی ہے اسی قدر سرعت سے نقش بر آب بھی ہو جاتی ہے اور یہ اکثر نوجوانوں کو متاثر نہیں کر سکتی جو اپنے فرصت کے وقت میں تھکے ماندے ہونے کی وجہ سے حروف تہجی کے معموں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور تعلیم سے اکتا جاتے ہیں

تجربہ نے ہم پر یہ واضح کر دیا ہے کہ جب تک ہم غیر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دائرۂ نظر کو وسیع نہ کر دیں اور تعلیم بالغاں کے ذریعہ ان کے دامن کو علم و ہنر سے نہ بھر دیں۔ ہم اپنی اشاعتِ تعلیم کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

صرف یہی ذریعہ ہے جس سے ہم اپنی کوششوں میں ان سے اشتراکِ عمل کر سکیں۔ اگر مجموعی طور پر موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم بالغاں کے میدان میں ہماری سرگرمیوں کا مرکز تبدیل ہو گیا ہے۔ ہم نمایاں طور پر دوسری جانب رُخ کر رہے ہیں یعنی پہلے ہماری تنظیم چھوٹے پیمانے پر تھی اور اب ہم وسیع پیمانے پر بنیادیں کر رہے ہیں۔ پہلے تعلیم ایک تنگ دائرۂ عمل میں محدود تھی اور لوگوں کی صرف یہی خواہش تھی کہ بجائے نشانِ انگشت کے وہ اپنے دستخط کرنا سیکھ جائیں لیکن اب تعلیم کے نظریے فراخ ہونے کی وجہ سے ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم لوگوں کو شہریت کے اصول سکھائیں تاکہ ان میں تمدنی اور سماجی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

تعلیمی مضامین

جامعۂ اسلامیہ کی پچیس سالہ روئداد

(قسط دوم)

میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابلِ توجہ واقعہ ہے، اس نے اس زرپرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ دوسرے ایسا کام بتانا چاہا ہے جس کا اصلی انجام خود کام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اسی طرزِ عمل کی رہینِ منت ہیں۔ ہمارے مستقبل کے لئے اس نئے طرزِ خدمت کا رواج ایک فالِ نیک ہے۔

دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لئے ایک نئی راہ نکلتی ہے، تعلیمی آزادی کا وہ خیال جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے اس انجمن کے قیام سے اور روشن ہو گیا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو۔ بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو، غیر سرکاری مدارس کی انتظامی جماعتوں اور اس کے ملازموں یعنی ذاتی تعلیمی کام کرنے والوں کی روز کی کش مکش، وکیلوں اور تاجروں اور عہدہ داروں کے ان بے جوڑ طبقوں کو جو استادوں کو خریدتے ہیں اور زرخرید چیز کی طرح برتتے ہیں اور ان استادوں کو جو اپنے کو جنسِ بازاری کی طرح بیچتے ہیں تعلیم گاہوں میں یکجا کر کے صحیح تہذیبی تعلیمی مرکز کیسے بن سکتے ہیں تعلیم کا کام صرف انھیں کرنا چاہیئے۔ جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں جو اس کے بغیر بے چین رہیں۔ جو اس کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھیں اور جو اس کام کی اہمیت اور اپنی اس کے ساتھ وابستگی کے باعث خود اپنا احترام

کرتے ہوں اور آزاد ہوں کہ اپنے کام کو اپنی بصیرت کے مطابق بہترین طریق پر انجام دیں، میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے، اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں۔ اور ہماری تعلیم کا کام کرانے کے کام کی جگہ عبادت کی ایک شکل بن جائے۔

آزادی اور خودمختاری کی یہ تدریجی نشو و نما بے حقیقت ہوتی اگر اپنے مالی وسائل کی فراہمی میں جامعہ اس کے مناسب حال طریقہ اختیار نہ کرتی، چنانچہ جامعہ نے یہ کیا، ہماری جدید تعلیم گاہیں عموماً سرکاری گرانٹ اور امرا کی امداد سے چلتی ہیں اور اس طرح کہ ان کا وجود انہیں پر منحصر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی تعلیمی جماعت اپنے کام کے شرف کا احساس رکھ کر آزادی کی خواہش بھی رکھتی ہو تو وہ آزادی خالی دکھاوے کی آزادی ہو سکتی ہے۔ جامعہ کا کام جب سے اس کے واقعی کام کرنے والوں نے انجمن جامعہ ملیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انہوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا۔ سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا، متمول طبقہ کی مدد کیا اب بھی اہلِ ثروت سرکاری بے اعتنائی بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے بھی ابھی اپنی ساکھ پیدا نہ کی تھی کیسے اپناتے، اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے اپنے وجود اور اپنے طرز کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے۔ ہم نے چند خواص کی جگہ جمہور ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا اور ۱۹۲۶ء میں ہمدردان جامعہ کے نام سے ایک حلقے کی تنظیم شروع کی جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہو گئے ہیں جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں لیکن ایک یا نہیں بلکہ برابر مرحمت فرماتے رہے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کر دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوسرے دوستوں کو بھی اس حلقے میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق دو چار صاحبان سے نہیں، بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رک جائے گا۔ بلکہ ہماری مدد صرف اس وقت بند ہو گی جب ہم اتنے برے ہوں کہ جمہور امت ہم سے متفقہ طور پر ناخوش ہو جائیں۔ اس وقت بے شک یہ مدد بند ہو بھی جانا چاہیئے اور ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم کیوں اپنے ہمدردوں کی ہمدردی قائم نہ رکھ سکے۔

سنہ ۳۲ء میں اس حلقے سے ۵ ہزار روپے جمع ہوئے تھے۔ سنہ ۴۲ء میں اس نے ۴۳ ہزار فراہم کیے۔ سنہ ۴۳ء میں ۳۲ ہزار سنہ ۴۴ء و سنہ ۴۵ء میں ۴۱ ہزار اور سنہ ۴۵-۴۶ء میں جوبلی کے خاص چندے کے علاوہ جو اسی حلقے کی معرفت جمع کیا گیا ہے اور جس میں اس نے دو لاکھ اڑتیس ہزار روپیہ فراہم کیا ہے اپنے معمول کے طور پر اڑتالیس ہزار روپے جمع کیے۔ اس عمومی امداد سے ہمیں پتہ چلتا رہتا ہے کہ ہماری قوم ہمارے کام کے متعلق کیا سمجھتی ہے۔ پچھلے تیرہ سال کا اندازہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس حلقے نے ۵ ہزار سے بڑھ کر ہماری گرانٹ ۴۸ ہزار کر دی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ زمانہ کیسے ہیجان کا زمانہ رہا ہے اس میں لوگ ہم سے ناخوش بھی ہوئے ہیں ہم پر نکتہ چینی بھی ہوئی ہے، ہم نے صحیح تنقید سے سبق لیا ہے، غلط کو صبر سے سنا اور سہا ہے اور قوم نے ہمیں اس سال میں اڑتالیس ہزار چھوٹے چھوٹے چندوں کی شکل میں عطا فرمائے ہیں۔

پھر قوم کے عوام کے ساتھ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اہلِ ثروت کا اعتماد بھی حاصل ہوا۔ اعلیحضرت حضور نظام نے، اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال نے اعلیٰ حضرت فرمانروائے رامپور نے زیارت کشمیر نے، پھر دہلی میونسپلٹی نے ہمارے کام کے لیے مستقل امدادیں عطا فرمائیں اور وہ کام جو   کر ہوتا، مگر ہوتا، ذرا آسانی سے انجام پا سکا۔

قوم کی مدد سے اس کے متوسطین اور امرا دونوں کی مدد سے یہ کام رفتہ رفتہ بڑھا، جامعہ کے پاس جس نے پچیس سال پہلے بغیر ایک چپہ زمین کے اور بغیر عمارت کی ایک اینٹ کے، اور بغیر سرمایہ کے ایک پیسہ کے، کام شروع کیا تھا۔ آج اوسط قیمتوں کے لحاظ سے ۱۵ لاکھ سے اوپر کا اثاثہ ہے، موجودہ قیمتوں میں تقریباً ۳۰-۳۵ لاکھ کا، اس کے کام کو تعلیمی حلقوں میں، اس ملک میں، اور اس ملک کے باہر بھی کچھ نہ کچھ پسند کیا گیا ہے، اس کی مثال نے اور اس کے کام کرنے والوں کے اثر نے قوم میں تعلیمی کام کے اصولوں کو کم سے کم فکری طور پر ضرور متاثر کیا ہے۔ اس کی مقبولیت بڑھی ہے۔ اس سال اس کے مدرسۂ ابتدائی میں ایک ہزار سے اوپر داخلے کی درخواستوں میں سے صرف چالیس بچوں کی درخواستیں منظور کی جا سکی ہیں۔

جو ہم پر شبہ کرتے تھے، اور ہمارے تعلیمی کام کو اور کاموں کے لئے بس ایک آڑ سمجھتے تھے وہ بھی مطمئن ہوں گے۔ حکومت ہند نے دو سال ہوئے ایک بڑی مستند کمیٹی سے ہمارا کام دکھوایا اور اس کمیٹی نے ہمارے تمام امتحانوں کے سرکاری طور پر تسلیم کئے جانے کی سفارش کی، چنانچہ ہمارا جامعہ جونیر کا امتحان سرکاری طور پر مسلمہ میٹرک یا اسکول فائنل کے مساوی تسلیم کر لیا گیا۔ اور ہمارے استادوں کے مدرسے کے صداقت نامے کو بنیادی مدرسوں کی معلمی کے لئے مستند مانا گیا۔ حکومت ہند نے اپنے ساٹھ منتخب اساتذہ کو ہمارے استادوں کے مدرسہ میں تربیت کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

آج جامعہ ایک چھوٹا سا اقامتی کالج چلا رہی ہے جس کے متعدد فارغ جامعہ کے کام میں اپنی ساری قوتیں وقف کر رہے ہیں، اور ملک کے مختلف گوشوں میں علمی، تعلیمی، صحافتی، تجارتی، سیاسی کاموں میں نیک نامی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا کوئی پچیس ہزار مجلدات پر مشتمل کتب خانہ جمع کر لیا ہے۔ ایک اقامتی مدرسہ ثانوی، ایک اقامتی مدرسہ ابتدائی چلا رہی ہے۔ جن میں جدید طریق ہائے تعلیم پر تجربے کئے جا رہے ہیں، اور انھیں اپنی قومی ضرورتوں کے لئے مفید بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، ایک ادارہ تعلیمی مرکز کے نام سے شہر دہلی میں چل رہا ہے جو ایک مڈل اسکول، ایک عمومی دارالمطالعہ عام اجتماعیات کے لئے ایک ہال پڑوس کے شہریوں کے لئے ایک کلب پر مشتمل ہے اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے، تعلیم بالغاں کے طریقوں پر تجربہ حاصل کرنے کے لئے ادارہ تعلیم و ترقی کے زیر اہتمام ایک تجرباتی مرکز قائم ہے اور دوسرے کام کرنے والوں کے لئے طریقۂ کار سے متعلق لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ اس نے بالغ مبتدیوں کے لئے ڈیڑھ سو سے اوپر رسالے شائع کئے ہیں۔ ایک استادوں کا مدرسہ ہے جس میں بنیادی مدرسوں کے استادوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے، اردو میں اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر مکتبہ جامعہ انجام دے رہا ہے اور آج اردو کے خادموں میں صف اول میں اپنے لئے ایک اچھی جگہ پیدا کر چکا ہے۔ ایک چھوٹا سا شعبہ مصنوعات جامعہ کی مدرسہ ثانوی کے معمل سائنس سے متعلق ہے اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کرتا ہے، ان مختلف اداروں کے کچھ کام کا اندازہ آپ کو جوبلی کی نمائش کے ملاحظے سے ہو سکے گا۔

غرض خاصہ پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں لیکن سب کچھ ناچیز سا کام ہے۔ ابتدائی حالت میں ہے۔ ہر پہلو سے اصلاح و ترقی کا پیاسا ہے اور بلا کسی بے جا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم سے آنکھیں اٹھانے کا بھی یارا نہیں پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر نتیجہ۔ پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب - جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر پختہ کام کی طرح سست رفتاری ہے، جانتا ہوں کہ تعلیمی تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارنے میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے چمن بندی ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچا ہوتا ہے۔ دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اسی میں ملانا ہوتا ہے، اور یہاں خون جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خونِ جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلد بازی ہے۔ اگر ہم کے ان تھوڑے سے دلوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اٹھے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں۔ اور برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں۔ جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ للعالمین کے چمن کے نونہال بار آور اور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول ہو، وہ ہر جگہ سے حکمت چنیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلیٰ حضرت، اکابر قوم، اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو، اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنان جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی! اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ

ارادہ پورا ہو کر رہے گا لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمے بھی ہے

جیسا کہ آپ صاحبان اعلیٰ حضرت کی زبانِ مبارک سے ابھی سن چکے ہیں، اس منصوبے کو ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لئے ہم نے اگلے چند سال میں بعض کام شروع کرنے کا قصد مصمم کر ہی لیا ہے، طالب علموں اور استادوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ہوسٹل اور مکان فوراً بنوانے ہیں، چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک اچھا کنڈرگارٹن بنانا ہے۔ ثانوی تعلیم میں ضروری تنوع پیدا کرنے کے لئے ایک صنعتی اور تجارتی مدرسہ قائم کرنا ہے، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک اقامتی درسگاہ قائم کرنی ہے، علمی تحقیق کے ادارے قائم کرنے ہیں جن میں سے سب سے پہلے اسلامی علوم تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمۃ کو صحیح اور مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ اپنے مرحوم امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی یادگار کے طور پر ایک شفاخانہ بنانا ہے، کتب خانہ کے لئے عمارت بنانی ہے اور اس میں خصوصاً اسلام اور ہندوستان سے متعلق کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کرنا ہے اور اس نو آبادی کے مرکز میں اس کے قلب کی حیثیت سے ایک مسجد تعمیر کرانی ہے، ان کاموں کے لئے میں نے اپنی ناتجربہ کاری میں دس لاکھ کا اندازہ کیا تھا، اس امید پر کہ جنگ کے بعد قیمتیں کچھ تو اپنی سابقہ حالت کے قریب آئیں گی لیکن یہ خیال غلط نکلا اور اب اس کام کے لئے تقریباً تیس لاکھ کا اندازہ کیا جا رہا ہے، ہم نے قوم سے جوبلی کے موقع پر دس لاکھ روپیہ مانگا۔ دس لاکھ سے زیادہ تقریباً بارہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا انتظام قوم نے کر دیا ہے لیکن اب ان اٹھارہ لاکھ کا انتظام بھی تو اسی کو کرنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ انتظام بھی ہو ہی جائے گا لیکن جلد ہو یا دیر میں ہم نے کام شروع کرتے وقت کب پہلے روپیہ جمع ہو جانے کا انتظار کیا تھا کہ اب اس کے منتظر رہیں گے یہ کام تو خدا نے چاہا تو ہو گا ہی۔ اگر یہ اچھا کام ہے تو خدا آپ سب کو اس کی تکمیل کی سعادت میں شرکت کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے جامعہ کی پچھلی روداد اور اس کے اگلے منصوبوں کا ایک مختصر سا، ذرا منتشر سا خاکہ پیش کر دیا ہے، اب اپنے سچے جذبات تشکر کا اظہار باقی ہے، سب سے پہلے اعلیٰ حضرت کا اس عزت افزائی اور ہمت افزائی پر شکریہ جو حضور نے یہاں تشریف فرما ہو کر اور اس جلسہ کی صدارت فرما کر ہم کارکنان جامعہ کی کی ہے، حضور یہ عزت افزائی اس لئے بھی ہے کہ خدا نے آپ کو اپنی زمین کے ایک حصے اور اپنی مخلوق کی ایک معتدبہ آبادی کی پاسبانی سپرد فرمائی ہے،

آپ کو دولت و اقتدار عطا فرمایا ہے کہ آپ ایسے کہ بادشاہوں کی محفل کے لئے زینت ہیں، ہم
فقیروں کی مجلس میں تشریف لانا قبول فرمایا لیکن اعلیٰ حضرت سے زیادہ کس پر روشن ہوگا
اس لئے کہ آپ دونوں کے محرم ہیں کہ اچھی دنیا میں مادی اقتدار کو ذہنی اقتدار کے سامنے
اور دولت کو فقر کے سامنے جھکنا چاہیئے۔ مادی اقتدار اور دولت کے لئے یہ بڑی سعادت
ہے کہ ذہنی اقتدار اور فقر اسے اپنی خدمت میں قبول فرمالیں۔ حضور کی تشریف آوری سے
ہماری حقیقی عزت افزائی اور ہمت افزائی، آپ کے دولت و اقتدار ہی کے باعث
نہیں ہے بلکہ اس فقر کی وجہ سے ہے جس کا اس لباس خسروی میں پناہ لے جانا ظاہری
فقیروں کے فقر سے کہیں مشکل تر اور اس لئے بہت زیادہ واجب الاحترام ہے، ہم فقیروں کی
عزت افزائی اس درویش خسروی، اس شاہ فقر شعار، اس امانت دار دولت و اقتدار
کی تشریف آوری سے ہے، جس کی سروری خدمت گزری ہے اور بادشاہت ابدیت کی
ذمہ داریوں کو کماحقہٗ انجام دینے کا موقع، اعلیٰ حضرت ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

پھر قائد اعظم محمد علی جناح اور حضرت محترم مولانا ابو الکلام آزاد کا تہ دل سے
شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس جشن میں شرکت فرما کر ہمیں مفتخر فرمایا، آپ کی قوم کے
چند بوڑھوں اور نوجوانوں نے خاموش تعلیمی کام کا ایک نمونہ اس جامعہ میں پیش کرنا چاہا
ہے۔ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف بگڑنے
سے بچا کر نہیں ہو سکتا، بلکہ اُسے بناتے رہنے کا طالب ہوتا ہے، آزادی ہو یا زیر حیات
تمدنی، یا اقتدار عالی مطلقہ یہ بس ایک بار حاصل کر لینے اور سونپ کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں
ہیں یہ انھیں کو ملتی ہیں اور انھیں کے پاس رہ سکتی ہیں جو ہر دم ان کی از سر نو حصول اور
ہر دم از سر نو تخلیق کی دشواریاں انگیزنے پر تیار رہیں، چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن ہم
ہندستانی مسلمانوں میں اس تخلیقی عمل کے نمائندے بننا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ
ہمارے کام کو پسند فرمائیں گے۔ آپ کی پسند ہماری محنتوں کا بڑا انعام ہوگی۔

پھر پنڈت جواہر لال نہرو، اور دیگر وزرائے حکومت ہند کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ
وہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ہماری اس تقریب میں شرکت کے لئے
وقت نکالا۔ آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں لاکھوں نہیں کروڑوں
آدمیوں کے دلوں میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر

یہ تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازی شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح پر اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورہ میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گذار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے۔؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں۔ اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے، ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گذرتی ہے، جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں، شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو گیا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے، خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی کیسے لگی۔ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے۔ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجئے۔

پھر ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہمارے جشن میں شرکت فرما کر اس کی رونق بڑھائی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمارا دل بڑھایا، اس بدامنی کے زمانے میں سفر کی صعوبتیں برداشت فرمائیں، ہم شرمندہ ہیں کہ ان کے آرام و آسائش کا پورا انتظام نہ کر سکے لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری ان فروگذاشتوں کو معاف فرما دیں گے ان کارکنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصاً عہدہ داران ریاست رامپور کا جن کی مدد کے بغیر ہم اپنے مہمانوں کو اتنا آرام بھی نہ پہونچا سکتے، ان دوستوں نے ہمارے ساتھ اس طرح کام کیا کہ گویا یہ ان ہی کا کام تھا، اور سچ یہ ہے کہ ان کا کام اسی قدر تھا جتنا کہ ہمارا، ہم ان کی اس عنایت کو کبھی نہ بھولیں گے۔

آخر میں اعلیٰحضرت، میں چند لمحوں کے لئے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کرکے، اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا حضور والا نے اپنے ارشادات صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں، کاش میں ان کا مستحق ہوتا، حضور، جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں۔ میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارے کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں، میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے اور کسی ادارے کو نصیب ہوں گے، انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے، یہ قوم کے بچوں کے لئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لئے ترسے ہیں۔ یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لئے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا تکمیلاً انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیقی رسائل کو ترستے ہیں۔ انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لئے زمین خرید وا دیتے ہیں۔ اور اپنے مطالبات کو ملتوی کر دیتے ہیں، یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک ہیں، انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے۔

آغشتہ اند بر سرِ خارِ بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ اند

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نئی تعلیم

ولیم ایچ کلپاٹرک اور منصوبوں کا طریقہ

ولیم ایچ کلپاٹرک کو عام طور پر ڈیوئی کے مفسر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے لیکن جدید نظریۂ تعلیم کے اور اس کے طریقوں کے بنانے میں خود کلپاٹرک کا بھی بڑا ہاتھ ہے، کولمبیا یونیورسٹی کے استادوں کے مدرسہ میں اس کے جو لکچر ہوتے تھے ان میں طلبہ کا اسقدر ہجوم ہوتا تھا کہ اسے لوگوں نے کروڑپتی پروفیسر کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لکچروں کی طرح اس کی تصانیف بھی اتنی ہی سادہ اور قابلِ فہم ہوتی ہیں کہ ہزاروں معلم آزادی کے ان رجحانات سے واقف ہو گئے ہیں جو امریکہ کی تعلیم میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی بعض اہم تصنیفوں کے نام یہ ہیں "مانٹیسوری نظام کی جانچ پڑتال" (۱۹۱۴) — "فرابل کے کنڈرگارٹن کے اصولوں کی تنقیدی جانچ" (۱۹۱۶) "تعلیم کے فلسفہ کے ماخذوں کی کتاب" (۱۹۲۳) "طریقۂ کار کی بنیادیں" (۱۹۲۵) "بدلتی ہوئی تہذیب کے لیے تعلیم" (۱۹۲۶)

جیمس اور تھارن ڈائک وغیرہ کی نفسیات سے متاثر ہو کر اور تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی نظام کی اہمیت کے قائل ہونے کے بعد کلپاٹرک کا مطالبہ یہ تھا کہ مدرسہ کو "ایسی جگہ بنایا جائے جہاں بچے حقیقی تجربے کر سکیں" اپنی نفسیات و تعلیمی عمل پر منطبق کرتے ہوئے کلپاٹرک نے بتلایا: تعلیم کا ہر پُرمعنی تجربہ ایک حد تک بعد کے تجربے کی تعمیر کرتا ہے۔ زندگی کے امکانات کے بارے میں ایک وسیع تر منظر اور زندگی کے اعمال کے بارے میں ایک گہری بصیرت عطا کرتا ہے جو مختلف النوع نئی چیزیں دیکھی اور محسوس کی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں بھی مختلف النوع انداز طبیعت اور مختلف قدرشناسی کے جذبوں کو پیدا کرتا ہے۔ تکنیک میں اضافہ اور تجربے کے عمل پر نگرانی کی طاقت بخشتا ہے۔ تاکہ اسے شعوری رہنمائی کے ماتحت لایا جا سکے۔

کلپاٹرک کے خیال کے بموجب تعلیم اور آموزش کی مختلف قسمیں اپنا کام علیحدہ علیحدہ نہیں کرتیں۔ چنانچہ اس بات کو اس نے دلچسپ پیرایہ میں اس طرح بیان کیا کہ "پوری بلی چوہے پکڑتی ہے" کلپاٹرک کا عقیدہ تھا کہ تعلیم کے تین پہلو ہوتے ہیں (۱) ذہنی (۲) جسمانی اور (۳) مزاجی۔ پہلا پہلو کس طرح ہے، اس کی نمائندگی کرتا ہے یعنی مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ دوسرا

مہارت کے پہلو کی نمائندگی کرتا ہے اور تیسرا چیز کے مطالعہ کے لئے محرک فراہم کرتا ہے۔

منصوبوں کا طریقہ

ڈیوئی، مریم اور فرانسس ۔ ڈبلیو پارکر اسکول کا شعبۂ تعلیم جس غور وفکر اور تجربے میں مصروف تھے اس نے آخر کار پراجکٹ کے طریقہ کو پیدا کیا۔ کلپاٹرک اس طریقہ کا پہلا اور سب سے ممتاز مبلغ ہے۔ نفسیاتی اصول کے لحاظ سے پراجکٹ کے طریقے کو ڈیوئی کے عمل فکر کی تطبیق قرار دیا جاسکتا ہے پراجکٹ کی مختصر تعریف یہ ہے کہ یہ ایک بامقصد مشغلہ ہے جو ایسے حالات کے ماتحت کیا جاتا ہے جو حقیقی زندگی سے بہت قریب اور مشابہ ہوتے ہیں۔ پراجکٹ کا طریقہ تعلیم کو غیر رسمی بنانا چاہتا ہے۔ اور اسے شاگرد کی ضرورت کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ "بامقصد تجربے کا ایک واحدہ ہے .... جہاں مقصد غالب بطور ایک محرک کے (۱) عمل کے مقصد (منتہا) کو مقرر کرتا ہے (۲) طریقۂ عمل کی رہنمائی کرتا ہے اور (۳) اس کے لئے قوتِ عمل فراہم کرتا ہے۔ یعنی جو جوشِ تکمیل کے لئے ایک اندرونی محرک فراہم کرتا ہے۔

پراجکٹ کی کئی قسمیں کی گئی ہیں۔ خود کلپاٹرک نے ان کی یہ فہرست بنائی ہے پیدا کرنے والوں کا پراجکٹ، خرچ کرنے والوں کا پراجکٹ، مشق یا مخصوص مطالعہ کا پراجکٹ کلپاٹرک کے علاوہ ایلسورتھ کالنگس ایک دوسرا معلم ہے جس نے پراجکٹ کے طریقہ کو عام رواج دینے میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ اس کے نزدیک پراجکٹ کی حسب ذیل قسمیں ہیں۔ کھیل کے پراجکٹ، تفریحی سیروں کے پراجکٹ، کہانیوں کے پراجکٹ، اور دستی پراجکٹ۔

تجربی مدرسوں میں جہاں پراجکٹ کا طریقہ پیدا ہوا اور جہاں اس نے نشوونما پائی اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ یہ مدرسوں کو مضامین کی سخت اور ناقابل تبدیل حدبندیوں سے نجات دلائے گا۔ ہربرٹ کے طریقہ نے تعلیم کو بالکل مشین جیسا بنا دیا تھا۔ اس کی پوری توجہ واقعات کو جذب کرانے کی طرف تھی اس نے حفظ یاد کرانے اور ذہنی کام کرانے پر بہت زور دے رکھا تھا۔ اس طریقہ کو کتابی تعلیم میں خصوصی مہارت حاصل تھی لیکن جو مضمون بچہ کو اس طریقہ سے سکھلایا جاتا تھا وہ بچہ کی زندگی سے بہت دور ہوتا تھا۔ اور اس کی زندگی سے اس کا کوئی واضح تعلق نظر نہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ روایتی طریقہ، استاد سے مصروفیت کا بہت

زیادہ مطالبہ کرتا تھا جس کی وجہ سے طلبہ مجہول بن جاتے تھے ۔ ڈیولی ۔ مریم اور دوسرے مصلحین یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس روایتی طریقہ سے نجات حاصل کریں ۔ ان کے نزدیک کوئی مضمون بذاتِ خود اہم نہیں تھا خصوصاً اُن باقاعدہ جرعوں کی صورت میں جس طرح اسے مدرسے میں بچوں کو گھونٹ کر پلایا جاتا تھا ۔ چنانچہ بعد میں اسی بات کو کلپاٹرک نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ۔ ہمیں بچہ کو "حساب اس وقت سکھانا چاہیئے ۔ جب اس کی ضرورت ہو یعنی ایسے محل اور موقع سے اسے مربوط کر کے جس میں حساب کی حقیقی ضرورت محسوس ہو اس کا اثر یہ ہوگا کہ حساب کا مضمون زندگی کے راستے میں بہت سے مقامات پر بکھرا ہوا نظر آئے گا ۔

تخلیقی تحریر اور ارلس

پُرانی طرز کا روایتی مدرسہ الفاظ کی تحریر کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس کلچر کو جو اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ آسانی سے ذہن میں محفوظ اور گفتگو کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا، تحریر کے ذریعے محفوظ کرے ۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا تعلیم کو زیادہ سے زیادہ اس بات سے سروکار رہنے لگا کہ طلبہ تحریری زبان پر پوری طرح قادر ہو جائیں اور گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے جب سے کہ مطبوعہ الفاظ کی اہمیت زندگی کے معمولی کاروبار میں روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے ۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات بالکل صحیح ثابت ہو رہی ہے ۔ انیسویں صدی میں نہ صرف یہ ہوا کہ تمام تعلیم کو لفظی بنا دیا گیا بلکہ تقریباً سارے تعلیمی پروگرام کا مغز اور جوہر مطبوعہ مواد ہی میں نظر آنے لگا ۔ پھر جب تعلیم کا مقصد ضبط کی عادتیں پیدا کرنا قرار دیا گیا تو پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کو بھی ضبط کی تربیت کا اصلی وسیلہ سمجھا جانے لگا ۔ یہ خیال کہ لکھائی، نقل کرنے اور چربہ اتارنے کی مشق سے بھی زیادہ کوئی چیز ہے اول تو کبھی کسی ذہن میں آتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی اتفاق سے آتا تھا تو اس کو فوراً مسترد کر دیا جاتا تھا ۔ بچہ کی جانب سے اظہار ذات کی کوشش کو اتنا اہم نہیں سمجھا جاتا تھا جتنا کہ معیاروں کی پابندی کو ۔ چنانچہ تحریر میں خیال کے اظہار کے مقابلہ میں بندشِ الفاظ پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی، مثلاً خوش خطی، قواعد زبان کی پابندی اوقاف نگاری، حاشیہ چھوڑ کر صاف ستھرے کاغذ پر لکھنا، یہ چیزیں تھیں جن پر خاص نظر رکھی جاتی تھی، ان خارجی عاید کردہ پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ تحریر کی انفرادیت پامال

ہو جاتی تھی۔ ایک طالب علم کی اچھی تحریر بالکل ایسی ہی ہوتی تھی جیسی کہ کسی دوسرے طالب علم کی ہوتی تھی۔ تحریر بجائے اس کے کہ بچے کی ذات کا اظہار کرتی افسوسناک طریقہ پر فرسودہ طریقوں کی پابند بن جاتی تھی پھر تحریر کی بنیاد چونکہ کوئی محسوس شدہ ضرورت نہ ہوتی تھی اس لئے یہ مفہوم سے معرا ہو جاتی تھی اور بچے کے نزدیک اس کی اہمیت اس سے زیادہ نہ ہوتی تھی کہ اس نے بالغوں کے بتلائے ہوئے گروں میں مہارت اور چابکدستی پیدا کرلی ہے۔

لیکن ڈیوی اور بیسویں صدی کے دوسرے تعلیمی مفکروں نے بچوں کو بالغوں کے معیار کے مطابق تربیت دینے کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے قواعد زبان کی رواجی پابندی کی جگہ بے تکلفانہ اظہار خیال پر زیادہ زور دیا بچہ کے خیالات کو انھوں نے اس کی ادبی مہارت کے مقابلے میں کہ وہ بالغوں کے طریقۂ اظہار کی اچھی نقالی کرسکتا ہے۔ زیادہ اہم قرار دیا۔ مناسب رہنمائی میں بچہ کیا کچھ کرسکتا ہے اس بات کو مے ارنس نے تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ ثابت کردیا۔ وہ نیو یارک کی یونیورسٹی میں تعلیمات کا پروفیسر تھا اور اس نے دو کتابیں "خالق نوخیز" اور "تخلیقی قوت" کے نام سے تصنیف کیں۔ مے ارنس کو کالج کے طلبہ کی تعلیم ہی میں خداداد مہارت حاصل نہیں تھی بلکہ وہ چھوٹے بچوں کا بھی ویسا ہی اچھا معلم تھا۔ "خالق نوخیز" میں اس نے اپنے ان مشاہدوں کو درج کیا ہے جو لنکن اسکول کی معلمی کے زمانے میں اس نے کئے تھے۔ اس مدرسہ میں جو طلبا موجود تھے ان ہی سے اس نے اپنے کام کی ابتدا کی یعنی غیر پختہ جونیر ہائی اسکول کے طلبہ سے جنھیں اچھی تحریر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان نو عمروں کو مے ارنس نے کتابیں پڑھ کر سنائیں اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں تنقید کے سلسلے کو بھی جاری رکھا، آہستہ آہستہ ان میں سے وہ طلبا جو زیادہ قابل تھے وہ خود بھی اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے کتابیں پڑھنے کی طرف راغب ہو گئے۔ آہستہ آہستہ انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ کتابوں پر تنقید بھی کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس خود بھی کچھ کہنے کے لئے موجود ہے اور جو کچھ وہ کہتے تھے اس کی مصنف کی تحریر سے علیحدہ بھی ایک اہمیت ہے۔ مے ارنس کہتا ہے کہ "ہم پڑھتے تھے۔ اس کے بعد پچاس منٹ تک جگالی کرتے تھے۔ پرانے مرغوب مصنفین کی تحریروں سے وہ لطف و اثر حاصل ہوتا تھا جو عمدہ نغموں کے دہرانے سے ہوتا ہے .... ان تجربوں کے نتیجے کے طور پر

رابرٹ فراسٹ کلب قائم کیا گیا اور اس کلب نے ادب کی کلاس کی جگہ لے لی، شاگردوں سے پڑھنے کے لئے کہا جاتا تھا لیکن وہ کیا پڑھیں، یہ بات خود ان کی پسند پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں عمدہ تحریریں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں اور ایسے بصیرت افروز تبصرے کئے جاتے تھے جن سے وہ چیز جو پہلے بے جان تھی ان کے لئے پُرمعنی بن جاتی تھی۔ دلچسپی بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی قدروں کے بارے میں زیادہ سرگرمی اور زیادہ پختگی کے ساتھ بحثیں کی جانے لگیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آٹھویں جماعت تک پہونچتے پہونچتے بچے ادبی خوبیوں کے بارے میں بہت اچھی طرح نقد و تبصرہ کرنے لگتے تھے۔

تحریر کی جماعت میں بھی مے ارنس نے اسی طریقہ کی پیروی کی۔ یہاں بھی اس نے ایک بے میل جماعت میں اپنا کام شروع کیا۔ یہاں بھی کوئی مقررہ چیز تحریر نہیں کرائی جاتی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض وقت پورا سال گذر جاتا تھا اور بچہ کچھ بھی نہ لکھتا تھا لیکن اس کے بعد بچے کی تخلیقی قوت بیدار ہوتی تھی۔ مے ارنس اپنا کام انفرادی ملاقاتوں اور جماعت کے ہمدردانہ اور مشفقانہ مباحثوں سے شروع کرتا تھا اور اپنے شاگردوں میں خوداعتمادی کا احساس پیدا کراتا تھا۔ آہستہ آہستہ بچے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دیتے تھے لیکن مے ارنس برابر اس بات پر زور دیتا رہتا تھا کہ پوری قوت اور محنت کے ساتھ کوشش کریں۔ ابتدا میں بچہ تخلیق کرتا تھا اس کے بعد اس کو اپنی اس تخلیقی تصنیف کو بہترین شکل میں پیش کرنا ہوتا تھا۔ مے آرنس کے نزدیک ادارت و ترتیب کا یہ میکانکی عمل بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس نے پُرزور طریقے پر لکھا ہے "اپنی جگہ پر یہ سرد ذہنی منزل بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تخلیقی کام کی قدر اسی تناسب سے زیادہ ہوتی ہے، جتنی کہ اس کے خالق کے اندر ذہانت ہوتی ہے۔ مے ارنس کی استادانہ رہنمائی کے زیر اثر بچے نہ صرف عمدہ نثر لکھنا شروع کر دیتے تھے بلکہ نہایت حسین نظمیں بھی کہنے لگتے تھے "خالق نوخیز" اور تخلیقی قوت" یہاں اس نے ان کی بیسیوں مثالیں درج کی ہیں۔ نوخیزوں کی خلاقیت کو ابھارنے میں مے ارنس کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ مے آرنس خود ایک اچھا تخلیقی صناع تھا وہ خود کہتا ہے "میں لکھنے والا ہوں لکھنا سکھانے والا نہیں ہوں اور خدا کی ان دونوں مخلوقوں میں بڑا زبردست فرق ہوتا ہے

لکھنے والے کے لیے تحریر ایک تجربہ کا اظہار ہوتی ہے لیکن لکھنا سکھانے والے کے لیے تحریر اکثر و بیشتر محض تربیت کا ایک طریقہ ہوتی ہے، اس کے علاوہ مے ارلس بچوں کا شمار طالب علموں میں نہیں بلکہ تخلیقی اشخاص میں کرتا تھا۔ "وہ زبان کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے صنّاع ساری دنیا میں ہر زمانے میں اپنے معمول کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں یعنی اس کو بذاتِ خود مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اپنے خیال یا جذبہ کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ زبان بجائے خود نسبتاً غیر اہم چیز ہے۔ وہ بھی لفظ پر توجہ نہیں کرتے بلکہ اس قوت پر کرتے ہیں جو لفظ کو پیدا کرتی ہے" ان سب باتوں سے زیادہ مے ارلس اس بات پر زور دیتا تھا کہ طلبہ کے اندر آمد ہونی چاہیے بچہ کے کام میں کسی قسم کی مداخلت اور اس پر کوئی جبر نہ کرنا چاہیے۔ ماحول موافق اور سازگار بنانا چاہیے، مذاق اڑانا، شرم دلانا، غلط معیار قائم کرنا۔ اس طرح کی کوئی چیز نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ ہمدردی کے ساتھ بچے کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے "نوخیز اسی وقت ہیں اس مملکت کی جس کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں لگایا جا سکا ہے اور جس کے نشان و آثار بہت دھندلے ہیں ایک جھلک دکھلاتے ہیں جب انھیں بے خوفی کے ساتھ وہ بننے دیا جاتا ہے جو وہ ہیں، جب انھیں بالغوں کی مربیانہ سرپرستی سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور جب وہ اپنے کھیل میں یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کم تر درجہ کے ہیں"

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مے ارلس مکمل اور غیر محدود آزادی کا حامی تھا۔ انتہا پسند ونیکسن کی طرح وہ اس بات پر زور نہیں دیتا تھا کہ بچہ کو مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے اور بالغوں کی طرف سے حکومت، مذہب یا خاندان کی پابندیوں کی صورت میں اس کے معاملات میں کوئی مداخلت نہ ہونا چاہیے۔

"مجھے سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ ان نوخیزوں پر خود غلط ہونے کا الزام لگایا جائے گا۔ نوخیز جب اپنی قوتِ متخیلہ کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے بڑے اس کو یہی نام دیتے ہیں، ہم جانتے تھے کہ ہمیں ان بچوں کو دنیا کے سخت اور ناقابلِ تبدیل رسم و رواج بھی سکھلانا چاہئیں ...... مختصر یہ کہ ان کو ہمیں ادب تمیز سے بھی باخبر کرنا چاہیے لیکن فارغ التحصیل ہونے سے پہلے جتنے سبق انھیں سکھلائے گئے ان سب میں یہ سب سے کٹھن سبق تھا۔ بہرحال ہم نے اپنی طرف سے اس کے سکھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا

رکھی"۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ قدرتی پن اگرچہ اچھی چیز ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے، بعض موقعے اظہارِ ذات کے ہوتے ہیں اور بعض مصلحت شناسی کے"۔ ہمارے بچوں کی کامیابی کا راز اس ماحول میں ہے جو ہم معلم کی حیثیت سے ہشیاری کے ساتھ اور شعوری طور پر روزانہ بچوں کے لئے پیدا کرتے رہتے ہیں جو اثرات مدرسہ شعوری طور پر پیدا کرتا ہے۔ ان کی موجودگی میں ہمیں بھروسہ ہے۔ بچوں کا رنگ قدرتی ہی رہتا ہے وہ عام طور پر اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ ہماری ہدایت کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ لیکن ہم بہرحال اس کی اہمیت سے ہر لمحہ باخبر رہتے ہیں۔

فرانز سی زیک اور تخلیقی آرٹ

نئی تعلیم کے بانیوں میں ایک اور ممتاز نام فرانز سی زیک کا ہے اس نے نازیوں سے پہلے کی جمہوریت آسٹریا میں خداداد صلاحیت رکھنے والے بچوں کی آرٹ کلاس میں نمایاں کام انجام دے کر اور صنعت و حرفت کے مدرسہ کے طلبہ میں اپنے تعلیمی فلسفہ کو پھیلا کر مدرسوں کی اصلاح میں نہایت اہم حصہ لیا۔ تقریباً پچاس سال سے سی زیک تخلیقی اظہار کے ذریعہ بچوں کی قدرتی طاقتوں کو آزاد کرنے پر زور دے رہا ہے۔ اس کا قول ہے کہ "ہمیں ڈھکنا اٹھا دینا چاہیئے"۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ہر بچے میں کسی نہ کسی چیز کی تخلیق کے ذریعے اپنی ذات کو ظاہر کرنے کا ایک قدرتی رجحان پایا جاتا ہے اگرچہ شروع میں اس اظہار میں کوئی فن کاری نہیں دیکھی جا سکتی۔ یہ قدرتی چیز ہے، صناعی نہیں ہوتی یہ خالقیت ابتدا میں بچے کی زائد توانائی میں نظر آتی ہے جو کسی نہ کسی خالقانہ اظہار کے ذریعے اپنے لئے ایک راستہ ڈھونڈھ نکالتی ہے بعد میں جب یہ توانائی گھٹنے لگتی ہے تو بچہ اپنے قرنوں کے ترکہ سے اکتساب فیض کرنا شروع کر دیتا ہے، آخر میں بچہ کی خالقیت پر اس کے ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ کچھ بچے سی زیک کے مشاہدہ کے بموجب حالات سے بے نیاز ہو کر از خود ترقی کرنے لگتے ہیں۔ کچھ حالات میں ایسے بندھے جکڑے ہوتے ہیں کہ اُن کی خالقیت کی قدرتی صلاحیت تقریباً مفلوج ہو جاتی ہے کچھ صورتوں میں باری باری سے خود مختاری اور خودکاری کے زمانے آتے رہتے ہیں۔　　(باقی آئندہ)

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

عوام کا کالج اور باشندگانِ رامپور سے اپیل

ذیل میں اس خط کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر نے عوام کے کالج کے متعلق عمائدین رامپور کی خدمت میں بھیجا ہے۔

جناب والا۔

آپ کے علم میں ہے کہ ریاست رامپور میں ایک تعلیمی ادارہ ہے جو "عوام کا کالج" کے نام سے موسوم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ریاست کے اس خوبصورت دارالخلافہ کے شہریوں کے لئے تمدنی اور سماجی علوم حاصل کرنے میں آسانیاں مہیا کرے۔ گو اس مفید ادارہ کے اجرا کو ابھی پورے نو ماہ بھی نہیں ہوئے لیکن مجھے اس کہنے میں ممکن ہے کہ باک ہو کہ عوام کے کالج نے تمام خدمات مکمل طور پر انجام دے لیکن اس کہنے میں مجھے ہرگز باک نہ ہوگا کہ ادارۂ مذکور نے بہر صورت شہریوں میں ذہنی اور تمدنی زندگی بیدار کرنے میں بڑی حد تک اعانت کی۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ عوام کا کالج میں ایک کتاب خانہ ہے ایک دارالمطالعہ ہے، اس میں مختلف موضوعات پر تقاریر ہوتی ہیں، کھیل و تفریحات کے ذرائع بھی موجود ہیں اور دنیا کے دوسرے ممالک سے اپنے ملک کے دور دراز شہروں سے رشتہ قائم کرنے کے لئے ایک ریڈیو بھی ہے۔

یہ ادارہ چونکہ اہم مشکلات کے تحت چلایا جا رہا ہے۔ اس لئے فی الحال اس کا حلقۂ استفادیت محدود ہے۔ اس کے لئے ایک موزوں عمارت کی ضرورت ہے اس کی آمدنی کے ذرائع تنگ، اس پر عوام کی کم توجہی۔ لیکن ادارۂ ہذا میں ان سب سے زیادہ اہم خامی آپ کی سرپرستی اور عدم تعاون سے محرومی ہے۔ آپ سے میری مراد انفرادیت نہیں بلکہ اجتماعیت ہے۔ یعنی وہ حلقۂ اصحاب جس سے آپ کا تعلق ہے وہ

ذی اثر، تعلیم یافتہ اور صحبت یافتہ حلقہ جس کے پاس اس قسم کے مخصوص فرد علمی مگر اہم کاموں کے لئے وقت ہے۔ اور جو زندگی کے کسی خاص شعبہ میں ملکہ رکھنے کا دعویدار بھی ہے۔ کالج میں آپ کی تشریف آوری اور اس سے آپ کا لگاؤ۔ اس کے کاموں کی قیمت کو دوبالا کر سکتا۔ اور اس کے مقاصد کو کماحقہٗ وسعت دے سکتا ہے لیکن شاید یہ ہماری کاوشوں کی ناکامی ہے جو اب تک ہم آپ کو اور آپ اس ادارہ کو اپنا نہ سکے۔

اس ذاتی مراسلہ کا مقصد یہ ہے کہ اب میں پھر کسی جود و سخا کی بنا پر نہیں بلکہ اس کو اپنا ایک حق مانتے ہوئے آپ کی توجہ اس مفید ادارہ کی جانب مبذول کراؤں اور آپ سے امداد و تعاون عمل کا طلبگار ہوں۔ ہمارا علم، ہمارا تمدن کس کام آسکتا ہے اگر ہم خود اس سے مستفید ہونے کے موقع نہ حاصل کر سکیں کسی حد تک یہ امر مسلم ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے پڑوسی اور ہم وطن شہریوں نے باوجود آسان ذرائع یکجا ہونے کے اپنے علم و تمدن سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بہرحال ہم ہر تکلیف کا مقابلہ کریں گے اگر ہم کو اس دائمی چیلنج کے جواب دینے سے انکار ہی کیوں نہ کرنا پڑے کہ ۔۔۔

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ
پس چرا با دیگران سپردۂ

ہم لوگ جو کالج کے کاموں سے تعلق رکھتے ہیں آپ سے تین قسم کی امداد چاہتے ہیں۔

۱۔ آپ گاہے گاہے کالج میں تشریف لاتے رہیں۔ ہر روز ۵ بجے شام سے ۸ بجے شب تک کھلا رہتا ہے آئیے اور ان مشکلات کا مشاہدہ فرمائیے جن کے ہوتے ہوئے بھی ہم کالج کے مقاصد بروئے کار لانے میں منہمک ہیں۔ آپ اپنی تجاویز پیش فرمائیے۔ خامیوں پر اعتراضات فرمائیے۔ اور جو چیز آپ کو پسند آئے اس پر نہ صرف اظہار تحسین و آفریں فرمائیے بلکہ اس میں مزید اضافوں کے لئے اپنے قیمتی مشورے دیجئے۔

۲۔ کالج کے ممبروں کو اپنی تقاریر سنائیے [illegible] اور ان سے ایسے مباحثات کا سلسلہ شروع کیجئے جو باعث دلچسپی بھی ہوں اور مفید بھی۔ ہمارے لئے مقرروں کو بلانا اس وقت ایک حد تک ناممکن ہے اور پرانوں کو دہرانے میں کوئی خاص کشش باقی نہیں رہ جاتی۔

۳۔ آپ ہمارے کتاب خانہ کو استعمال کیجئے۔ ہمارے پاس اردو اور انگریزی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ ہے جن میں آپ کو ایسی

کتابیں بھی ملیں گی جو مخصوص موضوعات پر
لکھی گئی ہیں۔ اور جو رامپور میں آپ کو
کہیں اور دستیاب نہ ہوسکیں گی۔ بعض
انگریزی کتب ایسی بھی ہیں جو حالات حاضرہ پر
لکھی گئی ہیں جن سے آپ کو یہ معلوم ہوگا
کہ دوسرے ممالک نے انسانی زندگی کو
بلند کرنے میں کیا کیا طریقے اختیار کئے
آپ کم از کم ایک مرتبہ کتب خانہ کا مشاہدہ
فرمائیے۔ آپ یقین کیجئے کہ آپ کی دلچسپی کے
مطابق کوئی نہ کوئی چیز ضرور مل جائیگی۔
آپ کی اطلاع کے لئے کتابوں کی
ایک مختصر فہرست بھی درج کی جاتی ہے۔
اس مراسلہ کے جواب میں کیا میں یہ امید
کروں کہ آپ بہ خلوص نیت اپنی امداد
اور اپنی مخصوص توجہ کا وعدہ فرمائیں گے
اگر کالج کے متعلق آپ کو کسی مزید اطلاع
کی ضرورت ہو تو امتیاز علی صاحب عرشی کو
رجوع فرمائیے۔ وہ کالج کے ناظم ہیں یہ
تمام کام اُن کے ذمہ ہیں وہ کالج کے
سلسلہ میں آپ کی ہر طرح مدد کریں گے۔
میں معافی چاہتا ہوں کہ اس طویل
تحریر نے آپ کا قیمتی وقت لیا لیکن کیا
یہ وقت ایک مفید کام میں صرف نہیں ہوا

آپکا مخلص

افسانے وناول وغیرہ

نئے زاویے	کرشن چندر
پردۂ مجاز	پریم چند
واردات	"
چالیس کروڑ بھکاری	ابراہیم جلیس
دانہ و دام	بیدی
کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی
بگولے	احمد ندیم قاسمی
سرکش روحیں	خلیل
چاندی کے تار	مہندر ناتھ
قفس	اشک
زہرہ و مینا	
آنچل	احمد ندیم قاسمی
بھرے بازار میں	حیات اللہ انصاری
میلہ گھومنی	علی عباس حسینی
ہماری گلی	احمد علی
قید خانہ	"

مترجم

تائیس	فرانس
نجم السحر	فلابیر
سلامبو	"
دوشیزہ (ڈرامہ)	برنارڈ شا
معمار اعظم	السن
فاؤسٹ	گوئٹے
گورکی آپ بیتی	اختر رائے پوری

طنز و مزاح

سنگ و خشت — کنہیا لال کپور
شیشہ و تیشہ
مضامین فرحت — فرحت اللہ بیگ
مضامین پطرس — پطرس بخاری

ڈرامے

انارکلی — تاج
کیمیا گر
کھیتی
نیم شب۔ انجام وغیرہ

نظم

کلام اقبال۔ بانگ درا۔ ضرب کلیم۔ ارمغان حجاز
" جوش۔ عرش و فرش۔ شعلہ و شبنم
" حفیظ۔ شاہنامۂ اسلام
" فانی عرفانیات و وجدانیت
" راشد ماورا
" فراق روح کائنات۔ شعلۂ ساز۔
" مجاز شب تاب
" اختر انصاری۔ روح عصر
" فیض نقش فریادی
" ریاض میخانۂ ریاض
" احسان شیرازہ۔ چراغاں وغیرہ
انتخاب کلام۔ غالب۔ سودا۔ میر۔ جوہر۔ حالی
حسرت۔ شبلی
مرقع چغتائی۔

ادب

ملفوظات اقبال — نظامی
روحِ اقبال — ڈاکٹر یوسف
اقبال — اردو اقبال نمبر
انتقادیات — نیاز فتحپوری
آثارِ غالب — اکرام
اردو کی عشقیہ شاعری — فراق
مضامین فلک پیما
انتخاب مخزن
مقالاتِ حالی

سوانح

گنج ہائے گرانمایہ — رشید احمد صدیقی
جناح
اصغر گونڈوی
حسرت موہانی
مولانا عبید اللہ سندھی
شبلی
نہرو
ٹیپو سلطان

سنگ و خشت

تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبولیت

محکمۂ تعلیم ریاست رام پور کا آرگن چندہ سالانہ پانچ روپے فی پرچہ آٹھ آنے مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی کی ادارت میں رام پور سے نکلتا ہے ہمارے پیش نظر اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کا پرچہ ہے مضامین کی ترتیب اور ان کا انتخاب قابل قدر ہے۔ سب سے بہتر اور سب سے قیمتی مضمون جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم اسٹیٹ لائبریری کا ہے جس میں حضرت برہان الدین زرنوجی رحمۃ اللہ علیہ کے مرتب کردہ نظام تعلیم پر سیرحاصل بحث کی ہے۔

نئی روشنی کے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نئی تعلیم کی تدوین عصر حاضر کی خصوصیت ہے اس مضمون میں دیکھیں گے کہ اس کی بنیاد بھی مسلمانوں نے ہی رکھی مضمون نگار صاحب کے یہ الفاظ بالکل حقیقت پر مبنی ہیں۔

> "مسلمانوں نے علم کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اسے خداوندی فریضہ جانا اور مقدس امانت کی طرح صرف محفوظ کر کے نہیں۔ اس میں عظیم الشان اضافہ کر کے آنے والی نسلوں کے آگے پیش کر دیا۔ کوئی علم کسی طرح کی صنعت ہو اس کی تاریخ میں سے اسلامی عہد کا حذف بام علم کی اہم سیڑھی توڑ دیتا ہے۔"

اگر ماہنامۂ تعلیم جدید میں اسی طرح علوم اسلامیہ کے متعلق تحقیقی مقالے شائع ہوتے رہے تو یہ رسالہ محض ماہرین تعلیم کے لئے ہی نہیں بلکہ عام تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی محبوب و مقبول ہوگا۔

روزنامۂ منشور دہلی۔ ۵ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء

احتشام صاحب ماہلی کی تائید

تعلیم جدید کے دو رسالے موصول ہوئے صوری و معنوی دونوں حیثیتیں جاذب توجہ ہیں۔ آثار بتاتے ہیں کہ اگر رسالہ اس وضع و اصول پر طبع ہوتا رہا تو ہر علم دوست اور خصوصیت سے معلمین کا محبوب اور پسندیدہ رسالہ ہوگا۔ بلکہ ہر تعلیمی ادارہ اس رسالہ کا ضرور خریدار ہو جائے گا۔

دنیائے تعلیم و تعلم کے جدید نظریات کو حسن ادبیت و لطافت بیان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ از حد دلچسپ و دل پذیر ہے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب و شیخ الجامعہ کے مضامین کا کیا کہنا یہ روح تعلیم جدید کا درجہ رکھتے ہیں۔

سر عبدالقادر صاحب کا مضمون بھی اپنے اندر ایک کشش اور ندرت رکھتا ہے یہ تو ابتدائی دور کا حال ہے۔ جو آئندہ کی توقعات کی عظمت و حسن قبول کا آئینہ دار ہے۔ مجھے تو دل سے پسند آیا۔ کیا باعتبار ترتیب و تدوین اور کیا اندازِ افادیت و خوبیِ مضامین سے

زِ فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

محبی احتشام صاحب ماہلی کا مطالبہ اپنی جگہ پر قابلِ توجہ و پذیرائی ہے۔ غالباً اسی ضرورت پر نظر کر کے آپنے "ہمارا مدرسہ" کا اجرا کیا۔ یہ پرچہ بھی بڑی خوبیوں کا حامل ہے البتہ اسلامی نقطۂ نظر سے موسیقی کی تعلیم سے مجھے اختلاف ہے۔

خدا آپ کی کوششوں کو بار آور کرے اور پرچوں کو استقلال کرامت فرمائے۔

ریاست رام پور کا یہ اقدام مستحقِ ستائش ہی نہیں بلکہ اور ریاستوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

راقم (صاحب) ردولوی
۲۰ فروری ۱۹۴۷ء

والدین کے اعتراضات کا ایک جواب

نیویارک کی چائلڈ اسٹڈی ایسوسی ایشن کا ایک مباحثہ

سوال جس مدرسے میں میرے بچے تعلیم پاتے ہیں وہ بالکل نئے قسم کا ہے۔ مدرسۂ مذکور میں بچوں کی عام آزادی پر اکثر والدین کو اعتراض ہے۔ وہ بچے جو ایسی درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں جہاں قدیم طریقہ پر درس و تدریس رائج ہے ہمارے بچوں سے کتابی مطالعہ کے سلسلہ میں کہیں زیادہ آگے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ پرانا طریقۂ تعلیم زیادہ دیرپا اور مؤثر ہے۔

جواب اگر درس و تدریس میں کوئی خامی یا کمی ہے اور اس کمی یا خامی کا نام "تعلیم جدید" ہے۔ تو والدین کا اعتراض حق بجانب ہے اور ایسی تعلیم گاہوں کی طرف شہری رہنماؤں کو فوراً توجہ کرنا چاہیئے۔ اگر وہ مدرسہ جہاں آپ کے بچے جا رہے ہیں اس خامی کا حامل ہے تو یہ یاد رکھئے کہ وہاں کے اساتذہ فن تعلیم سے بے بہرہ اور افسر مدرس انتظامی مسائل سے ناواقف ہیں۔ اپنے اعتراض سے پہلے ذرا غور فرمائیے کہ آپ کے مدرسہ کی مجلس منتظمہ کتنی دلچسپی لے رہی ہے۔ اور مدرسہ پر کس قدر رقم خرچ کی جا رہی ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ مہتمم مدرس جدید تعلیم کے فلسفہ سے کہاں تک واقف ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک اس کے علاوہ کوئی اور خامی ہے تو آپکا فریضہ ہے کہ آپ خود زحمت گوارہ فرما کر ادارۂ مذکور کا معائنہ کیجیئے اور ارباب حل وعقد کو اپنی تجاویز سے مطلع فرمائیے۔

فی زمانہ اکثر جدید تعلیمی ادارے اپنی تحقیقات کی بنا پر اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ جماعتوں میں آزادی۔ بچوں کی دلچسپیوں کے مطابق مخصوص مضامین کا اجرا اور ان پر عملی کام۔ انفرادی توجہ وغیرہ ایسے طریقہائے تعلیم ہیں جو نتیجہ خیز ثابت ہو رہے ہیں جہاں بچوں کو مسائل پر خود سوچنا اور غور کرنا بتایا جاتا ہے۔ وہاں دیکھا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر طلب معاملہ فہمی کے ماہر بن کر نکلتے ہیں ان میں ہر کام کے ابتدا کرنے کی قوت ہوتی ہے اور ہر فعل انکا خود اعتمادی پر مبنی ہوتا ہے لیکن ان تمام امور کے یہ معنی ہیں کہ لکھنا پڑھنا اور علم ہندسہ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر آپ سے ہو سکے تو تین سال کی عمر سے لیکر ۶ سال کی عمر تک اپنے بچے کو ایسے ہی ادارہ میں تعلیم دیجائے۔ جہاں نفسیاتی اصولوں کی پابندی ہوتی ہے جو معصوموں کو ان کے میلان طبع کے مطابق ہنس کھیل کر زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں سے واقف کراتے ہیں جو فطرت کی جانب سے ودیعت کئے ہوئے ان تمام قوی ذہنی و جسمانی کو اپنی صحیح رہنمائی میں ابھارتے ہیں جن سے بچے آگے بڑھ کر بڑے اور مشکل مسئلوں کو بآسانی سر کر سکتے۔ اگر آپ کو اس قسم کی جدید تعلیم گوارا نہیں تو پھر تعلیم کو قومی اہمیت دیکر تھوڑی قربانی کیجئے۔ دو چار مہینے اپنے بچوں کے ہمراہ مدرسہ جائیے وہاں کے اساتذہ سے اپنا مقصد بتائیے۔ ان کی سنئے اور ایسی راہیں نکالیئے جن سے تعلیم بار آور ہو سکے محض اعتراضات اور ادارں سے تصادم بے کار ہے۔

تعلیم جدید

مدیر
مرزا سجاد علیخاں اختر بی اے بی ٹی (علیگ)

جلد ۲ | اکتوبر ۱۹۴۷ عیسوی | نمبر ۴

فہرست مضامین

مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی علیگ نے مفید عام [illegible]

استادوں خطاب

ہماری ذمہ داریاں اور فرض کی ادائیگی

فخر ملک جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے اجلاس سالانہ تعلیم بالغان مدراس میں جو صدارتی تقریر فرمائی تھی اس کے اردو ترجمے کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں (ادارہ)

مجھے اس کا احساس ہے کہ میں نے آپکا بیش قیمت وقت زمانہ کے رجحانات کی وضاحت میں صرف کر دیا۔ گو اس طرح ہم کو پس منظر کا اندازہ ہو گیا اور تعلیمی مسئلے کے مقاصد بھی واضح ہو گئے۔ آپ لوگوں کی یاد دہانی کے لئے مجھے آپ سے دوبارہ کہنا ہے کہ جو کچھ میں آپسے کہہ رہا ہوں اس نے ابھی عملی جامہ نہیں اختیار کیا ہے۔ ہمارے اُن افراد کی جن کے دماغ تازہ ترین معلومات سے مالامال اور جن کی ذہنیتیں بیدار ہیں یہ خواہش ہے کہ تمام مفید تعلیمی منقولات کو معقولات میں تبدیل کیا جائے اور اس سلسلہ میں ہر کہی ہوئی بات جامۂ عمل سے مزین کی جائے اُن کی اس خواہش کی جھلک صرف چند تعلیمی مرکزوں میں نظر آتی ہے مثلاً دہلی کا جامعہ ملیہ جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی وسیع النظری اور شفیق الرحمن کے جوش عمل اور تنظیمی قابلیت کا فخر حاصل ہے دوسرا بولپور کا شانتی نکیتن جو وہاں کی خاموش فضا اور ادبی ماحول کا آئینہ دار ہے اور جس نے ہندوستان میں شاید پہلی بار علمی سرگرمیوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ تیسرا آل انڈیا جماعت تعلیم بالغان جو جیت سنگھ صاحب کی قیادت میں مشکل سے مشکل دور آنے پر بھی تعلیمی معاملات میں حق گوئی اور راست خیالی کی علمبردار رہی ہے۔ یہ وہ چند ادارے ہیں جن میں ترقی پسند تعلیمی کارروائیاں عمل میں لائی گئی ہیں۔

جہاں تک تعلیم بالغان کا تعلق ہے ملک کے بعض صوبوں اور ریاستوں میں اور بالخصوص صوبہ مدراس میں خاصا کام کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہمارے چند فرائض کی انجام دہی باقی رہتی ہے ہماری خامیوں میں سے پہلی تلخ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے صحیح اور موثر مسائل میں شاید ہی کوئی ٹھوس کام انجام دیا گیا ہو۔ اگر کوئی شخص لوگوں کے تعلیمی معیار کو دنیا کے نقشہ پر ظاہر کرنا چاہے اور غیر تعلیم یافتہ ملکوں کو سیاہ رنگ سے دکھائے تو ہمیں شرم کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ ہمارا ملک ہندوستان ایک تاریک

براعظم ہے۔ حالات کی یہ نوعیت مجھے غیرت دلاتی ہے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ ملک جس کی پرانی تہذیب دنیا میں ایک زمانہ اپنی اہمیت رکھتی ہو وہ آج کیسی زبوں حالی میں ہے۔ یہ امر باعث شرمندگی ہے کہ ہم اتنے طویل عرصے میں بھی ملک کی شہرت و عظمت سے "جہالت" کے نمایاں دھبے دور نہ کر سکے آج جو کچھ کام کیا جا رہا ہے اس میں تنظیم اور اشتراک عمل کی کمی ہے اور نہ یہ کام کسی مجوزہ اسکیم کے تحت انجام دیا جا رہا ہے اور نہ اس میں وہ فراخ نظری اور جوش عمل ہے جس کا وجود تعلیم بالغاں میں ضروری ہے۔

آپ ان تنگ و تاریک کمروں میں اور اسکولوں کی ان گندی عمارتوں پر جو سایہ دار چھپروں سے بے نیاز ہیں جن میں نہ نشستیں ہوتی ہیں نہ روشنی۔ نہ کتابوں کا ذخیرہ ہے نہ نقشے لٹکتے جہاں سماجی اور تفریحی مشاغل میں صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی۔ کیا ایسی جگہوں پر آپ قوم کے نوجوانوں کی حاضر باشی کی توقع کر سکتے ہیں اور ان کی تعلیمی سرگرمیاں مؤثر بنا سکتے ہیں جو تصنع سے عاری اسکول کی سادگی پسند، زندگی اور فطرت کی آغوش میں سایہ دار درختوں کے نیچے دی جانے والی تعلیم کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن پھر بھی اپنی اپنی جگہ یہ اہم ہوا کرتی ہے۔ تصنع کو میں تعلیم میں مفید نہیں خیال کرتا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تعلیمی درسگاہیں عالی شان اور پُر تکلف مکانات ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تعلیمی مراکز کا صاف ستھرا اور فن کارانہ حسن سے مزین ہونا ضروری ہے تاکہ نوجوان بحث و مباحثہ درس و تدریس دوستوں سے ملاقات اپنی دلچسپی کے مشغلوں میں مشق کرنے کے لئے خود کھنچ آئیں۔

اقتصادی موزونیت

لیکن کیا ہماری یہ اولوالعزمیاں محض خیالی معلوم ہوتی ہیں؟ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا غریب ملک تعلیمی آسائشیں اس پیمانہ پر مہیا نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دنیا میں صرف ایک قسم کا افلاس ہے جو دور نہیں کیا جا سکتا اور وہ ہماری ہمت کی پستی ہے۔ اس کے علاوہ ہم تمام دوسری قسم کی بے مائیگی کو دور کر سکتے ہیں یہ ایک فرسودہ قول ہے لیکن پھر بھی اس کو یہاں دہرانے کی ضرورت ہے کہ جب اس غریب ملک نے کروڑوں روپیہ گذشتہ جنگ عالم میں خرچ کر ڈالے تو کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں کے لئے تعلیم پر جو انسانیت اور امن عامہ کی حامی ہے افراط سے پیسہ خرچ کرنے میں دریغ کرے۔ مجھے یقین ہے کہ سرمایہ دار یا ماہر مالیات ایک تنگ نظریہ سے قومی تشکیل و تعمیر کے مسئلوں میں یہ کہنا غلط سمجھے گا کہ ہمیں کروڑوں روپیہ خرچ کرنا ہے اور تعلیم بالغاں جو کہ بادی النظر میں ایک فضول سی چیز ہے اور جس میں کافی دولت خرچ ہو گی اس کے لئے کافی روپیہ خرچ کرنا ایک ناقابل عمل مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں صحیح مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دولت کے بل پر ہم کوئی تعلیمی نظام اور اس کے متعلق کوئی صحت بخش پالیسی ملک میں قائم رکھ سکتے ہیں اور قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا ملک بغیر انسانی برکتوں کے رہ بھی سکتا ہے یا نہیں

جاتے کہ کوئی ملک یہ گوارہ نہیں کر سکتا کہ وہ تعلیم و تہذیب میں دوسروں کا محتاج ہو تو حکومت محکمۂ مالیات اور قومی اقتصادیات کے ماہروں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کہیں سے بھی رقم فراہم کریں اور تعلیمی سکیموں کو روبکار لائیں۔ اگر اس فراہمی کے سلسلہ میں زراعت میں تجدید و اصلاح صنعت و حرفت میں ترقی یا دولت کی مازی تقسیم کے لئے دوسرے ذریعوں کی ضرورت ہو تو شیدایان تعلیم کو ان تجویزوں کے سب سے پہلے کر پیش پیش جانا چاہیئے تاکہ مالی ضروریات کی تنگی دور ہو سکے اور رقم کی قلت کے باعث قوم کی ضروری اور اہم تجویزیں ملتوی نہ ہو سکیں۔ میرے خیال میں اس ہندوستانی مقولہ میں بہت کچھ حقیقت پنہاں ہے کہ "روپیہ ہاتھ کا میل ہے" اس قول کی روشنی میں ہمیں روپے کی کمیابی کی بنا پر اپنے تمام فیصلے صادر نہ کرنا چاہیئے۔

دوسرے ملکوں کے تعلیمی عملی کارناموں کے متعلق جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کوئی خیالی یا جنت پسندانہ یا بے بنیاد باتیں نہیں جو دوسری جگہ ناقابل عمل ٹھہرائی جائیں گی۔ آپ لوگوں کو ممالک غیر کے حالات سننے سے دلچسپی ہوگی جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس دائرۂ عمل میں ان سب نے کیا کیا کر لیا۔ اور کیا کیا کرنے کی کوشش ہے۔

ممالک غیر میں تعلیم

امریکہ اور سوویٹ روس یہ دونوں ملک اقتصادی نقطۂ نظر سے بالکل مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ سوویٹ روس کی تعلیمی قدر و قیمت یہ کتنی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں کلب جماعتوں میں موسیقی اور ڈراما مجلس مباحثہ میں لوگوں کے تہذیبی معیار بلند کرنے کی کوشش وغیرہ۔

ڈنمارک کے "عوام کے کالج" کو ہر حیثیت سے شہرت عامہ حاصل ہے ادارۂ مذکور نے تہذیب کو روئے سائے ملک کے شاندار میناروں اور گنبدوں سے نکال کر ان عوام میں رائج کر دیا ہے جو کھیتوں، کارخانوں اور ملوں میں کام کرتے ہیں یہاں کے ایک انسپکٹر کا قول ہے کہ سب سے اہم چیز وہ روشن دماغی نہیں جو ان اداروں میں حاصل کی جائے بلکہ اعلیٰ اور بلند جذباتی بیداری ہے۔ ممکن ہے کہ بڑی حد تک وہ درس و تدریس کے کام میں پیچھے ہوں لیکن یہ امر مسلم ہے کہ ان سے دلچسپی رکھنے والے افراد کو آزادیٔ فکر اور آزادیٔ نظر ضرور حاصل ہے۔ وہ اپنی طاقتوں کا صحیح استعمال جانتے ہیں اور کارآمد باتوں کے لئے ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔

برطانیہ انسانی جنگ کے تاریخی خطرناک مرحلوں سے ابھی ابھی ہو کر گذرا ہے جس میں اسکو سخت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور اس سلسلہ میں اس کی اقتصادی کیفیت کو جو صدمۂ عظیم پہنچا وہ بھی ظاہر ہے۔ مگر وہ تعلیمی جد و جہد میں کسی وقت بھی ہمت نہیں ہارا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۱۹۴۴ء میں جب کہ جنگ اپنے بھرپور شباب پر تھی اور برطانیہ کی ظاہری شکستیں اپنی بھیانک تصویر پیش کر رہی تھیں اس نے ایک تعلیمی ایکٹ پاس کیا جس کے بجٹ میں اس نے ایک کروڑ پونڈ کا اضافہ کر دیا۔ انگلستان کے تعلیم بالغان میں بھی ایک وسیع اور وافر نظام قائم ہو گیا ہے وہاں کے شہریوں

کے لئے تمام نغمنوں اور حجرکتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں کے عوام ... قابل صد رشک ہیں جہاں پندرہ سولہ سال سے زائد عمر کے تمام نوجوانوں کو ہفتہ میں دو یا تین ... دن کے نصف حصہ میں حاضر ہونا پڑتا ہے اور وہاں ان میں پورے پورے دن ان کے لئے ... اُن کو جسمانی ورزشیں۔ دیگر عملی کام۔ اور پیشہ ورانہ تعلیم کی تلقین کرتے ہیں تاکہ ان کی نظری صلاحیتیں بیدار ہوں اور وہ موجودہ ذہنیت کی صحیح ذمہ داریوں کے لئے تیار ہو جائیں۔

مقامی تعلیمی اداروں سے استدعا

تعلیم جدید آپ کی تعلیمی جدوجہد کا پیامی ہے۔ اس لیے ہم مقامی اطلاعات کے سلسلہ میں آپ کا دست نگر، میں نے اکثر و بیشتر آپ سے تحریری و زبانی درخواستیں کی ہیں کہ آپ اپنی تعلیمی سرگرمیاں نئے تجربات اور مفید تعلیمی عملیات جن پر آپ کام کر رہے ہوں۔ تعلیم جدید میں شائع کیجئے تاکہ آپ کے ہم پیشہ بھائی اس سے فیضیاب ہوں اور آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ یہ صدا بے اثر ہو کر رہی۔

میں آپ کو اس استدعا کی جانب متوجہ کرتے ہوئے۔ آپ سے ملتجی ہوں کہ تعلیمی کارناموں کی اشاعت میں تعلیم جدید کے کو معین ہو جئے۔

"مدیر"

تعلیمی مضامین

ایک سبق آموز تعلیمی تجربہ

جوں جوں تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے۔ یہ خیال زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے کہ تعلیمی نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ طالب علم کچھ ایسے کام کریں جن کے ذریعے وہ اپنی پڑھائی کا خرچ خود نکال لیں۔ اس کے علاوہ یہ زمانہ مشین کا زمانہ ہے اور اس مشینی زمانے کا تقاضا ہے کہ ہماری تعلیم قوم کے ہر فرد کو یہ سکھائے کہ وہ خود اپنا کفیل ہو، اپنے متعلقین کا بار خود برداشت کرے، وہ جو کچھ کرے سمجھ کر کرے اور اس میں پوری دلچسپی سے اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کے کام پر صرف اسی کی بہبودی کا انحصار نہیں بلکہ پوری جماعت کی بہبودی اس پر منحصر ہے بمختصر یہ کہ اس کا علم زندگی کی حقیقتوں سے جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اس مشینی دنیا میں ترقی کر سکے گا۔

اسی خیال کے ماتحت ہمارے ملک میں بنیادی قومی تعلیم کی تحریک نے جنم لیا۔ اس کے بانیوں کے سامنے معلوم ہوتا ہے کہ دو خیال خاص طور پر تھے۔ ایک تو یہ کہ تعلیم میں اس نفسیاتی اصول [illegible] رہے کہ بچوں کی تربیت ان ذرائع سے ہو جنھیں ان کی طبیعت سے خاص مناسبت ہوتی ہے یعنی ۷، ۱۴ سال تک لڑکے لڑکیوں کو ہاتھ کے کام کے ذریعے ذہنی نشو و نما کا موقع دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قومی تعلیم کے لیے جو مدارس قائم ہوں انھیں اپنا کام کرنے کے لیے جن مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے ان کے واسطے اہلِ ثروت کا دروازہ کھٹکھٹانے اور حکومتِ وقت کی امداد حاصل کرنے کی کم سے کم ضرورت پیش آئے اس لیے کہ بیرونی امداد جتنی زیادہ حاصل کی جائے گی اتنا ہی تعلیمی کام کو اپنے سرپرستوں کی خواہش کے مطابق لانا پڑے گا بلکہ تعلیم کو حتی الوسع خود کفیل بنایا جائے۔ چنانچہ بنیادی قومی تعلیم نے اپنے نصاب میں اس بات پر زور زیادہ دیا ہے کہ مدارس میں دستکاری کو

زیادہ رواج دیا جائے اور تعلیم کو ہاتھ کے کام کے ساتھ اس طرح مربوط کیا جائے کہ اس کی تعلیمی قدر کا کام یعنی طالب علم کی سیرت کی تربیت اور دماغ کی بہتر نشو و نما اور تشکیل کا کام بھی انجام پائے اور طالب علم جو کچھ سیکھیں اس کی بنیاد ان کا تجربہ ہو اور ہاتھ اور دماغ کے میل سے طالب علم کی زندگی اور اس کی تعلیم میں وہ حقیقی رشتہ باقی رہے جو اس کی تخلیقی قوتوں کو تقویت بخشتا ہے۔

بنیادی قومی تعلیم کی یہ تحریک اس وقت صرف ابتدائی مدارس تک محدود ہے۔ لیکن ہمارے اعلیٰ تعلیم کے مدارس کے لئے جن میں ایک طرف عمل اور تعلیم کا رشتہ یکسر مفقود ہوتا ہے اور جہاں تمام تعلیمی قدریں لفظوں اور کتابوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور دوسری طرف اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ قومی آمدنی پر بار معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ابھی تک اس قسم کی کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ "خود کفالتی" تعلیم کی ضرورت بہ نسبت ابتدائی مدارس کے ہمارے اعلیٰ تعلیم کے مدارس کے لئے زیادہ ضروری ہے اس لئے کہ ہمارے نوجوان جو قومی دولت آفرینی کے کاموں میں معاون بن کر اپنی معاشی حالت کو زیادہ سدھار سکتے ہیں، عرصے تک قومی اور انفرادی آمدنی پر بار بنے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایک بہت بڑا طبقہ ہمارے نوجوانوں کا ایسا ہوتا ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ مفید معاشی مشاغل میں مصروف تو ہو جاتے ہیں مگر بے دلی سے، کیونکہ ان میں سے بیشتر اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ وہ کسی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا کام نہ تو قومی دولت میں کوئی خاص اضافہ کرتا ہے اور نہ وہ ہمارے سماج کے مفید رکن بنتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جو نوجوان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے وہ یونیورسٹی کے اخراجات کا بار برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنی خداداد قابلیت کے فائدے سے خود بھی محروم رہتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی محروم رکھتے ہیں۔

حصول تعلیم کے راستے کی یہ دشواریاں کم و بیش تمام ملکوں میں موجود ہیں اور ان پر قابو پانے کی راہیں بھی ہر جگہ سوچی جا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کامیاب کوشش ریاستہائے متحدہ میں میڈیسن کالج کی ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر سدرلینڈ جو میڈیسن کالج کے بانی ہیں اور ان کے چار ساتھیوں نے مل کر ایک درسگاہ قائم کی اور اس کا بنیادی اصول یہ قرار دیا کہ اس درسگاہ میں وہ طالب علم داخل ہو سکتے ہیں جو اپنی تعلیم اور اپنے کھانے پینے اور اپنی دوسری ضروریات کے تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی کام کریں۔

درسگاہ کے اخراجات چلانے کے لئے ڈاکٹر سدرلینڈ نے کالج کے ساتھ سب سے پہلے ایک سینی ٹوریم قائم کیا لیکن سینی ٹوریم بغیر ڈاکٹر کے نہیں چل سکتا تھا اس لئے انہوں نے خود ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اور ۴ سال کا کورس پورا کر کے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سینی ٹوریم کالج کا سب سے اہم شعبہ ہے۔ اس وقت اس میں مریضوں کو رکھنے کے لئے ۱۰۰ کمرے ہیں اور ان میں سے ہر کمرہ مریضوں اور ان کے علاج کے جدید ترین سامان سے درست ہے۔

اس میں جو مریض داخل ہوتے ہیں انھیں اپنے علاج کے لئے ۲۵ ڈالر سے ۳۵ ڈالر تک ہفتہ وار ادا کرنے پڑتے ہیں لیکن اگر کوئی ایسا مریض آجائے جو اپنے علاج کا خرچ نہ برداشت کرسکتا ہو تو اس کو بھی داخل کر لیا جاتا ہے۔ اس سینی ٹوریم کا تمام کام طالب علم انجام دیتے ہیں اور اس طرح وہ عملی کام کے ذریعے اپنی تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں۔

ہر سال اس سینی ٹوریم کے ۲۵، ۳۰ طالب علم نرسنگ کا صداقت نامہ حاصل کرتے ہیں، ملک کے بہترین اسپتالوں میں رکھ لئے جاتے ہیں۔ غرض جنوبی امریکہ میں سینی ٹوریم اور اس کے کامیاب عہدیدار بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

سینی ٹوریم کی طرح اس درس گاہ کے فارم بھی معاشی اعتبار سے کالج کے لئے بہت اہم ہیں۔ ۶۰ ایکڑ زمین میں اُن کے باغات ہیں۔ ۷۰ ایکڑ زمین پھل دار درختوں کے لئے مخصوص ہے دو پھلواریاں ہیں جن کے پھول شفاخانے کے کمروں کی زینت بنتے ہیں۔ طالب علموں اور مریضوں کے کھانے کے لئے اتنی ترکاریاں محفوظ کرلی جاتی ہیں کہ سال بھر کو کفایت کرتی ہیں۔

۵ سال کی تحقیق کے بعد انھوں نے کھانے پینے کی چیزوں میں بھی نئے اضافے کئے ہیں مثلاً سویابین سے انھوں نے ایسی غذا تیار کی ہے جو امریکہ میں بہت مقبول ہے درس گاہ کے کیمیا دانوں نے سویابین کی دو سو قسموں پر تجربہ کیا ہے اور اس کے نامرغوب حصے کو خارج کر کے اس سے ناشتے کی بہت سی چیزیں تیار کی ہیں، دہی، جما ہوا دودھ اور ایسی چیزیں تیار کی ہیں جو کافی اور گوشت کی قائم مقامی کرتی ہیں۔ گوشت کا بدل ذائقہ اور شکل کے اعتبار سے بالکل گوشت معلوم ہوتا ہے لیکن گوشت سے زیادہ زود ہضم ہوتا ہے اور غذائیت بھی اس میں زیادہ ہوتی ہے اسی طرح میڈیسن کے اس غذائی محکمے نے سویابین سے جو دودھ تیار کیا ہے وہ گائے کے دودھ سے نہ صرف سستا ہوتا ہے بلکہ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے بیان کے مطابق دودھ پیتے بچوں کے لئے زیادہ مفید ہے۔ میڈیسن کی اس صنعت کو لوگ افریقہ اور ہندستان سے دیکھنے کے لئے آتے ہیں گذشتہ سال امریکہ کی ۲۷ ریاستوں میں اس کالج کی تیار کی ہوئی کھانے کی چیزیں ۶۰ ہزار ڈالر کی فروخت ہوئی تھیں۔

کالج کی تیسری اہم صنعت جھاڑوؤں کا کارخانہ ہے جو ۶۰ درجن جھاڑو روزانہ تیار کرتا ہے۔ اس فیکٹری کی بنائی ہوئی چیزیں مقابلتاً زیادہ قیمت پر فروخت ہوتی ہیں ان صنعتوں کے علاوہ ان کے یہاں فرشی دریاں بنانے، فوٹوگرافی، موٹروں کی مرمت کا کام بھی ہو ان کا اپنا پریس ہے۔ بجلی پیدا کرنے کا کارخانہ بھی اپنا ہے۔

میڈیسن کالج کے نصاب میں ۲۷ دستکاریاں رکھی گئی ہیں اور یہ سب کی سب کالج ... طالب علم خود چلاتے ہیں۔ ہر طالب علم کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم کا کم از کم آدھا خرچ اپنی محنت اجرت سے نکالے۔ ۴ سال کے پورے کورس کے لئے ہر طالب علم کو داخلے کے وقت صرف ۳۵ ڈالر جمع کرانے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد پھر تمام تعلیمی مدت میں اسے کسی مزید امداد کی ضرورت نہیں

پڑتی اور جب وہ کالج سے نکلتا ہے تو اس کے ہاتھ میں کئی ہنر ہوتے ہیں جن سے وہ اپنی معاش حاصل کرسکتا ہے۔

طلباء کو روزانہ ۵ گھنٹے پڑھنا اور ۵ گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کی اُجرت ان کی تعلیم اور رہنے سہنے کے اخراجات کے حساب میں ۴۰ سینٹ فی گھنٹہ کی شرح سے جمع کرلی جاتی ہے۔ ضروریات کی تقریباً یہ سب چیزیں درسگاہ کی مصنوعات سے مل جاتی ہیں مگر کالج ان چیزوں کی قیمت طلباء سے نسبتاً کم وصول کرتا ہے۔ کالج کے تقاضے کے مطابق ہر طالب علم کو سال بھر میں اتنا کام کرنا چاہیئے کہ اس کی اُجرت جمع ہو کر ۳۱۸ ڈالر ہوجائے۔ کالج طلباء سے جو مطالبہ وصول کرتا ہے اس میں بڑے بڑے اخراجات حسب ذیل ہوتے ہیں۔

فیس تعلیم	۲۷ ڈالر سے ۴۴ ڈالر تک
کرے کا کرایہ	۹۰ ڈالر
کھانے کا خرچ	۹۰ ڈالر

جو طالب علم اتنا کام نہیں کرسکتے کہ وہ ۳۱۸ ڈالر کی مطلوبہ اُجرت حاصل کرسکیں تو انہیں بقیہ رقم نقد ادا کرنی ہوتی ہے۔

کالج کے اس تمام کاروباری حصے سے ذاتی طور پر کوئی منافع نہیں کمایا جاتا۔ تمام آمدنی کالج کے چلانے اور اس میں مزید اصلاحات کرنے پر صرف کی جاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بغیر کسی خارجی امداد کے اس وقت کالج کی مملوکہ جائداد ۵ لاکھ ۲۷ ہزار ڈالر کی ہے جو کالج کی کمائی ہوئی آمدنی سے پیدا کی گئی ہے اور اس وقت اس میں امریکہ کی ۴۶ ریاستوں سے آئے ہوئے ۲۷۵ طالب علم تعلیم حاصل کررہے ہیں جن میں ۹ طلباء غیر ممالک کے بھی ہیں۔

اپنی عمارتوں کی تعمیر کا کام بھی کالج کے لڑکوں نے خود کیا ہے۔ کالج اور سیٹی ڈیم کی ۱۲۔ عمارتیں جو ۰۰ ۹ ایکڑ زمین گھیرے ہوئے ہیں اُن سب کا ڈیزائن طالب علموں ہی نے تیار کیا ہے اور خود انھوں نے ہی تعمیریں کی ہیں۔ کالج یہ کرسکتا تھا کہ اپنی مصنوعات کی آمدنی کو بڑھا کر عمارتوں کی تعمیر اور اُن کے رکھ رکھاؤ کے لئے باہر کے آدمیوں سے کام لیتا لیکن جو لڑکے تعمیر عمارت کا کورس لیتے ہیں ان کی عملی تربیت نہیں ہوسکتی تھی۔

پڑھائی کے لئے ایک کمرہ بنانے کیواسطے تقریباً ۲۰ طالب علم کام کرتے ہیں اور اُن کے

کام سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ مبتدی ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب کالج دیکھنے آئے۔ ایک طالب علم کمرے کا فرش تیار کر رہا تھا، انھوں نے اس سے پوچھا "اس کام میں تمہارا کتنا تجربہ ہے؟" لڑکے نے جواب دیا "اس جگہ سے کمرے کے دروازے تک"

طلباء کو اس بات کا پورا موقع ہے کہ وہ جو کام چاہیں اپنے لئے منتخب کرلیں وہ نہایت محنت اور تن دہی سے کام کرتے ہیں اور اس بات پر اُن کو فخر ہے کہ اپنی تعلیم اور اپنی ضروریات کے تمام اخراجات وہ اپنی محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے تعلیمی کام بھی نہایت شوق سے اور انہماک سے کرتے ہیں۔

اس کالج کے گریجویٹ زیادہ تر نرسنگ طبی امداد اور معیشت خانہ داری اور زراعت [illegible] کورس میں ڈگری حاصل کرتے ہیں۔ انہی طالب علموں کی مدد سے اس کالج نے جنوبی امریکہ [illegible] میں ۶ ابتدائی اسکول ۶ جونیر ہائی اسکول اور ۱۲ گرامر اسکول قائم کئے ہیں جن کا سارا انتظام [illegible] اصول پر ہے کہ اپنے مدرسہ کا خرچ خود برداشت کرنا چاہیئے ان میں سے ہر مدرسہ [illegible] ایک ایسی ٹیم ہے جو اپنے پاس پڑوس کی بستیوں کو طبی امداد پہونچاتا ہے

میڈیسن کے اس کالج میں داخلے کے لئے بہت درخواستیں آتی ہیں لیکن کالج صرف انہی طالب علموں کی درخواستیں منظور کرتا ہے جو اعلیٰ تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے [illegible] کبھی کسی دولتمند کے لڑکے کو اس کے والدین کے اصرار پر داخل کیا جاتا ہے تو اس کو بھی کالج کی فیکٹری، دستکار خانوں میں کام کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کالج کے دوسرے طلباء کو کبھی یہ [illegible] نہیں چلتا کہ ان کا کوئی ساتھی ایسا بھی ہے جو مالدار ہے اور اپنے خرچ کا خود کفیل ہو سکتا ہے

ملک میں میڈیسن کالج سے زیادہ پرانے اور بڑے بڑے کالج بھی ہیں جن میں تعلیم کے [illegible] بھی سکھائی جاتی ہے مگر یہ بات کسی نے پیش نہیں کی کہ "مدرسوں کو اپنا خرچ [illegible] کرنا چاہیئے اور چندوں کی امداد حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔"

میڈیسن کالج کی اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا خرچ خود برداشت کر سکنے [illegible] زیادہ آسانی سے رائج کی جاسکتی ہے۔ اگر ہمارے ارباب [illegible] ہمارے یہاں کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب کو بھی [illegible] تعلیم کے نقطۂ نظر کے ماتحت ترتیب دینے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں تو آئندہ ہماری آزادی [illegible] استحکام اور ہماری معاشی ترقی کے لئے یہ کام بہت مفید ہوگا۔

بشیر احمد انصاری

انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تدریس

لندن کے متعلق قاضی عبدالغفار اور ظفر علی خاں کی نثر اور نظم کے ان تاثرات کے ساتھ جو کئی زمانوں سے ذہن میں مبہم طور پر محفوظ تھے ۱۹۳۷ء میں اکتوبر کی تیسری تاریخ کو میں لندن کے ایک بڑے اسٹیشن وکٹوریہ پر گاڑی سے اترا۔ ایک دو ہندوستانی ہم سفر تھے انھوں نے اسٹیشن پر اتر کر اپنے گھر کی راہ لی میں نے ایک ٹیکسی کرایہ پر لی اور ٹیکسی والے کو وہ لفافہ دکھایا جس پر میرے ایک دوست کے اس دوست کا پتہ لکھا ہوا تھا جن کے پاس مستقل قیام کا انتظام ہونے سے قبل مجھے ٹھہرنا تھا۔ سنگین مکان ملگجی سیاہی سے لتھڑے ہوئے تھوڑی دور تک دھند میں لپٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کچھ بوندیں پڑ رہی تھیں در و دیوار پر غم انگیز وحشت برس رہی تھی میں اپنے ذہن کے کونوں سے قاضی صاحب اور مولوی صاحب کے بنائے ہوئے نقوش کرید کرید کر ان در و دیوار پر چسپاں کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ تو کہیں ٹھیک نہ بیٹھتے تھے۔ بالآخر مایوس ہو کر اس کوشش سے باز آگیا۔ پیرس سے آخر نصف شب کو روانہ ہوئے تھے خیال آیا کہ پیرس میں دن بھر بین الاقوامی نمائش دیکھتے رہے تھے اور چونکہ رات کو بھی آرام سے نہ سو سکے تھے اس لئے شاید نظر کی شگفتگی بروئے کار نہیں آئی۔ ورنہ لندن بہرصورت لندن ہے اور ویسا ہی ہوگا جیسے کہ مولوی صاحب اور قاضی صاحب نے دیکھا تھا۔ موٹر ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی ڈرائیور نے ایک ہاتھ سے تو موٹر کا دروازہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے میرا سامان نکال کر ایک مکان کے زینے پر رکھ دیا اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں اس نے مکان کی گھنٹی بجا دی۔ پھر مجھے سلام کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ "میرے دام دلوائیے"

اتنے میں ایک خادمہ باہر نکلی اور میں ٹیکسی والے کے دام چکا کر مکان کے اندر داخل ہوگیا علیک سلیک کے بعد میں نے صاحب خانہ سے اپنے لندن آنے کا مقصد بیان کیا اور ان کے مشورہ پر میں نے اسی وقت لندن یونیورسٹی کے اس پروفیسر کو ٹیلیفون کر دیا جن کے ساتھ مجھے آئندہ دو

سال کام کرنا تھا۔ لندن جانے سے پہلے میں ان پروفیسروں سے خط و کتابت کرچکا تھا جن کے سپرد میرے پی ایچ ڈی کے کام کی نگرانی ہوئی تھی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف سے انگریزی میں آواز آئی۔

"ڈاکٹر بیلی بول رہا ہے"

میں نے بھی انگریزی میں آداب عرض کیا اور اپنا نام بتایا۔

اب ٹیلیفون سے کچھ اس قسم کی آواز آئی جس سے میں مانوس تو معلوم ہوتا تھا لیکن الفاظ سے میں کچھ مفہوم معین نہ کرسکا کیونکہ یہ انگریزی کے الفاظ نہ تھے اور یہ الفاظ کچھ اتنی جلدی کہے گئے کہ میں ان کو سوچنے کے باوجود سمجھ نہ سکا۔ میں نے معذرت ظاہر کی اور پھر وہی الفاظ دہرائے گئے۔ اب کے مجھے معلوم ہوا کہ دوسری طرف سے ڈاکٹر بیلی پنجابی میں میری خیریت دریافت فرما رہے تھے۔ دل مانتا نہیں تھا لیکن کان تصدیق کر رہے تھے کہ لندن میں ایک انگریز سلیس اور خالص دیہاتی پنجابی ہو بہو پنجابیوں کی طرح بول رہا تھا۔

لندن میں مشرقی زبانوں سے متعلق یہ پہلا واقعہ تھا جو مجھے ہمیشہ یادگار رہے گا، بعد میں اسی طرح کے اور کئی واقعات یا حادثات سے دوچار ہونا پڑا جس سے یہ معلوم ہوا کہ سلطنت برطانیہ کے دل میں مشرقی زبانوں کا کس قدر چرچا ہے۔ ڈاکٹر بیلی لندن یونیورسٹی میں ہندوستانی اور یہاں کی زبانوں کے شعبے کے صدر تھے اور اردو کے استاد ہونے کی وجہ سے سرکار نظام کی طرف سے ساڑھے تین سو پونڈ سالانہ وظیفہ پاتے تھے۔ یہ وظیفہ حضور نظام کی طرف سے لندن یونیورسٹی کے اردو کے استاد کو اب بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر بیلی میرے کام کے اس حصے کے نگراں تھے جو اردو سے متعلق تھا۔ صرف انہی کی باتیں بیان کرنے لگوں تو شاید اس فرصت میں ختم نہ ہوں۔ اس لئے اپنے ایک اور استاد کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ آنجہانی سر ڈینین راس تھے۔ فارسی کے کام میں میں آپ سے مدد لیتا تھا۔ اور ان کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ آپ اس وقت لندن یونیورسٹی میں فارسی کے شعبہ کے صدر تھے۔ پہلے دن ملاقات ہوئی تو "بفرمائید" (تشریف رکھئے) سے گفتگو شروع ہوئی تو دو گھنٹے بے تکان فارسی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ایک دو جملے فارسی کے پنجابی ڈھنگ سے بولے اور پھر یا تو خاموش رہا اور یا انگریزی میں جواب دیتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے "آپ نے پنجاب سے فارسی کا ایم اے پاس کیا ہے آپ کا قصور نہیں" میں نے وضاحت

چاہیں تو بولے" آپ کے نصاب میں روزمرہ کی فارسی نہ داخل ہے اور نہ آپ کو فارسی بولنے کی مشق کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ علی گڈھ کے فارغ التحصیل طلبا کچھ فارسی بول لیتے ہیں کیونکہ وہاں بول چال ایم اے کے نصاب میں داخل ہے" میں اپنی نااہلیت سے اتنا خجل نہیں تھا۔ جتنا اس امر سے پریشان تھا کہ سر ڈینیس راس جو فارسی بولتے تھے اور جس لہجہ میں بولتے تھے اور جس لہجہ میں بولتے تھے وہ ہندوستان میں ہم نے کہیں نہیں سنی تھی۔ بعد میں ایرانی طالب علموں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ خالص ایرانی لہجہ اور طرز کلام تھا۔

یہ دو حادثات میں نے بالکل ضمناً بیان کئے ہیں جن سے آپ کو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ لندن میں مشرقی زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مشرقی زبانوں سے کس قسم کا قلبی لگاؤ ہے اور ان زبانوں میں ان لوگوں نے کس قدر استعداد بہم پہونچائی ہے۔ اب کچھ معلومات آپ کے سامنے رکھوں گا۔ انگلستان کی تینوں بڑی یونیورسٹیوں یعنی لندن، کیمبرج، آکسفورڈ میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریوں کے لئے مشرقی زبانوں کی تدریس اور امتحان کا انتظام ہے اور ان یونیورسٹیوں میں مختلف زبانوں کی تدریس کے لئے صرف یونیورسٹی کی ڈگریوں والے استاد مقرر نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا ایک کثیر حصہ اس ملک میں بسر کیا ہے جس ملک کی زبان وہ پڑھا رہے ہیں اور ان لوگوں کو زبان سے ایسی سرسری دلچسپی نہیں جیسی کہ ہمارے ملک کے بیشتر استادوں کو ہے۔ یعنی یہ لوگ صرف نصاب کو ختم کرنے کے لئے زبان سے دلچسپی نہیں لیتے بلکہ جس ملک کی زبان کی تدریس اُن کے سپرد ہے یہ اس ملک سے اپنا گہرا تعلق پیدا کرتے ہیں کہ اس ملک کے تازہ ترین سیاسی سماجی اور مذہبی حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ انگلستان میں مشرقی زبانوں کے استادوں کا آنجہانی سر ڈینیس راس، پروفیسر براؤن، پروفیسر نکلسن، ڈاکٹر بیلی، سر ریسی سائیکس، پروفیسر گب، ڈاکٹر ٹرنر اور گریرسن کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے یہ لوگ عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور ہیں۔ ان میں سے جن استادوں سے ملا ہوں ان سے دوران گفتگو میں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان لوگوں کو مشرقی زبانوں سے اس قدر لگن ہے کہ یہ زبانیں ان کا اوڑھنا اور بچھونا بنی ہوئی ہیں اور زبان سے متعلق مسائل پر غور وفکر ان کی زندگی کا شعار ہو گیا ہے۔ آنجہانی پروفیسر براؤن کی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ انھوں نے عربی اور فارسی کی کتابیں جمع کرنے پر کثیر روپیہ صرف کیا تھا اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

ایک تقطیع کی کتابوں کو اس یکسانیت اس خوبی سے جلد کرایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے ایک ہم عصر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ عام جلدوں پر جلد ساز کو پانچ پونڈ فی جلد کے حساب سے اجرت ادا کرتے تھے کیونکہ ایک تو انگلستان میں ہاتھ کی بنی ہوئی چمڑے کی جلد کی اجرت ہی بہت زیادہ ہے اور اس پر پروفیسر مرحوم کا تقاضا یہ ہوتا تھا کہ کتاب اپنی تقطیع کی دوسری کتابوں کی ہم شکل اور ہم رنگ ہو اور بازحد مضبوط ہو۔ یہ صاحب بیان کر رہے تھے کہ اگر جلد یا جلد کی جز بندی کی مضبوطی پر پروفیسر صاحب کو ذرا بھی شک گذرتا تو وہ جلد ساز کے سامنے جلد کے ایک گتے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتے اور اگر جلد یا جز بندی کمزور ہوتی تو یہ گتا تو پروفیسر صاحب کے ہاتھوں میں رہ جاتا اور کتاب جلد سے الگ ہو کر دور گر جاتی اور جلد ساز کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ اس جنون سے چونکہ ان کا جلد ساز اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اس لئے شاذ ہی ایسا موقع آتا کہ جلد کا اس طرح امتحان لیا جاتا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ ان لوگوں کو زبان سے جنون کی حد تک شغف ہے انہی پروفیسر براؤن کے متعلق مشہور ہے کہ انگلستان میں جب اور جہاں کہیں کسی پڑھے لکھے ایرانی یا عربی نووارد کی خبر سن پاتے تو اسے اپنے پاس ٹھہرانے کے لئے لے آتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب پان اسلامزم کی مشہور تحریک کے علم بردار سید جمال الدین افغانی گھومتے گھومتے لندن پہونچے تو پروفیسر صاحب کو ان کے آنے کی اطلاع ملی۔ آپ سید صاحب کے پاس پہونچے اور اپنے پاس لے آئے پروفیسر براؤن عربی اور فارسی بے تکلف بولتے تھے۔ عربی میں گفتگو ہو رہی تھی پروفیسر صاحب نے سید صاحب کی تحریک کے متعلق شبہات کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ اسلامی ممالک میں اسلام کے ابتدائی دور کی خلافت کا احیا چاہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اسلامی ممالک میں ملوکیت کی جڑیں بہت مضبوط ہو گئی ہیں۔ کیا آپ بادشاہوں سے ٹکر لے سکیں گے اور ان کو تخت سے اتار سکیں گے سید صاحب مرحوم نے جواب دیا "هذا اسهل من خلع نعلین" (یہ تو جوتا اتارنے سے بھی آسان ہے) پروفیسر براؤن خاموش ہو گئے۔

اس واقعہ کی سیاسی نوعیت سے بحث نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ انگلستان میں بیٹھے ہوئے ہمارے استاد پروفیسر براؤن اسلامی ممالک کی مکمل سیاست سے کس قدر آگاہی رکھتے تھے۔ ان کے

نزدیک ہمارے ہندی استادوں کی طرح فارسی کو سیکھنے کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ حافظ اور سعدی کے چند اشعار کو ازبر کر لیا جائے بلکہ وہ ان زبانوں سے متعلق ملکوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی کیفیت سے بھی ہر وقت آگاہ رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے سیاسی حلقوں میں اُن استادوں کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خدا جانے مملکت برطانیہ کا آئندہ کیا حشر ہو لیکن جب سے میں نے انگلستان کو دیکھا ہے اس وقت سلطنت برطانیہ میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا اور مشرقی ممالک کے جملہ رموز مملکت سے نہ صرف مشرقی زبانوں کے انگریز استادوں کو باخبر رکھا جاتا تھا بلکہ ہر ایک مسئلہ میں اُن سے رائے طلب کی جاتی تھی اور اکثر و بیشتر اُن کے مشوروں پر عمل کیا جاتا تھا۔ مشرقی ممالک کے تمام انگریزی سفارت خانوں کے ملازموں کی بھرتی انہی کے مشورہ سے کی جاتی تھی اور جب کسی ملک میں بہت بڑی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی تھیں تو ان استادوں کو وہاں ملک معظم کا نمائندہ بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ میرے استاد سر ڈینیسن راس ترکی میں سفیر بنا کر بھیجے گئے اور جنگ کے دوران میں وہیں فوت ہو کر استنبول میں دفن ہوئے۔

انگلستان کی دیگر یونیورسٹیوں کی بہ نسبت لندن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا چرچا زیادہ ہے۔ لندن میں ایک صاحب نے نجی طور پر بھی مشرقی زبانوں کی تدریس کے لئے ایک کالج کھول رکھا ہے جہاں دس شلنگ فی لکچر کے حساب سے آپ کو زبان سکھائی جاتی ہے۔ اس آدمی نے یہ انتظام کیا ہے کہ اس نے لندن کے مشہور اور پُر رونق علاقہ پاڈنگٹن میں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا ہے جس میں چند چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں اس درس گاہ کا نام "سکول آف فارن لینگویجز" ہے۔ یہ آدمی اس درس گاہ کا باقاعدہ اور مستقل اشتہار دیتا رہتا ہے اس نے ایک کلرک ملازم رکھا ہے جو انتظامی امور میں اس کی مدد کرتا ہے یہ آدمی خود کوئی مشرقی یا غیر ملکی زبان نہیں جانتا لیکن اپنے آپ کو درس گاہ کا پرنسپل کہتا ہے اور جائز طور پر کیونکہ اس کا حسن انتظام اس خوبی کا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایک طرف تو یہ آدمی سکول کا اشتہار دیتا ہے اور دوسری طرف یہ اشتہار دیتا ہے کہ اسے غیر ملکی زبانیں پڑھانے کے لئے استاد درکار ہیں۔ کئی غیر ملکی آدمی یوں آمدنی کے لئے اس اشتہار کے جواب میں اسے خط لکھ دیتے ہیں یہ آدمی اُن سے انٹرویو کر کے ان کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر اپنے رجسٹر میں درج کر لیتا ہے۔ اور پانچ شلنگ فی سبق کے حساب سے اجرت طے کر لیتا ہے۔ جب کبھی کوئی خواہش مند طالب علم کوئی زبان سیکھنے کے لئے اس کالج میں

جاتا ہے۔ تو پرنسپل اپنے چنے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کو اطلاع دے دیتا ہے اور وقت
مقرر کر کے طالب علم کو اطلاع دے دیتا ہے۔ طالب علم دس شلنگ فی سبق کے حساب سے ادا
کرتا ہے جس میں سے پانچ شلنگ استاد کو دے دئے جاتے ہیں اور پانچ شلنگ میں سے پرنسپل اخراجات
خرچ اور اپنا نفع نکالتا ہے۔ یہ تو ایک نجی درسگاہ کا ذکر تھا اس کے علاوہ لندن یونیورسٹی
کی ایک بہت بڑی درسگاہ "سکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن سٹڈیز" کے نام سے جاری ہے
اس درسگاہ کا سرپرست بادشاہ ہے اور انتظام بڑے بڑے آدمیوں کے ہاتھ میں ہے
درسگاہ میں میٹرک سے لیکر پی ایچ ڈی تک مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے بی اے
فی سبق کے حساب سے لی جاتی ہے لیکن ایم اے اور پی ایچ ڈی میں چونکہ سبق نہیں ہوتے
تمام مدت تعلیم یعنی دو سال کے لئے فیس یک مشت یا سال سال کے بعد لی جاتی ہے اس
میں شام سے لیکر جاپان تک سب مشرقی زبانوں کی تدریس کا انتظام ہے اور اس درسگاہ
طالب علم بیشتر مشرقی ممالک سے آتے ہیں لیکن بہت سے انگریز لڑکے اور لڑکیاں بھی
ہیں جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم محض
مشغلے کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان زبانوں کو سیکھنے کا ایک خاص مقصد ہے
سے قطع نظر باقی سب طالب علم کسی نہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس سکول
ہم میں سے بہت سے آدمی تو محض اس لئے اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کرنے جا
کے بل بوتے پر ہندوستان میں اچھی ملازمتیں مل جاتی ہیں لیکن انگریزوں اور
طالب علم یہاں مختلف ارادوں سے آتے ہیں۔ انگریز طالب علم کے عمومی طور پر
ہیں۔ پہلا طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو حکومت برطانیہ کے بدیشی محکموں کے ملازم ہیں ان
ملکوں میں بھیجنے سے پہلے زبان سیکھنے کے لئے محدود عرصہ کے لئے اس سکول میں بھیج
دوسرا طبقہ ان تجارتی کارندوں کا ہے جو دوسرے ملکوں میں تجارت کی غرض سے جب
بھی غیر ملکی زبان سے شد بد پیدا کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ تیسرا طبقہ ان انگریزی
پادریوں کا ہے جو تبلیغ کے لئے لندن کے فارم مشنری کالج سے تعلیم پا کر دوسرے ملک
ہیں چوتھا طبقہ ان انڈین سول سروس کے ملازموں کا ہے جن کی بھرتی اس جنگ سے پہلے
کی جاتی تھی ان لوگوں کو ہندی اور اردو سکھانے کے لئے اس سکول میں بھیجا جاتا ہے

ان امرا اور امرا کے لڑکوں اور لڑکیوں کا ہے جو محض لسانی ذوق کی تسکین کے لئے اس اسکول میں داخل ہوتے ہیں چونکہ ان کے پیش نظر بھی کوئی افادی مقصد نہیں ہوتا اس لئے یہ زبان کو محض زبان کی خاطر ہندوستانیوں کی طرح سیکھتے ہیں لیکن چونکہ ان کے وسائل عمدہ اور کثیر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں سے اکثر مشرقی زبانوں کے بہت بڑے عالم بن جاتے ہیں وسائل سے میری مراد مادی وسائل اور کتاب خانے ہیں اسوقت دنیا میں جہاں ہندی فارسی، عربی اور اردو کے مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ جمع ہے وہ برٹش میوزیم کا کتاب خانہ ہے اور عربی اور فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں کی مطبوعہ کتابیں سب سے زیادہ جہاں ایک جگہ پر مل سکتی ہیں وہ لندن کے مشرقی زبانوں کے کتاب فروشوں کی دکانیں ہیں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زبان کے جس طالب علم کو یہ وسائل مہیا ہوں وہ کتنا خوش قسمت ہے۔ وسائل کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات یاد آگئی۔ ہندوستان کی تقریباً ساڑھے تین سو زبانوں اور بولیوں پر آج تک جو لاثانی ضخیم تحقیقی کتاب لکھی گئی ہے۔ وہ پروفیسر گریرسن کی ہے یہ درجن سے کچھ پر جلدوں میں کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لندن جانے سے پیشتر میرا یہ خیال تھا کہ پروفیسر موصوف نے ہندوستان میں بیٹھ کر شاید بیس پچیس سال میں یہ کتاب مرتب کی ہو۔ ایک دن اپنے پنجابی استاد ڈاکٹر بیلی سے کسی طرح پروفیسر گریرسن کا ذکر آگیا اور کسی نہ کسی طرح میں نے کتاب مذکورہ کا ذکر کر دیا۔ پروفیسر بیلی کہنے لگے گریرسن تو کبھی ہندوستان نہیں گیا میں نے پوچھا تو یہ کتاب کیسے لکھی گئی ہے کہنے لگے برطانوی حکومت کے ایما پر حکومت ہند نے منشی اور زبان داں ہندوستان میں پروفیسر گریرسن کے لئے ملازم رکھے تھے۔ جو پروفیسر گریرسن کو اس کتاب کا سالہ بہم پہونچاتے رہے اور گریرسن لندن میں بیٹھ کر یہ کتاب مرتب کرتے رہے۔

آپ کے دل میں شاید یہ خیال آرہا ہوگا کہ آخر انگلستان والوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس قدر کثیر رقم مشرقی زبانوں کی تعلیم و تدریس پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کا جواب کسی حد تک تو میں دے چکا ہوں انگلستان میں بیشتر کام افادی نقطۂ نظر سے کئے جاتے ہیں۔ انگریز کی ذہنی ساخت کا تار و پود سمجھ دار بنیے سے ملتا جلتا ہے اور اسی لئے وہ ہر ایک کام کے افادی پہلو ضرور پیش نظر رکھتا ہے اسی لئے مشرقی زبانوں کی درسگاہوں کو محض تفریح و ادبی یا لسانی نقطۂ نظر سے لاکھوں روپے خرچ کر کے قائم نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ ان سے یہ کام [illegible]

کہ سلطنت برطانیہ مشرقی ممالک میں اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھنے ان کو ایک مفید وسیلے کے طور پر استعمال کر رہی ہے ان درسگاہوں کے بیشتر طالب علم مشرقی ممالک میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر کے ہی ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں پھر یہ بھی ایک بات ہے کہ زندہ قومیں قوم کی ہر رگ و پے کو زندہ رکھنے کی سعی میں مصروف رہتی ہیں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مشرقی زبانیں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہیں اور ہر وہ زندہ قوم جو اقوام مشرق سے کسی قسم کا ربط قائم رکھنا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان قوموں کی زبانوں سے واقف ہو۔ یورپ کی ہر ایک قوم کے لئے یہ زبانیں بہت اہم لیکن ان کے حقیقی اثر کا دائرہ یورپ اور انگلستان تک ہے مشرقی ممالک کے لوگ جو یورپ میں آباد ہونے کے بعد جو ابھی تک اپنی زبانوں کے شائق ہیں اور چونکہ انگلستان کو مشرقی ممالک سے گہرا تعلق ہے اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے انھیں یہ احساس بھی ہے کہ اس تعلق کو خوبصورتی اور کامیابی سے نباہنا چاہیئے۔ اس لئے انھوں نے مشرقی زبانوں کی تعلیم و تدریس کو محدود دائرہ میں ایک مذہبی فریضہ کی اہمیت دیدی ہے

انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم و تعلم کے سلسلے کو دیکھ کر اکثر مجھے خیال آیا کہ جب ہمیں ایک آزاد قوم اور ملک کی حیثیت سے مشرقی ممالک سے لین دین کرنے کا موقع ملے گا تو ہمارے لئے بھی یہ ضروری ہوگا کہ ہم انگلستان کی درسگاہوں کے [illegible] کی درسگاہیں اپنے یہاں بھی جاری کریں ورنہ اس کے بغیر دوسرے ملکوں سے [illegible] اور سماجی روابط صحیح طور پر قائم نہیں ہو سکیں گے۔

محمد باقر

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

سالانہ رپورٹ بچوں کا کتاب خانہ ریاست رامپور

حکومت رامپور کی طرف سے تعلیم کو زیادہ مفید اور زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے جو تجاویز عمل میں لائی گئی ہیں ان میں سے ایک مفید اور نئی قسم کا ادارہ بچوں کا کتاب خانہ بھی ہے بچوں کے ذوق مطالعہ کو تسکین اور ہر طالب علم کے لئے موزوں اور مناسب کتابوں اور دوسرے تعلیمی سامان کی فراہمی کے ساتھ مطالعہ کے لئے موزوں ماحول مہیا کرنے کی غرض سے ماہ مئی ۱۹۴۶ء میں اس کتاب خانے کا قیام عمل میں آیا۔

کتاب خانہ کا ابتدائی اور افتتاحی جلسہ زیر صدارت عالی مرتبت مرشدزادہ آفاق جناب نواب علی عہد صاحب بہادر رام پور دام اقبالہم ۱۳ مئی ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوا۔ اور اس کے بعد محدود پیمانے پر لیکن باقاعدگی کے ساتھ کتاب خانے کا کام شروع کر دیا گیا۔

اگرچہ کتاب خانہ کی موجودہ عمارت بہت ہی مختصر، بجٹ محدود۔ اور اہلکاران کی تعداد میں کمی ہے لیکن جس تن دہی کے ساتھ عملے نے کام انجام دیا اور جس سرگرمی اور جوش کے ساتھ مقامی طلباء نے اس کتاب خانے کا خیر مقدم کیا وہ ہمت افزا اور آئندہ کامیابی کا آئینہ دار ہے۔

کتاب خانے کے ادبی جلسے ہوں یا علمی مباحثے۔ بیت بازی ہو یا فسانہ گوئی۔ انشا پردازی کا مقابلہ ہو یا کوئی دوسرا علمی اور ادبی شغل غرض یہ کہ جس نمونہ پر عمل کیا گیا اس میں پیش آمدہ حالات اور ماحول کے پیش نظر خاطر خواہ نہیں تو حوصلہ افزا کامیابی ضرور رہی اور اس امر کا اندازہ ہو گیا کہ یہ کتاب خانہ مقامی طلباء کے لئے مفید تہذیبی خدمات انجام دے رہا ہے اور ہمارے تعلیمی مستقبل کی تشکیل میں بہترین معاون اور تعلیمی پسماندگی کا حقیقی علاج ہے۔

کتاب خانے کے لئے فی الحال ایک عمارت بازار نصر اللہ خاں متصل سٹی ڈسپنسری میں کرایہ پر حاصل کر لی گئی ہے جس میں دارالمطالعہ، کتاب خانہ اور دفتر کتاب خانہ قائم ہے۔ کتاب خانے کی ضروریات کے لحاظ سے یہ عمارت بہت ہی مختصر اور ناکافی ہے لیکن توسیع عمارت کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کتاب خانہ اور دارالمطالعہ روزانہ سہ پہر کے وقت تین گھنٹے کے لئے کھولے جاتے ہیں۔ سال بھر میں صرف خاص اور اہم تعطیلات پر کتاب خانہ بند کیا جاتا ہے۔ دفاتر کی تعطیلات میں صبح کے وقت دفتری کاموں کی تکمیل اور ترتیب کی غرض سے اکثر و بیشتر کتاب خانہ کھولا جاتا رہا۔

کتاب خانے کے ممبران کی تعداد ۲۰۵ ہے۔ کتابوں کی شمار ۱۶۶۹ ہے جس میں اردو۔ ہندی۔ انگریزی اور فارسی کی کتابیں شامل ہیں۔ روزانہ اجرائے کتب کا اوسط ۸۴ ہے۔ اب تک مقامی اداروں کی جانب سے زیر اہتمام کتاب خانہ ۵ ماہانہ ادبی جلسے منعقد ہو چکے ہیں۔ سال زیر بحث میں کتاب خانے میں اسٹوری ڈے (یوم فسانہ گوئی) اور مضمون نویسی کے مقابلے کا اہتمام بھی کیا گیا اور کامیاب طلبا کو اچھی اچھی اور مفید کتابیں انعام میں دی گئیں۔

ممبران کتاب خانہ سے کسی قسم کی فیس یا چندہ وغیرہ وصول نہیں کیا جاتا۔ البتہ منظور شدہ صرف ایک روپیہ بطور زر امانت داخل کیا جاتا ہے۔ ممبران کتاب خانہ کی الماریوں میں سے بغرض مطالعہ کتابوں کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ البتہ کتاب خانہ کی طرف سے طلبا کی رہنمائی اور دوسری سہولتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ہر مقامی تعلیمی ادارے میں ایک ایک طالب علم کتاب خانے کے نمائندہ کی حیثیت سے مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اور انھیں نمائندوں کے اجتماع سے بچوں کی مجلس منتظمہ ہے جس کے عہدیداروں کا باضابطہ انتخاب عمل میں آتا ہے۔

کتاب خانہ ہذا کے ساتھ بچوں کے عجائب خانے کا قیام بھی ایک بنیادی خیال ہے۔ عجائب خانے کے لئے فی الحال چند شوکیس (صندوق نمائش) مہیا کر لئے گئے ہیں۔ مقامی اسکولوں کے طلبا کی دستکاری کے نمونے جمع کئے گئے ہیں تاکہ ان کو دیکھ کر خود اعتمادی اور ترغیب و تحریص کے جذبات نشوونما پا سکیں۔

کتاب خانے کے دار المطالعہ میں بچوں کے لئے اُن کے معیار اور مذاق کے مطابق ۲۵ اخبارات اور رسائل جاری کرائے گئے ہیں۔ مطالعہ کنندگان کا روزانہ اوسط ۸۰ ہے۔ چھوٹے بچوں کو مزے دار کہانیاں سُنانے کے لئے رنگین تصاویر اور بچوں کی اخلاقیات پر خوشگوار اثر ڈالنے کے لئے دیدہ زیب کتبات اور چارٹس مہیا کئے گئے ہیں۔ تعلیمی مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا کو کتاب خانے کی جانب سے صرف کتابیں انعام میں دی جاتی ہیں۔

یہ بھی ارادہ ہے کہ بہ شرط سازگاری حالات اس کتاب خانے میں ہفتہ وار تقریروں کا اہتمام کیا جائے جس کے ذریعہ اُنھیں بڑے بڑے مصنفوں اور عالموں کے حالات اور کارناموں سے آگاہ کیا جاسکے لیکن بصورت موجودہ کتاب خانے کی عمارت میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ ضرورت کے مطابق طلبا کی نشست کا انتظام کیا جاسکے۔ اسی مجبوری کے باعث کتاب خانے کے ماہانہ جلسے بھی علیحدہ مکان میں منعقد کئے جاتے ہیں۔

بہ صورت مجموعی محکمۂ تعلیمات رامپور کا یہ نیا تعلیمی تجربہ کامیاب ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اگر ضروریات کے لحاظ سے اس کے لئے سہولتیں مہیا ہوتی رہیں تو یہ کتاب خانہ اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل میں ممد و معاون ہوگا جو تعلیمی ترقی کے لئے حکومت رامپور اور محکمۂ تعلیمات کا نصب العین ہے۔

ملک اور قوم کے معمار استادوں سے

اتحاد بین الاقوام ہند
کا
منصوبہ

طلبا اور طالبات کے ذریعہ سے

(۱) انسانیت کے جوہر تعلیم سے ابھرتے ہیں، اچھا سنگ تراش پتھر کے جوہروں کو ابھرنے میں نمایاں جد و جہد کرتا ہے، استاد بچہ میں انسانیت کے لطیف اثرات جاں گزیں کرنے اور ان کے ابھرنے میں کوشش کرتا ہے۔

(۲) شرافت موروثی ہے مگر اس کو تعلیمی مدت میں پھلنے پھولنے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

(۳) اعتدال پسندی فطرت کا حسن ہے اور یہ حسن دورانِ تعلیم ہی میں دلفریب بنایا جا سکتا ہے۔

(۴) رواداری معصومیت کا ایک جزو ہے جو تعلیمی مدت میں جڑیں پکڑتی اور علم کے سایہ میں سرسبز ہوتی ہے

(۵) مساوات پاک زندگی کا پھل۔ یہ زندگی (صرف) تعلیم کے اثرات سے بنتی ہے۔

(۶) بلند خیالی کسبی ہے جو ایامِ تعلیم میں حاصل کی جاتی ہے۔

۷) محبت زمانہ اور وقت کی قید سے آزاد ہے اس کی ہر کڑی منزل آسان ہے بشرطیکہ خضر تعلیم محبت کی راہوں کے چراغ گل نہ ہونے دے۔

یہی وہ سات عناصر ہیں جن کی آمیزش اور قیام توازن سے فتنہ و فساد دور کیا جا سکتا ہے۔ حیوانیت فنا کی جا سکتی ہے اور ملک میں ایسا مستقل ماحول تیار کیا جا سکتا ہے جس میں ہر لمحہ اتحاد کی نغمے اپنی پوری دلکشی سے ترنم ریز رہیں۔

مگر

ان سات عناصر ...... کے قیام توازن کا نفسیاتی طور پر حسن رسیدہ افراد قوم میں بہت زیادہ کم امکان ہے

لہذا

اگر ملک میں امن و امان اور اقوام ہند میں اتحاد قائم رکھنا ہے جیسا کہ عالم کا ہر عقلمند قوم چاہتی ہے

تو

اتحاد بین الاقوام ہند کے مفید منصوبہ کو ملک کے ہر تعلیمی ادارہ میں جاری کیا جائے اور ان معصوم بچوں کو امن کا پیامی بنایا جائے۔ جو چند سال بعد ہی قومی جماعت کے ممبر بننے والے ہیں۔ اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اس منصوبہ کے ماتحت چھوٹے بچوں اور بڑے لڑکوں کے لئے سہل الحصول و رحلد بدلا کیا جانے والا لٹریچر تیار کریں اور اسی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیں۔ سیاسیات حاضرہ اس امر کا روشن ثبوت ہے کہ قوموں نے پیش آنے والی سیاسی مشکلات میں طلبا اور طالبات کی مدد حاصل کر کے اکثر اپنی منزلیں پالی ہیں۔ آج آزاد ہندوستان کو امن و امان اتحاد و اتفاق کی ضرورت، پیار و محبت کے بجھتے ہوئے چراغوں کی لو اونچی کرنا ہے۔ یہ کام صرف تعلیم کے ذریعہ سے ممکن اور بننے والی قوم کے وسیلہ ہی سے آسان ہے۔ اگر بچپن سے محبت کا بیج بو دیا جائے تو جوانی میں اس کا

بار آور ہونے کا امکان لازم ہے ۔ ....

لیجیے

ماڈل مانٹیسوری اسکول رام پور کے طلبا و طالبات نے اس منصوبہ پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنے ہم سن بچوں اور بچیوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ وہ خود انسانیت کا مجسمہ نہیں شرافت کی موروثی صفت کو اجاگر کرتے رہیں۔ اعتدال پسندی کو دل میں جگہ دیتے رواداری و مساوات کی علمبرداری کرتے اور خیالوں میں وسعت اور بلندی اور پیار و محبت کے نغموں سے ملک کی فضا میں گونج پیدا کرتے رہیں۔

انہوں نے

اس مفید منصوبہ کی ابتدا اپنے پیارے گھر یعنی ریاست رام پور سے شروع کی ہے وہ بہت جلد آگے بڑھیں گے اور پہلے صوبہ کے اور بعد ازاں تمام ملک کے طلبا و طالبات سے تعاونِ عمل کی اپیل کریں گے

وہ کہیں گے

ہم سب بھائی بھائی ہیں ...... پڑوسیوں کے جان و مال کی حفاظت ہمارا فریضہ ہے شہر کے باشندوں میں شہریت کی صلاحیتیں بیدار کرنا اگر وہ سو چکی ہیں اور ان میں شعور مدنیت جاگر کرنا اگر وہ بجھ چکا ہے ہمارا ہی کام ہے .... ہم اپنے نعروں کے ذریعہ ...... محلوں کو محبتی انسانوں سے آباد۔

بازاروں کو اقتصادی خوش حالی سے لبریز .... کر دیں گے ....

ہم اپنی انتھک کوششوں سے ....

ریل کے اسٹیشنوں کو بین الاقوامی جائے پناہ۔

شہروں کو امن و امان کا مرکز۔

اور ملک کو اتحاد و اتفاق .... کا ایسا آئینہ بنا کر رہیں گے جس میں دنیا کے دوسرے ممالک اور ممالک کی مہذب قومیں اپنی صورت دیکھنا باعث صد افتخار تصور کریں

زیر ہدایت مرزا سجاد علیخاں ہیڈ ماسٹر ماڈل اسکول رام پور

ماڈل و مانٹسوری اسکول رامپور کے مجوزہ

منصوبہ

اتحاد بین الباشندگان ہند

ملک کے ہر تعلیمی ادارہ کو کام کرنا چاہیئے

تعلیم جدید

اڈیٹر
مرزا سجاد علیخاں اخ

تعلیم جدید

مدیر
مرزا اسجاد علی خان بی اے بی ٹی علیگ

نمبر ۵ جلد ۱ — نومبر ۱۹۴۷ء عیسوی

فہرست مضامین

مرزا اسجاد علی خاں اختر نے مفید عالم پریس رامپور میں چھپوا کر شائع کیا۔

تعلیمی مضامین

تعلیم کی تعلیمی اصلاح

آدمی تندرست ہو تو اسے اپنے جسم کے مختلف نظاموں یا اپنے اعضا کا احساس بھی شاید نہیں ہوتا۔ جب تک سب نظام اپنا اپنا کام اچھی طرح انجام دیتے ہیں جسم کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کون میرے لئے کیا کیا کر رہا ہے۔ وہ تو جب صحت بگڑتی ہے، مختلف نظاموں کے وظائف کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس وقت توجہ کبھی ایک نظام کی طرف جاتی ہے کبھی دوسرے کی جانب۔ یہی حال جسم اجتماعی کا ہے۔ حیاتِ اجتماعی میں صحیح یا غلط جیسا بھی توازن بھی قائم ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ نظام عادت کے طور پر چلتا رہتا ہے تو اس کے مختلف اجزا پر ذہن کم ہی متوجہ نہیں ہوتا۔ سب کچھ ایسا پیش پا افتادہ سا ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز مسئلہ نہیں بن پاتی۔ ہاں، جب کسی اجتماعی ابتلا کے باعث، کسی انقلاب میں، کسی جنگ میں توازن بگڑتا ہے تو ہر چیز جو پہلے بدیہی معلوم ہوتی تھی، اب محلِ تامل نظر آنے لگتی ہے۔ مقاصد اجتماعی کی جانچ ہوتی ہے، اداروں پر تنقید ہوتی ہے۔ حیاتِ اجتماعی کے نئے نئے منصوبے سوچے جاتے ہیں، نئے نئے پروگرام بنائے جاتے ہیں، کہیں پرانے شیشوں میں نئی شراب، کہیں نئی بوتلوں میں پرانی شراب بھری جاتی ہے اور معیشت، سیاست، تعلیم کے نئے نقشے تیار ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی میں جیسے جیسے ذہنی

زندگی کی اہمیت بڑھتی ہے۔ یہ تنقید و تبصرہ، یہ منصوبہ بندی اور پروگرام سازی کا کام پھیلتا جاتا ہے۔

گزشتہ عالمی جنگ میں یہ حقیقت نہایت واضح طور پر سامنے آئی۔ جس وقت کہ دنیا کی ساری متمدن قومیں باہم دست و گریباں تھیں اور جنگ میں شکست و فتح قوموں کی موت و زیست کے ہم معنے دکھائی دیتی تھی، کوئی قوم بھی تعمیر امن کے بعد اپنی زندگی کی تشکیل نو کے منصوبوں سے غافل نہ تھی، ہر جگہ سیاسی اور فوجی ہی نہیں معاشی اور تعلیمی زندگی کی تعمیر نو کا مسئلہ اچھے سے اچھے دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے تھا۔ اس زمانے میں مختلف ملکوں نے جو جو تجویزیں تیار کیں ان کا مطالعہ قومی زندگی کی اصلی کارفرما قوتوں کی ماہیت اور ان کے عمل کے رخ کا اندازہ لگانے کے لئے بہت بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔ ہمارے پیش نظر اس وقت اس قسم کا تفصیلی مطالعہ نہیں ہے، صرف ایک پہلو کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔

جوں جوں قومی زندگی جمہور کی زندگی سے عبارت ہوتی جاتی ہے، قومی تعلیم کا وظیفہ مہمہ پہلے سے بہت زیادہ جاذب توجہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ واقعہ بہت قابل لحاظ ہے کہ عین اس وقت کہ انگلستان موت و حیات کی کشاکش میں مبتلا تھا اس کی پارلیمنٹ نے سنہ ۱۹۴۴ء میں ایک نیا قانون تعلیم منظور کیا جس کی وجہ سے انگلستان کے مصارف تعلیمی میں، کہ پہلے سے بھی کچھ کم نہ تھے، کوئی ڈیڑھ ارب روپیہ سالانہ کا اضافہ ہو جائے گا ملک کا تعلیمی نظام ایک قومی نظام بن جائے گا۔ اور زمانۂ طفولیت سے لے کر بالغوں کی تعلیم تک کے جملہ انتظامات کی تکمیل ہوگی۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی تعلیمی تعمیر نو کے منصوبے بنائے گئے ہیں۔ یہاں کے حالات دوسرے خود مختار ملکوں سے مختلف تھے مگر جنگ عمومی کے بعد دنیا کا پھر سے انھیں پرانی بنیادوں پر قائم رہنا جن پر وہ اس وقت تک قائم تھی سب کو ناممکن سی بات معلوم ہو رہی تھی۔ شاید کچھ یہ بھی ہو کہ آزادی کو ترسنے والی ہندوستانی مخلوق اگر بعد از جنگ کے خوش آئند منصوبوں پر بحث مباحثے میں زمانۂ جنگ کی تشویشناک گھڑیاں کاٹ دینے پر آمادہ کی جا سکتی تو ایسا کرنا بھی دانشمندی ہی تھا۔ غرض سارجنٹ اسکیم کے نام سے ہندوستان میں تعلیمی تعمیر کا ایک جامع منصوبہ کئی سال سے ملک کے سامنے ہے۔ اس پر لوگوں نے

شبہ بھی کیا ہے کہ [illegible] محض تسلی ہے [illegible] دل کا بہلاوا۔ کسی نے اسے سراہا ہے، کسی نے اس پر
اعتراض کیا [illegible] بالکل وہ نہیں ہے جو ہم چاہتے ہیں، نیت کا علم تو خدا کو ہے لیکن
[illegible] شاید پہلی بار ملک میں اس کی تعلیمی ذمہ داریوں کا
[illegible] اس میں پہلی بار پورے قومی نظام تعلیم کا خاکہ سامنے آیا
[illegible] قوموں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا
[illegible] کی اہمیت [illegible] کی گذارشات کے معقول
[illegible] اس تجویز کو ہماری تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ ایک
[illegible] حیثیت ملے گی۔ [illegible] لازمی بنیادی تعلیم، متنوع ثانوی تعلیم، وسیع پیمانے پر
[illegible] معذوروں کی تعلیم، [illegible] کی تعلیم سب ہی کا
[illegible] ضرورت توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ
[illegible] کے قیام کا مسئلہ بہت ضروری ہے تاہم [illegible]
[illegible] کی غرض و غایت صحیح معنی میں تعلیم دینا ہے،
[illegible] مغربی تعلیم کا سہارا ہے۔ تعلیمی [illegible] کے ذریعے
[illegible] بہتر انسان نہیں بنیں گے۔ اصل تعلیم کو بہتر بنانے سے اس کی
[illegible] اس وقت جو بحث ہمارے ملک میں تعلیمی مسائل پر ہوتی ہے اس میں اس پہلو کو
نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ مغرب سے بازی کے اس دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے تعلیم کو تعلیم
[illegible] طریق تعلیم پر صورت کو معنی پر فضیلت سی حاصل ہو گئی ہے! تعلیم کے ہر
[illegible] نقطہ نظر [illegible] کوشش [illegible] چاہیے۔ اور ذریعے اور مقصد کو اپنی
اپنی [illegible] اہمیت دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

[illegible] انگریزی میں ایک کتاب ایک انگریز معلم کی قلم سے شائع ہوئی ہے۔ جس کا
نام ہے۔ جس میں اس
نے اس بات کو مختصر مگر واضح طور پر پیش کیا ہے کہ تعلیمی تبدیلیوں کے معنی صرف تعلیم کے مواقع
فراہم کرنا نہیں بلکہ صحیح تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔ تعلیمی تنظیم صرف حسابی مسئلہ نہیں تعلیمی مسئلہ بھی ہے
اس مصنف نے [illegible] میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہمارے موجودہ مدارس سے متعلمین کی اکثریت
کچھ بھی حاصل نہیں کرتی! اس نے ایک ثانوی مدرسے کی تفصیلی جانچ سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش

کی ہے کہ اس وجدانی اندازے کی تائید تفصیلی مشاہدے سے بھی ہوتی ہے، اس نے بتایا ہے کہ ثانوی مدرسوں میں ۷۰ فیصدی طالب علم درس کو ذرا "جذب" نہیں کرتے، ان ۷۰ فیصدی میں ۳۵ فیصدی کے قریب تو ایسے ہیں کہ جذب کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے! جو لڑکے ذرا کمزور رہتے ہیں اور جنہیں ثانوی مدرسے میں ۴ کی جگہ ۵ سال گذارنے ہوتے ہیں ان میں تو ۸۰ فی صد تو "جذب" نہیں کرتے اور ان میں سے ۶۸ فی صد وہ ہیں کہ جو اس کی کوشش بھی نہیں کرتے! جب یہ حال انگریزی ثانوی مدرسوں کا ہے۔ تو ہمارے مدرسوں میں کہ غالباً فی الجملہ ان کا معیار درس بہ ضبط انگریزی مدارس سے کچھ کم ہی ہوگا۔ کیا حال سمجھنا چاہیئے۔؟ ضرورت ہے کہ ہمارے تعلیم کے محکمے، استادوں کی انجمنیں، یا تعلیمی محققین اسطرف توجہ فرمائیں اور تفصیلی تحقیق سے اپنے مدرسوں کی حالت کو جانچیں۔ اور اگر صورت حال ایسی ہی یا شاید اس سے بھی بدتر ہو تو اصلاح کی کچھ نہ کچھ تدبیر کریں۔

بلیک نے اپنی تحقیق میں یہ بتایا ہے کہ ان اعداد کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے ثانوی مدرسوں میں بچوں کی اکثریت کچھ حاصل نہیں کرتی۔ یعنی نہ انہیں کوئی ایسا علم حاصل ہوتا ہے جس سے وہ بعد میں بہت کچھ [illegible] اور نہ کوئی ذہنی تربیت ہی ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ چار یا پانچ سال تک لڑکے لڑکیاں ایسے بے نتیجے کام میں مصروف رکھے جاتے ہیں جس سے ان میں روحانی، اجتماعی اور ذہنی خرابیوں کا پیدا ہونا بہت قرین قیاس ہے۔ اس بے نتیجہ، عبث مصروفیت سے لڑکے لڑکیاں جماعت کے مخالف، غیر ذمہ دار، باغی بنتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ اگر بعد کی زندگی میں دوسری قوتیں دستگیری نہ کریں تو یہ اس مضر کیفیت پر کبھی غالب نہ آسکتے ہوں، ذہنی لحاظ سے اس بے نتیجہ مشغولیت کا لازمی اثر ہوتا ہے کہ ایک احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور متعلمین کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ نکمے ہیں اور خود سوچ بھی نہیں سکتے۔ عام تعلیم یافتہ لوگوں میں جماعتی، تہذیبی اور سیاسی اصلاح کی طرف سے جو بے اعتنائی [illegible] پائی جاتی ہے عجب نہیں کہ وہ اسی نامبارک تعلیم کا ثمرہ ہو۔

بلیک نے اپنی اس کتاب میں مرض کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ

(۱) سب سے بڑی وجہ دلچسپی کا فقدان ہے جو یا تو طبیعت میں پختگی کی کمی کی وجہ سے رونما ہوتا ہے یا صلاحیت کی کمی کے باعث۔ صلاحیت کی کمی کے ساتھ بھی کبھی کبھی ایک خاص قسم کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دلچسپی خود مضمون سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے متوقع نتائج کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ کاش استاد اس دلچسپی کو ایسا میدان دے سکیں جس میں ان کا کام بے نتیجہ نہ رہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مضامین کا بوجھ تقریباً سب متعلمین پر بہت ہوتا ہے جو طلبہ اچھے نتیجے بھی دکھاتے ہیں ان پر بھی یہ بوجھ بہت دباؤ ڈالتا ہے۔ خیال کے متعدد سلسلے بیک وقت برقرار رکھنے ہوتے ہیں اور کسی میں بھی اتنی کامیابی نہیں ہوتی جتنی کم بوجھ کی صورت میں ممکن ہوتی۔

(۳) پھر کام کا بیشتر حصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کامیابی زبان میں مہارت پر منحصر ہے مضامین کی کثرت زبان کی تحصیل کی طرف کافی توجہ نہیں کرنے دیتی۔

(۴) ثانوی مدرسے [illegible] کا موجودہ طریقہ بھی اس ناکامی کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔ اگر اس امتحان میں ابتدائی اساتذہ کی رائے کو پورا دخل دیا جائے تو شاید نتائج بہتر نکلیں۔

اس تشخیص کے بعد بلیک نے مندرجہ ذیل علاج تجویز کیا ہے۔

(۱) بچوں کو ثانوی مدرسے میں ۱۱ برس کی عمر میں بھیجنے کی جگہ ۱۳ برس کی عمر میں بھیجنا چاہیئے۔

امریکہ، روس اور اسکاٹ لینڈ میں لڑکے ۱۲ برس کی عمر میں ثانوی مدرسے میں جاتے ہیں۔ بلیک کا خیال ہے اور وہ اپنی تائید میں سیکھنے کی قابلیت اور عمر کے درمیان جو ربط تھارن ڈائک نے اپنے تجربوں سے قائم کیا ہے اسے پیش کرتا ہے کہ اگر بچے ۱۳ برس کی عمر میں مدرسۂ ثانوی میں جائیں تو غالباً تین سال میں آسانی سے وہ سب کچھ سیکھ سکیں گے جو اب ۴ یا ۵ سال میں بھی نہیں سیکھ پاتے۔

مضامین کے بوجھ کے متعلق بلیک کا خیال ہے کہ بچے ۱۰-۱۲ مختلف سلسلہ ہائے خیال سے ایک وقت میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے عمر کے ۱۳ سال ختم ہونے تک پردیسی زبانوں کو نصاب سے نکال دینا چاہیئے یہ خیال درست نہیں ہے کہ

پردیسی زبانیں اگر شروع عمر میں نہ سیکھی جائیں تو بعد میں سیکھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ پردیسی زبانوں سے جو وقت بچے اس میں خود اپنی زبان کی واقفیت کو پختہ کرنا چاہیے۔

پھر ایک صورت اس بوجھ کو ہلکا کرنے کی بلیگ کے نزدیک یہ ہے کہ ہم مضامین میں یہ فرق کریں کہ عام ذہنی پس منظر پیدا کرنے کے لئے کون سے ہیں اور کام کے لئے مہارت کن میں درکار ہے اگر زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے سبقاً سبقاً مضامین کا پڑھانا ہی لازم ٹھہرے تو پھر تو یہ کام ناممکن سا ہے۔ اس لئے کہ آئے دن درس کے مضامین میں اضافہ ہی کرتے جانا ہوگا اور مضامین کا بوجھ دن بدن بڑھتا ہی جائے گا۔ اور سچ پوچھئے تو اتنا ہی بڑھتا بھی رہا ہے۔ آج یہ مضمون بڑھا دیا گیا۔ کل ایک اور۔ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ علم کو دو قسم کا مانا جائے۔ ایک وہ جس سے ایک ذہنی پس منظر پیدا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا حاضر ہونا ضروری ہے، جس سے بار بار کام لینا پڑتا ہے جس میں مہارت شرط ہے۔ جیسے پہچانا نہیں ہوتا ہے، امتحان کے غیر فطری طریقے کی وجہ سے ہر مضمون جو پڑھایا جاتا ہے اسے یہی دوسری حیثیت دے دی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت سا سماجی اور سائنسی علم اس طرح پڑھایا جا سکتا ہے کہ جب بعض واقعات سامنے آئیں تو آدمی ان کے ربط کو سمجھ سکے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ سارا علم حاضر ہو اور دہرایا جا سکے۔ سائنس کا جو علم کسی صناع یا طبیب کو درکار ہوتا ہے وہ دوسری قسم کا ہے اور جو ایک معمولی شہری کو درکار ہوتا ہے وہ پہلی قسم کا ہوتا ہے۔

مدرسے کے سارے نظام اوقات کو درس ہی درس سے پر کر دینا اور سب مضمونوں کو امتحان میں دہرانے کے لئے پڑھانا بڑی غلطی ہے اور متعلم کے بوجھ کو بے وجہ بڑھانا ہے۔ نظام اوقات کو مندرجہ بالا تقسیم کو سامنے رکھ کر مرتب کرنا چاہیے یہ نہ کیا گیا تو مدرسے میں بہت سی چیزیں بالکل ہی نہ بتائی جا سکیں گی اور وہ وہ چیزیں ہوں گی جن سے لکھے پڑھے خوش حال گھرانوں کے بچے اپنے بہتر ماحول کی

وجہ سے کچھ واقف بھی ہوتے ہیں لیکن غریب مزدوروں کے بچے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ پس لازمی تعلیم کو عام اور مفت کرنے کے باوجود حقیقی تعلیم میں امیر و غریب کے لئے مساوات پیدا نہ ہوگی۔ بلیک کی رائے میں تعلیم کی مختلف منزلوں میں مضامین کی تقسیم کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ انشاء اللہ ہم آئندہ اشاعت میں پیش کریں گے۔

اس کتاب کی طرف خاص طور پر متوجہ کرنے کی اصل غرض یہ ہے کہ ہم بھی نئے تعلیمی تجربات میں تعلیمی مسائل کو محض تنظیمی تدابیر کے مقابلہ میں قابل اعتنا سمجھیں اور ان پر غور و بحث سے تعلیم کی تعلیمی اصلاح کا دروازہ کھولیں۔

سید مجتبیٰ زیدی

استادوں سے خطاب

یہ رپورٹ اتحاد بین الباشندگان ہند کے منصوبہ کے سلسلہ میں جو عید ملاپ کا پہلا جلسہ ہوا اس میں پڑھی گئی۔

منصوبہ

اتحاد بین الباشندگان ہند

منجانب طلباء و طالبات ماڈل و مانٹسوری اسکول رام پور

حضرات! ماڈل و مانٹسوری اسکول کے طلباء و طالبات نے جس مبارک مقصد کے لئے آپ حضرات کو زحمت دی۔ اس کی راہیں بظاہر سنگلاخ ہیں۔ مگر منزل آسان اور فرحت بخش ہے۔ منصوبہ اتحاد بین الباشندگان ہند کے سلسلہ میں ہر دو ادارہ جات کے بچوں کی صدائے نحیف پر جس فراخ دلی سے آپ حضرات نے لبیک کہی اور اپنے بیش قیمت لمحوں سے وقت نکال کر یہاں جمع ہونے کی زحمت گوارہ فرمائی اس سے منزل کا روح افزا ہونا ثابت ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ معصوموں کے تخیلات ہی غیر معمولی صداقت اور آرزوؤں میں بے پناہ جاذبیت موجود ہے۔ اسی فلسفہ کو پیش نظر رکھ کر ملک و قوم کے سب سے زیادہ اس اہم مسئلہ کی ابتدا بھی ان ہی معصوموں کے ذریعہ سے کی جا رہی ہے جس پر نہ صرف ہندستان کی حیات کا مدار ملکہ ارباب حل و عقد کے نزدیک جس پر دنیا کے تمام ممالک کی زندگی کا انحصار ہے اگر اس فلسفہ میں کوئی حقیقت نہ ہوتی تو جنگ عظیم کے بعد جبکہ انسانیت فروشی کی گرم بازاری میں کچھ زیادہ کمی ہونے کے امکانات نہ تھے انسانوں میں قیام امن کو

زندہ کرنے اور اتحادِ قومی کے خفتہ جذبہ کو بیدار کرنے اور ربطِ باہمی کو فروغ دینے کے لیے بین الاقوامی انجمن وجود میں نہ آئی ہوتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن کی مجلس مشرقی و مغربی ممالک کے منتخب افراد یعنی ماہرینِ سیاست۔ ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ سائنس وغیرہ پر مشتمل ہے اور اس طرح اس انجمن کو ایک اعلیٰ نمائندہ جماعت اور اس کی ہر کارروائی کو باشندگانِ عالم کے لیے مشعلِ ہدایت سمجھا جاتا ہے اس انجمن کے بنیادی اصول اور اس کی کارروائی کی اصل منشا جس پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے یہی ہے کہ کسی عالم میں بھی صحنِ عالم میں خونریزیوں کا سودا نہ بڑھنے پائے اور حیوانیت کا ہیولیٰ ہر ایک تحت بند ہو جائے۔ جنگ و جدال قتل و غارت کی جنون خیزیاں، ایامِ جہالت کی تاریخ کا عنوانِ جلی ہیں لیکن یہ وہ وقت تھا کہ جب آدمی کی جولانیِ طبع اور تحریکات فطری پر پابندی۔ اس کے وسعتِ خیال کی راہ مسدود اور اس کے اعلیٰ خصائل ابھرنے کے ذرائع محدود تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ آج جبکہ انسانی اقدار کی روشنی میں ان تمام فطری صلاحیتوں پر جلا دیے جانے کے وسیلے اور مواقع موجود ہیں جو انسان کو انسان بنانے کی قوت رکھتے ہیں تو وہ خونی تاریخ کیوں دہرائی جاتی ہے جس کو جہالت کی تاریخ سے تعبیر کیا جاسکے۔ شاید وجہ یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے فسادِ انسان کی کا جزو رہا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا رہا حتیٰ کہ دورِ حاضرہ کی جماعتوں تک پہونچا اور اس طرح پہونچا کہ ہمارے صلح جو ملک کی مقدس روایتوں کے نام پر بھی بٹہ لگا لیا۔ ان تخریبی جبلتوں کی اصلاح کے لیے زمانۂ ماسبق کی درسگاہوں میں مصلحین کی آمد کارواں در کارواں رہی جنھوں نے اپنے قول و فعل دونوں سے امن و امان کی تبلیغ کی اور اسی ایک مرکزی تخیل کو اجاگر کرنے کے لیے زندگی کے ہر شعبے پر بالتفصیل کام کیا تاکہ شخصیت کی تشکیل، سیرت کی تعمیر اور انفرادیت کی تکمیل سے سماجی زندگی صحیح معنوں میں آدمیت کی حامل رہے۔

چھ سال کی مسلسل عالمگیر خونریزیوں کو افسانہ کی تازگی کا زوال شروع ہی ہوا تھا کہ ہمارے ملک میں نفاق کے شعلے بھڑکے اور یہ شعلے اس انداز سے اپنے کمال پر پہونچے کہ قتل و غارت میں ترک شہر اور پانی پت کے جنگی کارناموں سے بھی بازی لے گئے۔ فرق صرف اتنا رہا کہ وہاں دلیروں کے مقابلہ میں دلیر اور بہادر سپاہیوں کے مقابلہ میں بہادر سپاہی دادِ شجاعت و مردانگی دیتے رہے اور یہاں بےبس اور لاچار عورتیں اور معصوم بچے تیغِ ستم کا نشانہ بنتے رہے

جس کی مکمل تصویر ایک سال قبل میں نے اپنی نظم کش مکش میں بایں الفاظ پیش کی تھی۔

مٹ گئے دامنِ عظمت سے قدامت کے نشاں　　　　اک دریا کی جگہ خون کے دریا ہیں رواں
وہ لگی آگ جو جلتے ہیں غریبوں کے مکاں　　　　وہ تڑپ کر دلِ اخلاق سے اٹھتا ہے دھواں

پڑ گئی اوس شرافت کے گلستانوں پر
بجلیاں گر گئیں تہذیب کے کاشانوں پر

پھر صورتِ حالاتِ حاضرہ کی خونچکاں فہرست طویل ہے جس سے آپ خود کم و بیش آگاہ ہیں اس کو دہرانا زخموں پر نمک پاشی کرنا ہے۔ ہندوستان کی مہذب قومیں حادثاتِ روائح تازیست سرنگوں اور آئندہ نسلیں برسہابرس اشکبار رہیں گی۔

میرے نزدیک ان انسانیت سوز حرکتوں کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ملک کی عام جہالت ہے، جب تک عوام کی تنگ نظریوں، جذبۂ بغض و عناد، خواہشِ انتقام، پست خیالی اور جنون خیزیوں کی تخریبی تحریکوں کا تدارک نہ کیا جائے گا۔ اس وقت تک آج کی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہی رہے گی۔ اور ملکی فضا کو کبھی چین نصیب نہ ہوگا۔ ہم بھی اور آپ بھی اکثر اتحاد و اتفاق کی راہوں سے ہٹ چکے، ان کے خیالوں کی پختگی کو دور کرنا ہے کو موم کرنا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی خوشنما آئندہ ظاہرداریاں ان کے کمزور خصائل پر پردے ڈالیں مگر نفسیاتی اصول تو یہی بتاتا ہے کہ ایسی ظاہرداریوں کے قیام میں شبہات کے پہلو موجود ہی رہیں گے کیا اس کا امکان ہے کہ جن مراحل سے مجھ جیسا معمر آدمی پوری پوری طرح دوچار ہو چکا ہے اور جس کے اثرات میری تعمیر میں شامل ہو چکے ہیں وہ میری زندگی کی راہوں میں کوئی دوسری تبدیلی پیدا ہونے دیں گے؟ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے اس کا امکان ہے کہ وہ بلا لحاظ عمر اپنی شعوری بلندیوں کے ماتحت وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ اپنی راہوں کو تبدیل کرے وہ تبدیل کر سکتا ہے لیکن اس کی یہ تبدیلی گہری اور دور پیدا نہیں ہو سکتی۔ ظاہر کا بدلنا آسان۔ مگر فطرت کا بدلنا مشکل ہے۔ ظاہر کے بدلنے کی تدبیریں سیاسی رہنماؤں کے پاس ہیں لیکن فطرتوں کے بدلنے کا مقدس اور اہم ترین کام مدرسین کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ میں تو اس انتہا تک پہونچنے کی جرأت کروں گا کہ اول الذکر صرف ایک کی اصلاح کا حامل لیکن آخر الذکر کے اجارۂ حقیقت دونوں کے مالک ہیں۔

اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر میں نے جولائی ۱۹۴۷ء کے مہینے میں "تعلیم جدید" کے ذریعہ اتحاد بین الباشندگان ہند کے منصوبہ کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت امن و امان اتحاد و اتفاق کے پرچار میں یہ شدت نہ تھی۔ میں اپنے سیاسی اور قومی تجربات کی بناء پر حالات حاضرہ کی دو ماہ پہلے نباضی کر چکا تھا۔ بچوں میں اس مفید منصوبہ کی کامیابی سے چلانے کی صلاحیت اور استادوں میں مخلصانہ رہنمائی کے جذبہ نے مجھ کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اگر ملک میں مکمل امن اور دائمی اتحاد پیدا کرنا ہے تو معصوم بچوں اور بچیوں کے ذریعہ سے شروع کیا جائے۔ جہاں انسانیت، شرافت، اور محبت کے تکملہ کے تمام مواقع حاصل، جہاں فطری صلاحیتوں کو سنبھالنے اور دلوں کے جوڑنے کے کامیاب وسائل موجود ہیں۔

ان نظریات کے ماتحت میں نے اتحاد بین الباشندگان ہند کے منصوبہ کو اپنے مدرسہ سے شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کا ایک خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے آپ سے اتحاد عمل کی اپیل کرتا ہوں۔ اس کی شرکت میں شخصیت کی تخصیص نہ ہوگی۔ اسمیں ہر شخص شریک ہو سکتا ہے اور میری امداد کر سکتا ہے۔ یہ ایک نیک کام ہے اور نیک کام میں کسی کا ہاتھ بٹانا اجر سے خالی نہیں۔

طریقۂ کار

علاوہ طلباء و طالبات کے اس منصوبہ کے تین حصے ہوں گے۔ ایک وہ جو استادوں سے تعلق رکھے گا جس کے لئے ریاست کے تمام اداروں سے منتخب کر کے چند اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی ہوگی جو منصوبہ کو وسعت دینے اور اس کے چلانے کی ذمہ دار ہوگی۔ دوسرا حصہ طلباء و طالبات کے سرپرستوں سے متعلق ہوگا۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کر دوں کہ تعلیم سے تعلق رکھنے والی کوئی تجویز اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک والدین اور سرپرستوں سے تعاون عمل حاصل نہ کیا جائے۔ بالخصوص منصوبہ ہذا میں جہاں مقصد حقیقی کی باگ ڈور سن رسیدہ معمر افراد قوم کے ہاتھ میں ہے اور اندیشہ ہے کہ استادوں کے متعین کئے ہوئے اسباق والدین کی سرپرستی میں بھلا نہ دیئے جائیں۔ کیونکہ بچہ کو مدرسہ سے زیادہ گھر کا ماحول متاثر کرتا رہتا ہے۔ جہاں اس کو چوبیس گھنٹوں میں ۱۷ گھنٹے صرف کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس طرح والدین

اور سرپرستوں کی ایک کمیٹی ہوگی۔ جو منصوبہ کے مقاصد کا پرچار کرے گی اور بچوں کے لئے گھریلو فضا کو بھی درست و ہموار کرتی رہے گی۔

تیسرا حصہ عوام سے متعلق ہوگا، شہریوں کی اعانت اور عام لوگوں کی دلچسپیاں برقرار رکھنے کے لئے ذی اثر حضرات کی ایک کمیٹی ہوگی۔ کوشش یہ کی جائے گی کہ اس کمیٹی میں شہر کی سیاسی مذہبی اور اخلاقی انجمنوں کے نمائندے بھی شامل ہوں تاکہ جب بچے منصوبہ کی کسی تبلیغ کو لے کر چلیں تو ان کو گرد و نواح کا تعاون حاصل رہے۔

طلباء کا حصہ

ظاہر ہے کہ یہ اہم منصوبہ بچوں سے شروع کیا جائے گا اور ان ہی کی عملی تحریکوں سے اس کے اجزا کو فروغ دیئے جانے کی جدوجہد کی جائے گی وہ جو کچھ خود کریں گے اسے یاد رکھیں گے۔ ان کے عزمِ نازک کو سنبھالنا اور صحیح رہنمائی کرنا استادوں کا کام ہوگا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ منصوبہ کی اہمیت کو ابھارتے رہنا اور بچوں میں اس کے نتیجہ کی چاہ پیدا کرتے رہنا بھی استادوں ہی کے ذمہ ہوگا۔ مانٹیسوری و ماڈل اسکول میں یہ کام چلڈرن کلب انجام دیگا۔ دوسرے پہلے مقامی طلبا و طالبات کی ایک کمیٹی بلائے گا جس میں ریاست کے تمام ادارے اپنے نمائندوں کے ذریعہ سے اپنی تجاویز پیش کریں گے۔ جب مقامی کمیٹی میں کامیابی کے آثار پیدا ہوں گے تو کارکردگی کے طریقوں کو وسعت دیجائے گی پھر صوبہ اور پھر صوبہ کے بعد پورے ملک کے طلبا کو منصوبۂ ہذا پر کام کرنے کی عام دعوت دی جائے گی۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ دائرۂ عمل وسیع ہوتا رہے گا۔

کمیٹیوں کا کام لٹریچر تیار کرنا بھی ہوگا

کمیٹیاں اپنے اپنے مجوزہ کاموں پر عمل تو کرتی ہی رہیں گی۔ لیکن ان کا مخصوص اور اہم کام یہ ہوگا کہ وہ ملک کی رائج زبانوں میں طلباء کی عمر و استعداد کے مطابق ایسا لٹریچر تیار کریں جو منصوبہ کے مقصد کا حامل ہو۔ کوشش کر کے کتب درسیہ میں بھی ایسے اسباق شامل کئے جائیں گے جو اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتے ہوں۔ میں اس اہم تجویز کی تشریح نہ کرونگا

کیونکہ فی الحال بیرا تحاد تعلیم یافتہ طبقہ سے ہی جو تجویز مذکور کے ہر پہلو سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔

جلسے

دُنیا جمہوریت پسندی پر مائل ہے اس لئے فی زمانہ کوئی کام بلا پبلک کی رائے کے انجام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ضروری ہے کہ منصوبۂ ہذا میں ہردلعزیزی پیدا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ افراد کو یکجا کرکے مختلف مواقع پر اتحاد و اتفاق کی افادیت ابھاری جائے اور یہ کام جلسوں کے انعقاد سے ہی زیادہ کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جلسہ ہائے عام بلائے جایا کریں گے جن میں کوشش کیجائے گی کہ ماہرین تعلیم اور رہبرانِ قوم اپنے خیالات سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہیں اور منصوبہ چلانے والوں کو اپنے تجربات کے مطابق ایسی صلاحیں دیتے رہیں جو مفید و مؤثر ہوں۔ جلسوں میں مقامی مقررین کے علاوہ ہر وہ بیرونی مقرر بھی مدعو کیا جاسکے گا جو قوم پرور ہو اور جس میں ملکی برکتوں کی خواہش اور آنے والی نسلوں کی فلاح و بہبود کا جذبہ ہو۔

منصوبہ میں مذہبیات کا شعبہ

ہندوستانی نفاق کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اختلاف مذاہب ہے چالیس کروڑ کی آبادی میں سیکڑوں مذاہب لاتعداد فرقے۔ یہ عرض کرنے میں مجھے باک نہ ہوگا کہ ہر مذہب میں کم ایسے اصول ہیں جو دوسرے مذاہب کے اصولوں سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن زیادہ ایسے ہیں جو دوسرے مذاہب کے اصولوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً رواداری و مساوات۔ پیار و محبت۔ کمزوروں کی اعانت۔ مظلوموں کی امداد۔ پڑوسیوں سے مہربانی کا برتاؤ وغیرہ۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہ اصول تو فراموش کردئے گئے۔ اور ان اصولوں کو ابھار دیا گیا جن سے اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی رہے۔ بہرحال ان کا بھی ردِ عمل اچھی اور خوش سلیقہ طریقۂ تعلیم ہی میں

موجود ہے " اتحاد بین الباشندگانِ ہند" کا منصوبہ دینی رہنماؤں کے اسباق کے علاوہ ہندوستان کے سب سے بڑے مذہبی حکمراں مہاراجا اشوک کے اُس مقولے کی تائید کی روشنی میں چلایا جائے گا۔ جو اُن کی زندگی کی کامیابی کا علم بردار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

"میں ہر مذہب کی عزت کرتا ہوں۔ ہر مذہب والا خدا کا بندہ ہے اور خدا کے بندوں کی خدمت کرنا ہی میرا مذہب ہے۔"

نشر و اشاعت

یہ جانتے ہوئے کہ اس متمدن زمانہ میں ہر شئے کی کامیابی کا دار و مدار نشر و اشاعت پر ہے کوشش کی جائے گی کہ " اتحاد بین الباشندگانِ ہند" کے سلسلہ میں معصوموں کی آواز ہر گوشہ میں پہونچائی جائے تاکہ اُن کے ہم خیالوں کا گروہ رسالے رسائل کے علاوہ اشاعتِ اخبار کے ذریعہ ان سے نزدیک تر رہے اور وہ اپنی تجویزوں کو تائید و تصحیح کے لئے عوام و خواص تک پہونچاتے رہیں۔

میں کیونکر شروع کرونگا

میں اس مفید اور اہم منصوبہ کو کیونکر شروع کروں گا۔ اس کا پہلا نمونہ آج کے جلسہ " عید ملاپ" میں ملے گا۔ باقی فہرست طویل ہے جس کی تفصیل تنگیِ وقت کے باعث فی الحال پیش نہ کرسکوں گا۔ لیکن مختصراً یہ عرض کردوں کہ وگو واقعات سازگار ہوئے تو میرے طلبا و طالبات :-

اس منصوبہ کو لے کر قرب و جوار کے دیہاتوں میں جائیں گے۔ ریلوں کے اسٹیشنوں کو بین الاقوامی جائے پناہ قرار دیے جانے کا پرچار اور تیز تہواری اجتماع کے وسیلے اتحاد کے مظاہرے کریں گے۔ وقت ملنے پر

عام جلسوں کے انعقاد کی بھی کوشش رہے گی

اٹول مانٹسوری اسکول کے طلباء و طالبات کی جانب سے میں پھر ایک بار آپ سب حضرات کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج کے تعمیدملاپ کا پروگرام بالکیوں کے استقبالی ترانے اور ملک کی مایۂ ناز ہستی مرحوم رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی سے لی ہوئی پرارتھنا سے شروع ہوگی۔

مجھے امید ہے کہ میرے ننھے جو آزاد اور دلخوش کن ماحول میں تعلیم پارہے ہیں اپنے خالص جذبات اور دل فریب اداکاریوں سے آپ کو نہ صرف خوش کریں گے بلکہ آپ کو اپنے مقصد کی جانب رجوع بھی کرلیں گے۔

دنیا میں رفتارِ تعلیم

روس اپنے شہریوں کو کیونکر تعلیم دیتا ہے

تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں سوویٹ یونین کی کامیابی قابلِ ذکر ہیں۔ انہیں کنڈرسی لادوٹی آ... ایک خاص جماعت کے نظریہ پر کتابیں اور باشندوں میں اسی جماعت کی پالیسی چلانے کا کام تعلیم کے ذریعہ لیا جا رہا ہے۔ حکومتِ روس اس واقعہ کو سمجھ چکی ہے کہ ملک کا مستقبل آنیوالی نسلوں کے ہاتھ میں ہے اور یہی نسلیں سوویٹ اقتدار کو برقرار بھی رکھ سکتی ہیں۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے تعلیمی نظام پارٹی لیڈرس کے سپرد ہے جو انتہائی جانفشانی سے ایک تعلیمی مواد مہیا کرنے میں منہمک رہتے ہیں جو قوم کی موجودہ پالیسی کا حامل ہو اور جس کی روشنی میں عوام کے بچے اپنی تعلیم کی تکمیل کریں۔ پارٹی لیڈر چاہتے ہیں کہ روس کا ہر شہری یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ "سوویٹ یونین" یعنی ہر فرد سوویٹ یونین فخرِ زمانہ سمجھے جانے کا مستحق ہے اور کن وجوہ کی بنا پر اسے اپنے دوعالم کے صاحبِ ثروت پر ترجیح ہے۔ اسکو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آج کی دنیا ثروت پسندی اور شہنشاہیت کو کیوں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس مخصوص شئے کو کارخانوں، کسانوں، دفتروں اور جماعتوں کی مجلسوں میں مشتہر کیا جاتا ہے اور پارٹی لیڈر کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک کے ہر شعبہ کا جائزہ لیتا رہے اور دیکھتا رہے کہ کہاں تک اس منشا کی تکمیل ہو رہی ہے۔ ہر جگہ کا کام تقسیمِ عمل پر منحصر ہے۔ ایک پارٹی گروپ ہوتا ہے جس کا الحاق شہر اور ضلع کے گروپ سے رہتا ہے اور شہر و ضلع ایک [illegible] ایک تیسرے اجتماع کے ماتحت ہیں جس کو [illegible]

ان شعبوں کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ جو درسی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے کے بھی مجاز ہیں۔ گذشتہ درسیہ کا مطالعہ انکی جانچ اور ان کے اجرا کی منظوری ان ہی شعبوں کے سپرد ہے۔ ظاہر ہے

جب حکومت روس خود تعلیم کا کام اس تن دہی سے کرے گی تو کیسے ہو سکتا ہے کہ حکومت کی پالیسی بار آور نہ ہو اور آنے والی نسلوں میں قوم و ملک کا درد پیدا نہ ہو۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں ایک جلسہ کا ذکر ہے کہ وہاں نو سو اسی

جامع اور محیط نصاب } طلبا وسیع اور مختصر پیمانہ پر مہیا کئے ہوئے طریقۂ تعلیم کے ماتحت تعلیم پا رہے ہیں۔ ان کا نصاب بہت سیاسی ہے ان کے لئے وہ تمام وسائل مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو وسیع پیمانہ پر حالات حاضرہ کو سمجھنے میں مدد دے سکیں اور طلبا کے لئے سماجی و تمدنی ترقیوں کے ذرائع معلوم کرنے میں آسانیاں پا سکیں۔ پانچ سو ان پارٹی لیڈروں کی ایک جماعت بھی نو ماہ کا نصاب کورس حاصل کرتی ہے جن کے سپرد مقامی تعلیم ہو۔ مرکزی پارٹی لیڈر کی جماعت ایک سال کی تعلیمی اسکیم جاری کرتی ہے جس میں ادب۔ فلسفہ۔ آرٹ۔ اور سائنس کے موضوعات ان کے اسباق اور ان کے طریقۂ تعلیم کی ہدایتیں موجود ہوتی ہیں۔ ۲۷ مختلف گروہوں کی ایک گروہ نمائندگی کرتا ہے۔ جو ۱۶ سوویٹ یونین کے صوبوں سے چنے ہوئے افراد کے ساتھ ایک ہی مدرسہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ صنعت و حرفت کا درس دینے کے لئے اکاڈمی آف سائنس سے مدرسین کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

مدارس } ہر مدرسہ میں دو شعبے ہوتے ہیں "پارٹی" اور "سوویٹ"۔ ان شعبوں میں اسکول پارٹی۔ تاریخ سوویٹ۔ قومی سرمایہ اقتصادیات۔ بین الاقوامی تعلقات۔ علم مادیات۔ خارجی پالیسی۔ قانون حکومت۔ تشکیل و تعمیر سوویٹ کے موضوعات پڑھائے جاتے ہیں۔ بعض بعض مقامات پر اقوام غیر کی زبانیں پڑھانے اور علم ادارت کی درس و تدریس کیلئے انتظام ہے۔

یہ ہے وہ طریقۂ تعلیم جس سے بچے۔ استاد۔ شہری۔ اور ملکی لوگ ایک زنجیر کی کڑی بنے ہوئے ہیں۔ اور سوویٹ روس کا ہر فرد اس مفید کار زندگی سے وابستہ ہے۔

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

استادوں کا کتاب خانہ

استادوں کے کتاب خانہ کا اجرا مئی سنہ ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر [illegible] صاحب [illegible] کے ہاتھ سے ٹریننگ اسکول کی عمارت میں ہوا بحمد اللہ کہ باوجود گوناگوں مشکلات کے [illegible] کتاب خانہ آج تک ترقی کر رہا ہے اور حسب معمول اوقات مقررہ پر کھلا رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب [illegible] نے افتتاحی تقریر میں فرمایا تھا کہ رامپور جو اپنی تعلیمی روایات اور علمی شوق کی دوڑ میں کسی دوسری ریاست یا ہندوستانی صوبہ سے پیچھے نہیں رہا ہے امید ہے کہ اس کے استاد اس کتاب خانے کو کتابوں کا مدفن ثابت نہ ہونے دیں گے اور جو استاد واقعی اس سے فائدہ حاصل کرکے اپنے فرائض کی انجام دہی میں اپنے کو اہل ثابت کریں گے۔ قوم اور ملک کی طرف سے جو ذمہ داری استاد پر عائد ہوتی ہے وہ کسی بڑے سے بڑے مصلح، لیڈر اور عالم کی ذمہ داری سے کہیں زیادہ ہے۔ استاد ہی ایک ایسا محافظ و نگراں ہے جس کے بل بوتے پر کسی خاندان، قوم اور ملک کی ترقی کا دار و مدار ہوتا ہے استاد کا ذرا سا تغافل اس نئی نسل کی تکمیل سیرت، انسانیت اور اعلیٰ احساس [illegible] بات کے لئے سم قاتل بن جاتا ہے۔ لیکن استاد کے لئے بھی کسی ایسی امداد و اعانت کی ضرورت رہتی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے معلوماتی ذخیرے میں روز افزوں اضافہ، خیالات میں زمانے کی رفتار کے ماتحت جلا اور طرز تعلیم کا ضرورت کے ماتحت تبدیلی کرتا رہے۔ ان تمام دشواریوں کا حل ایک ہی ہے اور وہ ہے نئی نئی کتابوں کا مطالعہ، رسائل و اخبار بینی۔ مگر یہ بڑی مشکل ہے کہ قلیل تنخواہ پانے والا استاد اتنا سامان [illegible] نہیں کرسکتا۔ اسی مشکل اور دشواری کو حل کرنے کے لئے اس کتب خانہ کا اجرا کیا گیا ہے۔ چنانچہ اساتذہ صاحبان رامپور خصوصاً شعبہ انسپکٹری کے استادوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے الفاظ کو زیادہ صداقت اور جامعیت کا لباس پہنانے کی کوشش کی۔ حضرات اپنی فرصت کے پیش نظر کتب خانے میں بھی تشریف لاتے رہے اور کتابیں بھی مطالعہ فرماتے رہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کتابوں کے مطالعہ کا شوق اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ کسی دلچسپ اور معلوماتی کتاب کے مطالعے کے اشتیاق میں اساتذہ صاحبان کتاب خانہ کے قواعد و ضوابط [illegible] کتب کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور متعدد یاددہانیوں کے بعد بھی

مشغول کتب بینی فرماتے ہیں۔ بعض حضرات تو یاد دہانیوں کو بھی ہر چہ بادا باد کا مصداق سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں ان حضرات کے ان صحیح جذبات کا تو دلی احترام بھی ہے اور مسرت بھی ہے اللہ کرے زور طبع اور زیادہ ملے۔ مگر یہ [illegible] ان حضرات کی خوش فہمی ہوتی ہے جو [illegible] کو واقعتاً برادری کا ایک اہم رکن سمجھ کر فائدے اٹھا [illegible] مقام کو [illegible] دیکھنا چاہتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہنا یہ ہے کہ اساتذہ نے اچھی خاصی تعداد میں تشریف لا کر [illegible] کتب خانے سے [illegible] کو [illegible] بنانے کی کوشش کی چنانچہ مئی ۱۹۴۶ء سے اپریل ۱۹۴۷ء تک [illegible] مطالعہ کنندگان کی تعداد تخمیناً دو ہزار کے لگ بھگ رہی اور اسی قدر کتب کا اجرا بھی ہوا۔ اس کے علاوہ ایک [illegible] بات اور بھی قابل ذکر ہے اور وہ ہے کتاب خانہ کے [illegible] جلسے۔

یہ جلسے ہر ہفتے یا دو ہفتے ہوتے رہے ہیں۔ اساتذہ صاحبان کے علاوہ اراکین حکومت و شرفائے شہر بھی ان جلسوں کو زینت بخشتے رہے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں یعنی مئی ۱۹۴۶ء تا اپریل ۱۹۴۷ء تقریباً ۱۲ جلسے ہوئے جن میں تعلیمی اور ادبی مقالے اور مباحث پڑھے جاتے رہے۔ اور تعلیمی اہم مسائل پر بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ ان جلسوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب مدیر کی امیدوں کو خوش اسلوبی اور تیز رفتاری سے پورا کیا جائے۔

[illegible] آخری جلسہ [illegible] اپریل ۱۹۴۷ء کو [illegible] ماسٹر صاحب ٹریننگ سکول کی صدارت میں منعقد ہوا [illegible] کے اساتذہ نے اپنے تجربات [illegible] کو مباحثہ کی صورت میں پیش کیا اور [illegible] موقع تھا کہ [illegible] اساتذہ کے صحیح خیالات [illegible] ہو کر عملی زندگی میں کچھ نئے مشاہدات و تجربات کا اضافہ کریں۔

اس آخری جلسہ کے بعد [illegible] افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی ناہمواری نے [illegible] ہمارا یہ سلسلہ [illegible] کم از کم چھ جلسوں [illegible] کی سننے کا موقع [illegible] ہمارے جلسوں کے انعقاد [illegible] رہی کتاب خانہ کا اجراء [illegible] اساتذہ صاحبان تشریف بھی لاتے رہے اور کتب بھی باقاعدہ تقسیم کی جاتی رہیں حسب ذیل گوشوارے سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس تعطل کی حالت میں بھی ہمارا کام کس حد تک جاری رہ سکا

تعداد کتب جاریہ مئی ۱۹۴۷ء لغایت ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء

اردو کتب جن میں ادب بھی شامل ہے :- ۱۵۱ تقسیم کی گئیں۔

انگریزی ادب نفسیات طریقۂ تعلیم - انتظام مدرسہ ۲۹ تقسیم کی گئیں۔ کل ۱۸۰

تعداد مطالعہ کنندگان، بقیہ مدارس بہ تفصیل ذیل

	مئی	جون	جولائی	اگست	ستمبر	اکتوبر	میزان
رضا انٹر کالج	۸	۲	۵	۴	۲	۳	۲۴
مرتضیٰ ہائی سکول	۱۵	۱۱	۸	۵	۶	۶	۵۰
ذوالفقار سکول	۱۰	۲	۵	۳	۴	۷	۳۱
مدرسہ عالیہ	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۵
ماڈل سکول	۰	۰	۱	۲	۳	۱	۷
حامد ہائی سکول	۵	۲	۳	۲	۳	۱	۱۶
انسپکٹری	۴۳	۴۹	۲۹	۱۴	۱۵	۲۷	۱۵۷
ٹریننگ اسکول	۱۷	۱۰	۱۸	۷	۱۳	۲۶	۹۱
							۳۷۱

اس میں کوئی شک نہیں کہ مطالعہ کنندگان کی تعداد [illegible] تسلی بخش نہیں۔ مگر امید ہے کہ اب حالات کی سازگاری [illegible] آخر سال میں سال گذشتہ سے بھی کہیں زیادہ ہوگی جبکہ سال گذشتہ کی [illegible] کتب خانہ کی جدید کتب کا اضافہ ہوگیا ہے۔

کتب کی تعداد چار سو سے کچھ زائد ہے رسائل و اخبارات ہنگامی حالات کی بنا پر [illegible] امید ہے کہ اب وہ بھی باقاعدہ تاریخ پر آنے لگیں گے۔ ناظم صاحب تعلیمات سے [illegible] مزید توجہ فرماکر کتب و رسائل کے ذخائر میں اضافہ کی کوشش فرمائیں گے۔

چونکہ موسم سرما شروع ہوگیا ہے اس لئے کتب خانہ کا وقت ۴ سے ۶ بجے شام تک کردیا گیا ہے۔ آخر میں اساتذہ صاحبان سے التماس ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں تشریف لاکر کتاب خانے کی دلچسپیوں میں اضافہ فرمائیں۔

ناظم کتاب خانہ
۲۲ اکتوبر ۴۷ء

باقر اسکول (رپورٹ)

عالی مرتبت جناب صاحب مشیر تعلیمات بہادر - جناب والا !

[illegible] ہے کہ میرا تبادلہ اینگلو ورناکیولر باقر مڈل اسکول کے عہدہ ہیڈ ماسٹری سے حامد ہائی اسکول کی [illegible] ماسٹری پر ہوا ہے - باقر اسکول اسوقت اپنی زندگی کے مکمل چار دور گذار چکا ہے اور پانچویں دور میں [illegible] میں اسکول نے بحیثیت مجموعی جو کچھ کیا وہ مستحق ستائش ہو یا نہ ہو حیرت انگیز ضرور ہے - مجھے [illegible] ۱۹۴۲ء [illegible] اچھی طرح یاد ہے جب ہم نے باقر اسکول میں کام شروع کیا تھا مختصر سی عمارت میں [illegible] چند ساتھیوں کی مدد سے تعلیم جیسے اہم کام کی بنیاد رکھی گئی - گرد و پیش کے حالات کے پیش نظر اس لئے کام کی بجا آوری [illegible] دشوار معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس مقام کا ماحول اور یہاں کی طرز معاشرت شہر کی فضا سے بالکل مختلف ہے - یہ ریاست کا صنعتی علاقہ ہے جہاں مشینوں کی حکومت ہے - یہاں کی زندگی شہری زندگی سے زیادہ متحرک زیادہ پر شور اور زیادہ مشغول ہے - اور پھر یہ زندگی بھی یکساں نہیں ایک طرف سادہ دل اور سیدھی سادی زندگی بسر کرنے والے ان پڑھ اور ناخواندہ مزدور ہیں - دوسری طرف مغربیت کے پرستار جدید روشنی کے دلدادہ فیشن ایبل، دولت مند افسران ہیں - ان کے بیچ بیچ ایک تیسری جماعت ہے جو "بابو لوگ" کے نام سے مشہور ہے - ان ہی مختلف اور [illegible] جماعتوں مختلف الطبع لوگوں [illegible] میں میل جول پیدا کرنا تھا - ان کو اپنا بنانا ان کو سمجھنا اور سمجھانا اور ان کی خدمت کرنا ہمارا کام تھا - ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا اس لئے موقع کی نزاکت کا خیال جب کبھی ذہن میں [illegible] تو [illegible] دقت سی محسوس ہوتی اور ہزارہا شکوک بے چین کرتے تھے لیکن بہرحال کام ہم اپنے ذمہ لے چکے تھے اور اس کو کرنا ہی تھا اس لئے خدا پر بھروسہ کرکے اور مشکلات کو سب خوف [illegible] ہم نے میدان [illegible] اپنی کوشش شروع کردی - ماحول کا جائزہ لے کر اسکول کے مشاغل کو اس سے ہم آہنگ اور ہموار کرنے کی کوشش کی - اطراف کی زندگی سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے اس سے رابطہ پیدا کرنا شروع کیا - اسکول میں خاص طور پر ایسے مشاغل جاری کئے جو ماحول کے مطابق اور اس کی زندگی کے آئینہ دار تھے - اسکول کو محض کتابی تعلیم کا ادارہ بنانے کے بجائے اس کو زندگی کے دھارے کے ساتھ بہنے والی کشتی حیات بنا دیا - یہاں کی زندگی کو مشینوں کی طرح باترتیب اور منظم کارخانوں کی طرح پُرشور و ہنگامہ خیز اور جوش و خروش سے مملو کیا تاکہ بچے اور اُن کے والدین یہ دیکھیں کہ اسکول اُن کی عام زندگی سے کوئی الگ شئے ہے - مجھے مسرت ہے کہ ہمارے مساعی مشکور ہوئیں - اور تھوڑے ہی عرصہ میں اسکول کی [illegible] رونق اور چہل پہل میں اتنا اضافہ ہوا جو سچ پوچھئے تو ہماری توقع سے کہیں زیادہ تھا -

پہلی ششماہی میں لڑکوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ رفتہ رفتہ اس تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہوتا گیا اور لڑکیاں بھی پڑھنے کے لئے آنے لگیں۔ اب یہ تعداد ڈھائی سو کے قریب پہونچ چکی ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں اسکول سے اتنے مانوس ہوگئے کہ تعطیل کا دن اُن کو بارگذر سے لگا۔ بچوں کے والدین اور اطراف و جوانب کے دیگر اصحاب بھی اسکول کے کام سے مطمئن اور خوش نظر آنے لگے اور اکثر مواقع پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے لگے۔ آفیسران محکمۂ تعلیمات نے ہماری محنت کی داد دی اور ہمت افزائی فرمائی یہ سب کچھ کسی ایک کا کام نہ تھا۔ اس کامیابی میں، میں اور میرے رفقائے کار مساوی طور پر شریک ہیں۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے پر بیجا تفوق جتانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ایک منظم خاندان کے ذمہ دار افراد کی طرح یکسوئی کیساتھ اپنا اپنا متعلقہ کام انجام دیا جس میں بچوں کے اشتراکِ عمل کو بھی اچھا خاصا دخل ہے کیونکہ طلباء کے تعاون کے بغیر شاید ہم اتنے کامیاب نہ ہوتے۔ ہمارے جبر تدریسی و غیر تدریسی مشاغل اُن ہی کی معصوم کوششوں سے پھولے پھلے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری یہ تمام جدوجہد ان ہی میں حرکت عمل، ذوق و شوق، جوش و خروش اور زندگی پیدا کرنے کے لئے تھی۔ بچوں کی دوکان، بنک، عجائب گھر، چڑیا گھر، لائبریری، بزم ادب، نواز جغرافیہ، سوسائٹی، ہسٹری سوسائٹی، بچوں کی عدالت، ریڈکراس سوسائٹی، بچوں کی پولیس، اسکاؤٹنگ، صندوق اشیاءِ گم شدہ، اسکول میگزین، تفریحی مشاغل کا گھنٹہ بچوں کی انتظامیہ مجلس، اور اسی قسم کے دوسرے تعلیمی منصوبے اگر بچے نہ چلاتے تو کون چلاتا؟ نگرانی و رہبری کے فرائض ہم نے انجام دئے اور عملی کام بچوں نے کیا۔

ان مشاغل کے ذریعہ طلباء کی عملی صلاحیتیں ابھریں۔ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس ہوئے اور انھوں نے یہ تمام باتیں کھیل کھیل میں سیکھ لیں۔ خرید و فروخت، حساب و کتاب، منیجر کے فرائض، بنک کا طریقۂ کار، کتابوں کا مطالعہ، اور ان کے ریکارڈ کے طریقے، کتابوں کی تنظیم دیکھ بھال عملی باتیں اور اور امور ریڈکراس کے اغراض اور اس کا عملی کام، عدالت کی کارروائی اور اس کے متعلقات ریاست کا انتظام اور اس کے طریقے، آپس میں ربط و ضبط، میل جول اور اتفاق و اتحاد اور دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق بچوں کو ان مشاغل کے ذریعے عملی صورت میں سکھایا گیا۔ یہ مشاغل ہفتہ عشرہ میں ہوتے رہے کبھی کبھی مہینے یا دو مہینے پیچھے تنوع کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوئے نئے مشاغل اور دلچسپ تقاریب عمل میں آتی رہیں۔ کبھی اسکول میں مداری کا کھیل ہو رہا ہے تو کبھی میلہ منایا جا رہا ہے۔ کبھی بچے کارخانہ کی سیر کو جا رہے ہیں تو کبھی کسی گاؤں کے قریب شہر سے دور پکنک منا رہے ہیں۔ کبھی نمائش کی تفریح ہو رہی ہے تو کبھی انتخاب کے دن کا شور و غل ہے۔ کبھی یوم اسکول کے چرچے ہیں تو کبھی سالانہ جلسے کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں اور پروگرام بن رہے ہیں۔ کبھی سینما میں تاریخی پکچرس دیکھی جا رہی ہیں اور کبھی کسی مہمان کی آمد پر اسکول سجایا جا رہا ہے

ہمیں جدید اور سچی تعلیم و عمل میں اسکول نے جو کچھ ترقی کی وہ افسران تعلیم اور عام لوگوں سے مخفی نہیں۔ یہ ہر دو سال سے ہماری کوشش اور محنت کی۔ اور اس سال سالانہ جلسے کے موقع پر ماہرین تعلیم اور دیگر اعلیٰ افسران نے بہت فراخ دلی سے ہمارے کام کو سراہا ہے جس میں عالی مرتبت جناب سید **بشیر حسین** صاحب زیدی بہادر، عالی مرتبت جناب خواجہ **غلام السیدین** صاحب بہادر اور عالی جناب ڈاکٹر **ذاکر حسین** خان صاحب جیسے ممتاز اور مستند حضرات شامل ہیں۔

اگر تعلیم کا مقصد خودی کی تربیت اور انفرادیت کی تعمیر اور اس کو مستحکم اور مضبوط بنانا ہے، اگر تعلیم کا مقصد ستی اور نفع اور ایک دوسرے میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرنا ہے، اگر تعلیم کا مقصد حرکت و عمل کی تلقین ہے اور انسان کی مخفی قوتوں اور صلاحیتوں کو ابھارنا اور بروئے کار لانا ہے، اگر تعلیم کا نصب العین انسان میں ذمہ داری کا احساس دلانا اور عملی زندگی میں حصہ لینے کے قابل بنانا ہے تو شاید کہوں گا کہ **باقر اسکول** اپنی کوششوں میں بہت کچھ کامیاب ہے۔

ان تمام گذارشات کا یہ مطلب نہیں کہ اسکول نے ترقی کے تمام مراحل طے کر لیے اور مزید ترقی کی گنجائش نہیں بلکہ ہمارے سامنے اب بھی وسیع میدان ہے۔ اور ابھی ہم کو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر اسی طرح کام ہوتا رہا تو یہ اسکول ہمیشہ آگے بڑھتا رہے گا۔ اور تعلیم کا حقیقی مقصد بھی فوت نہ ہوگا۔ میری دعا ہے کہ باقر اسکول ہمیشہ ترقی کے مدارج عالیہ سے ہمکنار رہے، زندگی کے نئے روز و شب پیدا ہوتا رہے۔

نیازمند
محمد خلیل اللہ خان

ماڈل و مانٹسوری اسکول رامپور کے مجوزہ

منصوبہ

اتحاد بین الباشندگان ہند

پر

ملک کے ہر تعلیمی ادارہ کو کام کرنا چاہیئے

محکمہ تعلیم ریاست رامپور کا آرگن

تعلیمِ جدید

اڈیٹر: مرزا سجاد علی خاں اختر، بی اے، بی ٹی (علیگ)

تعلیم جدید

مُدیر
مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے بی ٹی (علیگ)

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
فی پرچہ آٹھ آنے

جلد ۲ | رامپور - اگست سنہ ۱۹۴۷ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے مرتضٰی پریس رامپور میں طبع کرا کے شائع کیا

اُستادوں سے خطاب

سپاس نامہ کا جواب

فخر ہند عالی جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے الوداعی عصرانہ کے موقع پر رام پور کے اساتذہ کے سپاس نامہ کا جو جواب مرحمت فرمایا وہ آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش ہے۔ (ادارہ)

میں آپ صاحبان کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس خلوص اور محبت کے ساتھ مجھے یہاں مدعو کیا۔ اور میری معمولی خدمات کا ذکر اس قدر مبالغہ کے ساتھ اپنے سپاس نامے میں کیا لیکن اس شدت اعتراف کو میں آپ کے اخلاق اور عنایت پر محمول کرتا ہوں اس بارے میں (بقول اخبار کے اڈیٹروں کے) اڈیٹر کا نامہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں! آپ کے الفاظ کو سن کر جہاں میرا دل بہت متاثر ہوا۔ مجھے مولانا حالی کا ایک قصہ بھی یاد آیا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو اپنی ایک تازہ نظم لکھ کر بھیجی تھی۔ دوست نے جن کا نام تحسین حسین خاں تھا۔ اس کی بہت پرجوش داد مولانا کو لکھی۔ مولانا نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھ بھیجی۔

یہ ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا   یہ جوش شراب جام خالی میں ہوا
اس طرح سے تحسین نے دی دادِ سخن   شک آپ مجھے اپنی بے کمالی میں ہوا

البتہ مجھے یہ شک سنجیدگی سے نہیں ہوا۔ کیونکہ میں بخوبی واقف ہوں کہ میں جو کچھ کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کو اپنی خواہش کے مطابق انجام نہیں دے سکا۔ اس کی بڑی وجہ یقیناً

میری اپنی کوتاہی ہے لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے ریاست میں آنے کے فوراً ہی بعد خوش قسمتی سے جنگ ختم ہوگئی لیکن اس کی وجہ سے بدقسمتی سے، دوسری ریاستوں اور صوبوں کی طرح یہاں کی آمدنی پر بھی بُرا اثر پڑا اور تعلیم کی بعض بڑی بڑی اسکیمیں، جو حکومت کے پیش نظر تھیں اور جن کو چلانے کے لئے مجھے ریاست میں بلایا گیا تھا، عمل میں نہ لائی جاسکیں۔ اگر مالی وسائل کی یہ دقت پیش نہ آجاتی تو شاید تعلیم کی توسیع اور اصلاح کا کام زیادہ کامیابی اور سرعت کے ساتھ ہو سکتا۔ علاوہ اس کے یوں بھی میرا اصول ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ہمیں اپنا معیار بلند رکھنا چاہیئے۔ اور اپنے کام کا احتساب دشمن کی سی سختی کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ میں نے بار بار آپ حضرات کے سامنے اس بات کو دہرایا ہے کہ آپ اپنی اپنی جگہ پر اپنے کام کو ایک بلند معیار پر جانچیں اور تھوڑی سی کامیابی پر مطمئن اور خوش نہ ہوں۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ جو اصول میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس کا اطلاق خود اپنے اوپر نہ کروں اور جب میں اپنے کام کو اس کسوٹی پر پرکھتا ہوں تو کردہ گناہوں کی سزا سے زیادہ ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتا ہوں۔

البتہ آپ نے اپنے اڈریس میں ایک بات ایسی کہی ہے کہ جس کی میں دل کی گہرائی سے قدر کرتا ہوں۔ آپ نے کہا ہے کہ مجھے استادوں کی فلاح اور بہبود سے بہت گہری دلچسپی اور ہمدردی ہے۔ اس کے بارے میں میں یقیناً اقبالی مجرم ہوں۔ میں نے جب سے تعلیم کے میدان میں کام کرنا شروع کیا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس رہا ہے کہ ہندوستان میں اساتذہ کی حالت بہت ناقابل اطمینان ہے اور کوئی تعلیمی اصلاح اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے حکومت، محکمہ تعلیم، پبلک اور خود استادوں کی جماعتیں مل جل کر کام نہ کریں۔ یہ احساس مجھے ابتدا ہی سے تھا لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا گیا ہے۔ اور اسی لئے میں نے اب تک جہاں کام کیا ہے اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے کہ ہر معاملے میں استادوں کے مفاد کو مقدم سمجھا جائے اور اُن کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس حیثیت سے کہ وہ تعلیم میں برابر کے شریک کار ہیں۔ جو کام انجام دے رہے ہیں اس کی قومی زندگی میں بڑی زبردست اہمیت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جمہوری دور میں کسی محکمہ میں بھی محض افسر اور ماتحتی کے تعلق سے کام لیکر

خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس رشتہ میں رفاقت اور اشتراکِ عمل کا وہ احساس پیدا نہیں ہو سکتا جو ہر اچھے کام کے لئے ضروری ہے۔ جب کوئی ملازم اپنے کام کو محض اس خیال سے کرتا ہے کہ اسے اس کے صلے میں کچھ تنخواہ ملتی ہے (اور وہ بھی عام طور پر اتنی کہ وہ اس سے بددل رہتا ہے) تو وہ کم سے کم کام کرکے محض خانہ پُری کرنا چاہتا ہے۔ اس میں اپنا پورا دل اور دماغ وقت اور توجہ نہیں لگاتا۔ برخلاف اس کے اگر وہ کام کو اپنا کام سمجھے، اس کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے میں اُسے مسرت اور اظہار خودی کا موقع حاصل ہو تو اس کا رویہ بدل جاتا ہے لیکن اس قلب ماہیت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افسر اس کو یہ محسوس کرائیں کہ وہ اس کی ذات اور اس کے کام دونوں کی قدر کرتے ہیں اور ان کے دل میں اس انسانیت کا احترام ہے جو سب میں مشترک ہے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا یوں تو یہ چیز ہر محکمے میں ہر اجتماعی کام میں ضروری ہے لیکن محکمۂ تعلیم میں اس کی خاص اہمیت ہے کیونکہ تعلیم کی نوعیت ایک لحاظ سے اور کاموں سے مختلف ہے یہاں تو سارا کھیل شخصیت کو بنانے کا، انسانیت کے احترام کا، ذاتی مثال اور سیرت کے اثر کا ہے۔ اور وہی اُستاد اپنے شاگردوں میں عزتِ نفس اور خودداری کے جذبات پیدا کرتے ہیں جن میں یہ صفات خود موجود ہوں۔ اس لئے میری ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ استادوں کے احساس کمتری کو اور ان کے دلوں میں اپنے افسروں کی طرف سے جو خوف اور مرعوبیت کی کیفیت ہوتی ہے اس کو دور کیا جائے۔ جب میں علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں کام کرتا تھا اس وقت بھی میں ہمیشہ استادوں کو یہ بتانے کی کوشش کرتا تھا کہ انھیں خود اعتمادی اور سچی جرأت کی شان خود میں پیدا کرنی چاہیئے۔ جب مجھے ریاست کشمیر میں جا کر پہلی مرتبہ بڑے پیمانہ پر انتظامی کام کرنے کا موقع ملا تو میں نے اس کوشش کو جاری رکھا ابتدا میں مجھے اس میں خاصی مشکلات پیش آئیں کیونکہ وہاں بھی افسری اور ماتحتی کی غلط روایات بہت مستحکم ہیں اور افسروں سے بھی زیادہ ماتحت غلط قسم کے "حفظ مراتب" پر مصر تھے یہاں تک کہ اسکولوں کے اساتذہ اکثر میرے دفتر میں میرے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو تیار نہ ہوتے تھے ایسی حالت میں بعض دفعہ دلچسپ لطیفے ہو جایا کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ میں اس بات پر مصر تھا کہ میرے پرائمری سکولوں کے مدرس میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے اپنے معاملات کے متعلق اس طرح بات چیت کریں جس طرح دو انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کرنی چاہیئے اور

ان کو اصرار تھا کہ وہ ہاتھ باندھ کر اور کھڑے ہو کر "عرضداشت" پیش کریں اور جب وہ کسی طرح اس طریقۂ عمل کو بدلنے پر راضی نہ ہوتے تھے (شاید ابتدا میں وہ دل میں یہ سمجھتے ہوں کہ میں انھیں خلوص کے ساتھ یہ مشورہ نہیں دے رہا ہوں) تو میں ایک مصنوعی ناراضگی اور سختی کے لہجہ میں ان سے گفتگو کرنے سے انکار کر دیتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ وہ دفتر سے چلے جائیں۔ یہ میں خودداری کی تعلیم بزورِ شمشیر!! دراصل میں اس چیز پر اس قدر زور اس لئے دیتا تھا کہ اس قسم کی خوف کی ذہنیت کا اثر سب استادوں ہی پر نہیں بلکہ تمام طلبا پر بھی بہت برا پڑتا ہے۔ جب استاد، ہیڈ ماسٹر، خوف زدہ رہیں گے۔ ہیڈ ماسٹر افسران معائنہ سے اور افسران معائنہ ناظم تعلیمات سے تو سارے محکمہ میں خوف کی فضا مسلط ہو گی اور خوف ہی محرک عمل ہوگا۔ ایسی حالت میں استادوں اور شاگردوں کا باہمی تعلق بھی خوف کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور ان میں باہمی رفاقت اور اعتماد کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا جو تعلیم و تربیت کی کامیابی کے لئے ایک شرط لازم ہے۔ خصوصاً بلوغ کے پُرآشوب زمانے میں جب نوجوانوں کو ہر قسم کی مذہبی اور جذباتی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ طلبا اپنے استادوں پر بھروسہ کرتے ہوں اور استاد محبت اور ہمدردی کے ساتھ زندگی کے اس کٹھن دور میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔ جب تک ہمارے تمام سماجی اور اجتماعی اداروں کی بنیاد رفاقت اور اعتماد کے جذبات پر نہیں رکھی جائے گی ہماری زندگی میں اطمینان اور خوشگواری نہیں پیدا ہو سکتی۔ میں اس اصول کو پوری ذمہ داری کے ساتھ بیان کر رہا ہوں اور یہ جانتے ہوئے بیان کر رہا ہوں اور یہ جانتے ہوئے بیان کر رہا ہوں کہ اکثر لوگوں کی رائے میں سوسائٹی اور اس کے تمام اداروں کی شیرازہ بندی محض قوت اور جبر کے ذریعے ممکن ہے لیکن [illegible] اور انسانیت کی طرف سے مایوس لوگ ہیں جو ایک بہتر سماج کی تعمیر میں حائل ہیں۔ [illegible] اور جبر کی شیرازہ بندی کا جو نتیجہ ہے وہ ہم سب کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے! تعلیم کا سب سے بڑا مقصد اور معلم کا سب سے بڑا فرض ہی یہ ہے کہ وہ قوت کے بجائے آشتی اور جبر کے بجائے دوستی اور محبت کا بیج بوئے اور سماج کو زیادہ صالح اصولوں پر تعمیر کرے! اور اگر اس نئی ذہنیت کی تعمیر تعلیم کے میدان میں اور اس کا اظہار اس کے کارکنوں کے باہمی مراسم میں نہیں ہو سکتا تو پھر اس کا کہیں بھی امکان نہیں ہے! آخر لوگوں میں تنخواہ اور منصب کے فرق کی اہمیت ہی کیا ہے؟ یہ فرق اس مشترک انسانیت کے مقابلے میں کیا حقیقت رکھتا ہے جو سب

انسانوں کو ایک رشتے میں باندھے ہوئے ہے اور بقول میرے ایک دوست کے، استادوں کی نگاہوں میں اس تمام فرق مراتب کی کیا حیثیت ہے!

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میری سب سے بڑی خواہش یہ رہی ہے کہ استادوں کے مادی اور سماجی معیار کو بلند کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں پہلی بات یہ ہے کہ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس بارے میں حکومت نے قابل قدر اقدام کیا ہے اور پہلے ۱۹۴۵ء کی تنظیم جدید کے سلسلے میں استادوں (خصوصاً ابتدائی مدرسوں کے استادوں) کی تنخواہیں بڑھائی گئیں اور یہ حال میں جو کمیٹی تنخواہوں کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اس نے بھی ہمدردی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کی سفارشوں کا نتیجہ استادوں کے حق میں خاصا اچھا نکلیگا میری نظر میں تو یہ تنخواہیں بھی ان کے کام کی حقیقی اہمیت اور آج کل کی گرانی کے پیش نظر ناکافی ہیں لیکن بہرحال چند سال پہلے کے مقابلے میں غنیمت ہیں اور ایک صحیح پالیسی کا اظہار ہیں اگر اب بھی یہ کم ہیں تو سمجھ لیجئے کہ ہم سب کو اس بدنصیب ملک میں پیدا ہونے کی کچھ قیمت بھی تو ادا کرنی چاہیئے۔

اس ضمن میں دوسرا کام یہ ہے کہ استادوں کی سماجی حیثیت کو بلند کیا جائے اس بارے میں میں نے حکومت کے اراکین اور پبلک کے نمائندوں سے بار بار تبادلۂ خیال کیا ہے اور انھیں بتایا ہے کہ ہمیں ہر ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہیئے جس کی مدد سے ہم قوموں کی نظر میں اور خود استادوں کی نظر میں ان کی عزت کو بڑھا سکیں اور بہت سی ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جس میں روپیہ کا خرچ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس مقصد سے استادوں کا ایک خاص دربار اعلیحضرت کی صدارت میں منعقد کیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے مختلف موقعوں پر استادوں کی حیثیت کا اعتراف کرنے کی کوشش کی گئی۔ محکمہ کے افسران کو ہدایت کی گئی کہ وہ تمام استادوں سے دوستوں اور ساتھیوں کا سا برتاؤ کریں۔ استادوں کی جو انجمن اس سال قائم ہوئی ہے اس کی ہمت افزائی بھی میں نے اسی خیال سے کی کہ وہ ان میں اجتماعی احساس پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بن سکتی ہے اور ممکن ہے کہ اس کی وساطت سے استاد نہ صرف اپنے مادی مفاد کا تحفظ کر سکیں بلکہ ان میں صنفی خودداری اور فرض شناسی بھی زیادہ مستحکم ہو سکے میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے مادی حقوق کا تحفظ ضرور

کریں لیکن ساتھ ہی یہ بات یاد رکھیں کہ تحفظ کی ایک بہترین صورت یہ بھی ہے کہ ہم اپنے کام کی خوبی سے ہر شخص کو متاثر کریں اور ان کا اعتماد حاصل کریں اپنی فنی قابلیت اور کارکردگی کو بہتر بنانا خود ہمارے بس کی بات ہے اس میں حکومت یا پبلک کی امداد اور مداخلت کی چنداں ضرورت نہیں ہے اگر ہم اپنی محنت، دیانتداری اور فرض شناسی سے پبلک کا بھروسا اور والدین کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ اگر ہم خلوص اور خدمت کے طلسم سے اپنے بچوں کے دل میں گھر کر سکیں تو ہمیں کسی چیز کے لئے گداگری نہ کرنی ہوگی بلکہ جن چیزوں کے ہم آج طالب ہیں وہ خود ہمارے پاس آئیں گی اور ان کے علاوہ ہمیں ایک ایسا اطمینان حاصل ہوگا جس کی لذت کا شاید ہم میں سے بہت سے لوگ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ کیا آپ کو کہیں اس بات کا خیال آیا ہے کہ استادوں کی برادری کے پاس ایک ایسی قوت ہے جو کسی دوسری جماعت اور کسی دوسرے محکمے کے اراکین کے پاس نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے اور وہ آپ کے ہزاروں بچے ہیں جو آپ کے مدرسوں میں پڑھتے ہیں اگر آپ ان کی محبت اور عزت حاصل کر سکیں تو یہ سب گویا سوسائٹی میں آپ کے سفیر بن کر جائیں گے اور گھر گھر میں آپ کا خود بخود پروپیگنڈہ کریں گے۔ پراپیگنڈا کے لفظ سے آپ بدظن نہ ہوں مبارک ہے وہ پروپیگنڈا جس کی بنیاد صداقت اور خلوص پر رکھی جائے اور جس کے کرنیوالے استادوں کے قدردان اور احسان شناس طالب علم ہوں۔ ان سفیران محبت سے کام لینا آپ کے لئے سعادت بھی ہے اور تقویت بھی ہے۔ کاش آپ ایسا کر سکیں!

استادوں کی فنی تربیت کے لئے محکمہ نے بھی بعض خاص اقدام کئے ہیں جن کی طرف آپ نے ایڈریس میں اشارہ کیا ہے اور جن سے فائدہ اٹھانا آپکا فرض ہے۔ اس سلسلے میں ٹریننگ سکول کی تنظیم جدید، ملازم اساتذہ کی مزید ٹریننگ، استادوں کے کتب خانے کا قیام، رسالہ تعلیم جدید کا اجرا، استادوں کی کانفرنسیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ کسی ادارہ کو قائم کر دینا آسان ہے اور اس کو کامیابی کے ساتھ چلانا مشکل ہے اور یہ کامیابی تمام تر آپ کی دلچسپی اور اشتراک عمل پر منحصر ہے آپ ان سے فائدہ اٹھائیے، ان کے ذریعہ تبادلہ خیال اور بحث و مباحثہ کیجئے۔ اپنے مسئلوں کا حل سوچئے۔ آوازہ جوش دروں ہی سے بلند ہونا چاہیئے۔ اس بارے میں مجھے اپنی ملک اور قوم کی کم مائگی کا احساس اس وقت ہوا کرتا ہے جب میں ہندستانی استادوں کی حالت کا موازنہ انگریز استادوں کی حالت سے کرتا ہوں اسوقت

رشک اور افسوس کے ملے جلے جذبات میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی تنظیم ان کی خودداری ان کا قومی مفاد کا پاس، ان کے تعلیمی رسالے، ان کے بحث و مباحثے دیکھ کر اور سن کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک زندہ جماعت ہیں اور ایک زندہ قوم کا جزو ہیں۔ اگر اُن کے ہاں کوئی تعلیمی کوتاہی ہوتی ہے یا تعلیمی پروگرام کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو ان کی پارلیمنٹ، اُن کے اخبار، ان کی سیاسی جماعتیں اور تعلیمی انجمنیں سب کی سب اس طرح اس میں دلچسپی لیتی ہیں گویا دراصل قوم کی زندگی کا انحصار اس مسئلے کے صحیح حل پر ہے۔ اس حال میں ٹرینڈ استادوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے انگلستان میں بہت سی عارضی درسگاہیں (Emergency Training Colleges) قائم کی گئی ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کو دیکھا اور بعض کا حال پڑھا ہے۔ ان میں کس قدر زندگی ہے! کس قدر واقفیت ہے کس قدر جیتا جاگتا احساس ہے کہ وہ ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں! اس حالت کو دیکھ کر مجھے بے ساختہ خیال ہوتا ہے کہ

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

اور اس وجہ سے میں ان چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے مطمئن نہیں ہوتا جو ہمیں اپنی کوشش میں ہوتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ آپ اپنی امنگوں اور حوصلوں کا رشتہ تاروں کے ساتھ جوڑیں۔ سڑک کی روشنیوں پر قانع نہ ہوں!

میں نے ابھی حال میں ریاست کی تعلیمی پالیسی کے متعلق حکومت کے ارکین سے تبادلۂ خیال کیا تھا۔ کیونکہ میری خواہش ہے کہ میرے جانے کے بعد بھی پالیسی کا تسلسل قائم رہے میں نے ان کو یہ بتایا تھا کہ اگر ریاست تعلیمی نیک نامی اور شہرت حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کے دو طریقے ہیں ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں جلد سے جلد تعلیم کو اس قدر عام کر دیا جائے کہ چند سال کے اندر اندر بچوں اور بالغوں کی ناخواندگی دور ہو جائے اور ہم اس بات پر فخر کر سکیں کہ ریاست میں خواندگی کی شرح بہت اونچی ہو گئی ہے لیکن اس مقصد کے لئے بہت کافی تعداد میں نئے مدرسے اور تعلیم بالغان کے مرکز قائم کرنے ہوں گے جس کے لئے شاید اس وقت ریاست کے مالی حالات ساعد نہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم حسب گنجائش نئے مدرسے اور مرکز کھولتے رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے ایسے ادارے قائم کریں جن کی بدولت نہ صرف ریاست کے دوسرے مدرسوں پر اچھا اثر پڑے بلکہ وہ بیرونِ ریاست میں قدر کی نگاہ سے دیکھے اور

قابلِ تقلید سمجھے جائیں۔ اسی خیال سے میں نے بعض خاص ادارے گذشتہ دو سال میں قائم کئے ہیں۔ مثلاً عوام کا کالج، ماڈل اسکول، بچوں اور استادوں کے کتاب خانے جو بحیثیتِ مجموعی خاص کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں اور انھوں نے ایک حد تک استادوں طلبہ اور شہر کے بالغوں کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کو مالامال کرنے میں حصہ لیا ہے ان کو قائم رکھنا حکومت کا اور ان کو کامیابی کے ساتھ چلانا آپکا فرض ہے۔ مجھے اس بات کے اعلان میں خوشی ہے کہ حکومت نے اس خیال سے اتفاق کیا ہے اور میں نے آپکے تعاون اور اعتماد کی بنا پر آپ کی طرف سے حکومت کو اطمینان دلایا ہے کہ آپ ان چند اداروں کو جوش، استقلال اور سمجھداری کے ساتھ چلائیں گے۔ اور اس طرح ریاست کی نیک نامی میں اضافہ کریں گے۔

حضرات! میں نے آپکا بہت وقت لیا لیکن میرے خیال میں آپکے خلوص اور محبت کا بہترین اعتراف یہی ہو سکتا تھا کہ میں اپنے بعض پُرخلوص خیالات آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ آخر میں آپ سے مجھے یہ اور عرض کرنا ہے کہ خواہ آپ اسے محسوس کریں یا نہ کریں آپ پر اسوقت ایک بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ آپکے پیش روؤں سے کہیں زیادہ ہم لوگ ایک نہایت پُرآشوب زمانہ سے گذر رہے ہیں۔ پُرانی تہذیب و تمدن، پُرانی سیاست اور معاشرت کے سانچے بہت سے ٹوٹ چکے اور بہت سے ٹوٹ رہے ہیں، پُرانی قدریں بدل رہی ہیں اور بہت سی وہ قدریں جن کو ہمارے بزرگوں اور مصلحوں نے ہمیں سکھایا تھا شرافت اور وضعداری، انسانیت اور رواداری نرغے میں آگئی ہیں، تعصب اور تنگ نظری، قتل وغارت اور فساد اور تاریکی کی دوسری قوتوں نے اپنا سر اٹھایا ہے۔ اس یورش میں، اس آندھی میں یہ اندیشہ ہے کہ یہ تمام چراغ جو ہماری تہذیب نے روشن کئے تھے بجھ جائیں گے اور ہم دوبارہ حیوانیت کی منزل کے قریب پہونچ جائیں گے۔ ان چراغوں کو روشن رکھنا ہماری ملکی اور ملی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے اور اس فرض کو انجام دینا سب سے پہلے ہمارے معلموں کا کام ہے۔ میں نے حال ہی میں اپنے کچھ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جس کا نام میں نے اس کے موضوع کی مناسبت سے "آندھی میں چراغ" رکھا ہے اور اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کون سے چراغ ہیں اور ان کی حفاظت کس طرح کی جاسکتی ہے۔

ممکن ہے آپ میں سے بعض حضرات یہ خیال کرتے ہوں کہ ہم اس میں کیا کرسکتے ہیں! آپ سے میری استدعا ہے کہ خدارا ایسا احساس کمتری کو دور کیجئے۔ آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ اگر آپ عقل اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہوں۔ مانا کہ آپ مفلس ہیں لیکن کوئی مفلسی عقل اور ایمان کی مفلسی سے بڑھ کر نہیں اور سوسائٹی میں بہت سی جماعتیں ایسی ہیں جو اس اعتبار سے آپکے مقابلے میں کہیں زیادہ مفلس ہیں۔ آپ دولت میں، رسوخ میں، ایذارسانی میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ لیکن اگر آپ اپنے منصب کے اہل ہیں تو آپ کا فکر، آپکا جذبۂ انسانیت، آپکا اخلاق ان سے کہیں بلند ہونا چاہیئے اور آپ ان کی بدولت ان چراغوں کو روشن رکھنے میں سب سے زیادہ کام کرسکتے ہیں۔ شاعر نے انسان کی شان میں جو بات کہی ہے وہ میرے خیال میں استادوں پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی　　　خبر نہیں کہ تو نوری ہے یا کہ ہے خاکی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن　　　تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے　　　ہزار ہوش سے خوشتر تری شکرخوابی

ممکن ہے ان الفاظ کو سن کر آپ یا آپکے بعض مہمان چونکیں۔ کیا ان استادوں کے لئے جن کے چہروں پر وقت کے ظالم ہاتھ نے قبل از وقت جھریاں ڈال دی ہیں، جن کی کمر کو صحت کی خرابی نے بڑھاپے سے پہلے ہی خم کردیا ہے جن کو معاش کی فکر نے مسرت اور فراغت اور اطمینان سے محروم کردیا ہے۔ کیا ان استادوں کے لئے کوکبی و مہتابی کے الفاظ تمسخر معلوم نہیں ہوتے؟ بے شک ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر یہ الفاظ بے عمل معلوم ہوں گے لیکن نگاہِ حقیقت شناس وہ ہے جو ان گڑھ پتھر میں حسین مجسمے کو اور خذف کی آغوش میں موتی کو خوابیدہ دیکھتی ہے۔ اور اگر ہماری سماج میں یہ نظر پیدا ہو جائے تو اسے انہیں سماجی مزدوروں میں ایک بہتر مستقبل کے معمار دکھائی دیں گے۔ خدا آپ کو توفیق دے کہ آپ اس خوب تر مستقبل کے جہاد میں شایانِ شان حصہ لے سکیں۔ اچھا اب خداحافظ! آپ نے میرے ساتھ جس رفاقت کا سلوک کیا ہے۔ اور مجھے یہاں بلا کر جس طرح میری عزت افزائی کی ہے۔ اس کا میں خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تعلیمی مضامین

سماج اور نوجوان

کارل مان ہائیم ان جرمنوں کے، جسے ہٹلر نے ۱۹۳۳ء میں ختم کر دیا تھا، ممتاز علماء میں سے تھے۔ فرانک فورٹ یونیورسٹی میں استاد تھے۔ سیاسی اقتدار نے جب علمی آزادی پر حد بندیاں شروع کیں تو مان ہائیم نے ترکِ وطن کا فیصلہ کیا۔ لندن جب کر درس اور تصنیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ حال ہی میں لندن یونیورسٹی میں انھیں تعلیما پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ نوجوان انگریزوں کے طرزِ فکر پر شاید ہی کسی زندہ انگریز عالم کا اتنا اثر ہو جتنا کہ مان ہائیم کا۔ ابھی حال ہی میں ۵۴ سال کی عمر میں انتقال کیا تو تمام علمی حلقوں میں جو ماتم بپا ہوا اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذہنی کام کی مملکت سیاسی حدود سے زیادہ وسیع ہے اور جسے کچھ کہنا ہوتا ہے اس کو سننے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ ہم ذیل میں انکی مشہور تصنیف (ترجمہ وقت کی تشخیص) کا ایک اقتباس، جس کا ترجمہ جناب جاں علی خاں صاحب نے کیا ہے۔ درج کرتے ہیں۔ (مدیر)

جدید سماج میں نوجوانوں کے مسئلے کے دو پہلو ہیں جنھیں دو سوالوں کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے (۱) نوجوان ہمیں کیا دے سکتے ہیں؟ (۲) نوجوان ہم سے کیا توقع کر سکتے ہیں؟ اس جگہ میں صرف پہلے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرونگا۔ یعنی اس کا کہ سماج میں نوجوانوں کی اہمیت کیا ہے اور نوجوان سماج کی زندگی میں کیا

خاص خدمت انجام دیتے ہیں۔

ان سوالوں کے اندازی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے مسئلے پر عمرانی نظر و لحاظ بے ایک نئی چیز ہے۔ ایک ماہر عمرانیات تعلیم اور تدریس کو وقت اور حالات سے بے تعلق چیز نہیں سمجھتا۔ بلکہ سماج کی موجودہ حالت کا پورا پورا لحاظ رکھتا ہے اس لئے کہ نوجوان بہرحال اس میں رہتے بستے ہیں اور اسی کی زندگی کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ بے شک تعلیم کی نفسیات اور عمرانیات میں بعض ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو عام ہیں لیکن تصویر پوری تب ہی ہوتی ہے کہ اس عام نقطۂ نظر کی تکمیل اس تاریخی پس منظر سے کی جائے، جس میں نوجوانوں کو کام کرنا ہے۔ عمرانی نقطۂ نظر کی دوسری ندرت یہ ہے کہ یہ سماج اور نوجوانوں کو پوری طرح ایک دوسرے پر اثر انداز مانتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ سوال ہو کہ نوجوانوں کو کیا سکھایا جائے اور کیسے سکھایا جائے تو اس کا جواب زیادہ تر اس پر منحصر ہوگا کہ آپ نوجوانوں سے توقعات کیا رکھتے ہیں۔؟ سماجی احساس کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے اب یہ نہیں ہوتا کہ ہم یونہی خلا میں نوجوانوں کی ضرورتوں کا تعین کردیں بلکہ ہمیشہ کسی خاص سماج کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ تعین کیا جاتا ہے۔ پچھلے دس بیس سال کی تعلیمی تحریکوں میں ہر چند کہ پہلی بار ان میں نوجوانوں کے حقوق اور سچے مطالبوں کا لحاظ رکھا گیا تھا، یہ کمی پھر بھی تھی کہ وہ محدود اور یک طرفہ تھیں اور نوجوانوں کے حقوق پر زیادہ زور دیتی تھیں اور سماج کے مطالبوں اور مقصدوں پر پوری توجہ نہیں کرتی تھیں جدید تعلیمی تحریک اور اس کے تجربی مدرسوں کا سلوک بچوں کے ساتھ ایسا تھا جیسے دولت مند ماں باپ کا ہوا کرتا ہے۔ انھیں بس یہ خیال رہتا ہے کہ بچے کی زندگی کو جس طرح بھی ہوسکے خوش گوار اور سہل بنایا جائے۔ ہر آرام پہ اسکے لئے سب کچھ فراہم کردیا جائے۔ اور یوں وہ اپنے لاڈ پیار سے بچوں کو بگاڑتے ہیں اور ان میں ناموافق حالات سے دوچار ہونے کی صلاحیت کو کم کرتے جاتے ہیں۔

"بچے کی صدی" میں یہ عقیدہ عام تھا کہ زندگی کا ہر زمانہ خود مکتفی ہوتا ہے اور اپنے مخصوص حقوق رکھتا ہے اور اس لئے لوگوں کی نظر اس حقیقت سے ہٹی رہی کہ مختلف عمر والے طبقوں اور سماج میں عمل اور رد عمل کا باہمی رشتہ بھی ہوتا ہے جو کسی اح

ان حقوق مخصوص سے کم اہم نہیں ہوگا

حکم پر چلانے والی پرانی تعلیم بچوں کے حیاتی اور نفسیاتی تقاضوں سے نا آشنا تھی تو لبرل مکتب خیال "جو ہوتا ہے سو ہونے دو" کے اصول نے فرد اور جماعت کے تعلق کا باہمی توازن بگاڑ دیا اور اپنی نظر کو ہر طرف سے ہٹا کر بس فرد پر جما دیا اور جس سماج میں فرد کو اپنا کام کرنا ہے۔ اس کی طرف سے نگاہ بالکل پھیر لی۔

اس ضمن میں پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ سماج میں نوجوانوں کی اہمیت ہمیشہ ایک سی ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں ہوتی۔ ایسے معاشرے بھی ہوتے ہیں جن میں معمر لوگوں کو نوجوانوں سے بہت زیادہ وقار اور اقتدار حاصل ہوتا ہے اور نوجوانوں کا مشکل ہی سے کچھ وزن مانا جاتا ہے۔ مثلاً قدیم چینی سماج اور ایسے معاشرے بھی ہوتے ہیں۔ جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ جس میں چالیس سال سے اوپر کا آدمی مشکل سے کسی کام کا سمجھا جاتا ہے اور اس میں جو کچھ ہیں بس نوجوان ہی ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ نوجوانوں کی قدر و منزلت کے باب میں معاشرے باہم مختلف ہوتے ہیں بلکہ ان میں اس اعتبار سے بھی بہت اختلاف ہوتا ہے کہ آیا جماعت کے نوجوان کسی ایسی تحریک میں متحد اور مجتمع بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو واقعات کے رخ کو متاثر کر سکے۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی میں نوجوانوں کی ایک تحریک خود بخود اٹھی اور جو گروہ اور جو ادارے اس وقت جرمنی میں برسر اقتدار تھے انھوں نے نہ اس کی مدد کی نہ اسے پسند کیا۔ اس وقت انگلستان میں ایسی کوئی تحریک نہیں اٹھی۔ البتہ فرانس میں ایک ایسی ہی تحریک شروع ہوئی لیکن مقابلتاً بہت چھوٹے پیمانے پر۔ روس میں نازی، جرمنی میں فاسسٹی، اٹلی میں جاپان میں حکومت کے اجارے کی شکل میں واضح طور پر عسکری قسم کے نظام نوجوانوں کے موجود تھے۔ انگلستان اور دوسرے جمہوری ملکوں میں اس کے مقابلے کی کوئی چیز نہ تھی۔ عمرانی مسئلہ یہ ہے کہ ہر چند کہ نئی نسلیں برابر ابھرتی ہیں یعنی کم عمر والے برابر بڑھ کر نوجوان ہوتے رہتے ہیں پھر بھی اس کا انحصار معاشرے کی نوعیت پر ہے کہ وہ اس ابھرتے ہوئے گروہ سے کچھ کام لیتا ہے یا نہیں لیتا اور اسی معاشرے کی عمرانی ساخت پر منحصر ہے یہ بات کہ وہ ان سے کام لیتا ہے تو کیسے لیتا ہے؟ شباب ان مخفی، محفوظ قوتوں میں سے ہے جو معاشرے کے پاس ہوتی ہیں اور جن کے بروئے کار لانے پر اس کی قوت اور توانائی کا انحصار ہوتا ہے

اس بیان کی صحت کو سمجھنے کا موقع جنگ سے بہتر کبھی نہ تھا کہ جنگ میں تو ملکوں کا بقا اس پر منحصر تھا کہ اپنے پوشیدہ محفوظ وسائل کو کس طرح مجتمع کرکے کام میں لاتے ہیں۔ جنگ میں فتح اس پر منحصر ہوتی ہے کہ آخری بے کار آدمی کو کام سے لگا دیا جائے عورتوں کو صنعتی کام میں لگایا جائے۔ سرمایے کو پوری طرح استعمال میں لایا جائے اسی طرح فتح اس پر بھی اتنی ہی منحصر ہے کہ انسانی دماغ میں یا قوم میں نفسیاتی قوتوں کا جو محفوظ سرمایہ ہے اس کا پورا پورا استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں جسم اجتماعی اور جسم انسانی کی تمثیل کو ہم بہت دور تک لے جا سکتے ہیں، علم وظائف الاعضاء کے ماہر بتاتے ہیں کہ کوئی عضو معمولاً اپنی صلاحیت کا آٹھواں حصہ کام میں لاتا ہے، آٹھ میں سے سات حصے اس کی قوت کے محفوظ رہتے ہیں۔ معمولی حالات میں یہ سات حصے بس بالقوۃ موجود ہوتے ہیں لیکن اگر یکایک کوئی آفت در پڑ جائے یا اعضاء کے باہمی روابط میں کوئی نیا قانون پیدا کرنے کی ضرورت پیدا ہو جائے تو اس وقت بدن کا زندہ رہنا اس پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ان پوشیدہ وسائل کو صحیح طور پر اور جلد ہی کام میں لے آئے۔ اس کا اندازہ لگا لینا چنداں دشوار نہیں کہ وہ کون سے معاشرے ہیں جن میں اقتدار زیادہ عمر والوں کا ہوتا ہے اور جن میں شباب کی حیات آفرینیاں بس بالقوۃ موجود ہوتی ہے اور کسی تحریک کی شکل میں متحد ہو کر سامنے نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ جن معاشروں میں جمود ہوتا ہے جن کی تبدیلی کی رفتار مقابلتاً سست ہوتی ہے وہ زیادہ تر بڑی عمر والوں کے تجربے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ شباب کے امکانات مضمر کی ہمت افزائی کرکے انہیں ابھارنے میں تامل کرتے ہیں، ان کے یہاں تعلیم کے معنی ہوتے ہیں روایات کو منتقل کرنا ان کا طریقۂ تعلیم زیادہ تر تکرار اور اعادے پر مشتمل ہوتا ہے نشاط کے حیاتی اور روحانی وسائل کی طرف سے انکی نظر بالارادہ ہٹی رہتی ہے اور معاشرے کے موجودہ رجحانات کا مقابلہ کرنے یا انہیں روکنے کا ارادہ بھی مفقود ہوتا ہے۔

ان جامد یا آہستہ آہستہ بدلنے والے معاشروں کے مقابلے میں وہ معاشرے ہیں جو حرکت پسند ہوتے ہیں، جو نئی منزلیں طے کرنے کے ارادے رکھتے ہیں یہ معاشرے ان کا معاشرتی اور سیاسی فلسفہ کچھ بھی ہو زیادہ تر نوجوانوں کے تعاون پر بھروسہ

کرتے ہیں۔ یہ اپنے سب حیاتی وسائل کو منظم کرتے ہیں۔ اور انھیں جماعتی نشوونما کی مقررہ سمت کے بدلنے میں کام میں لاتے ہیں۔ اس باب میں ان جماعتوں میں جو تغیر کو انقلاب کے ذریعہ لانا چاہتے ہیں اور ان میں جو اصلاحات کے ذریعہ اس کی تبدیل نکالنا چاہتے ہیں۔ بس شدت کا فرق ہے۔ دونوں حالتوں میں جب بھی کوئی نئی راہ کھولنی ہوتی ہے تو کام نوجوانوں کو ہی کرنا ہوتا ہے۔ بوڑھے، ادھیڑ عمر والے آنیوالے تغیرات کی ماہیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، اُن کا تعمیری تخیل نئی راہوں کے معین کرنے میں کام میں آسکتا ہے، لیکن نئی زندگی کو بنتے نوجوان ہی ہیں۔ جن قدروں کو بوڑھے نظری طور پر مانتے ہیں انھیں نوجوان عملی طور پر زندگی میں پورا کرتے ہیں۔ اگر یہ سب صحیح ہے تو پھر نوجوانوں کا مخصوص وظیفہ اسی نئی زندگی کا پیدا کرنا ہے۔ شباب وہ قوتِ محفوظ ہے جو اس وقت سامنے آتی ہے جب تجدیدِ حیات کی ضرورت ہوتی ہے اور جلد جلد بدلنے والے یا مطلق نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔

اِس قوتِ محفوظ کا مجتمع ہونا اور بروئے کار آنا بھی بہت کچھ اسی طرح ہوتا ہے جیسے جسمِ انسانی میں حیاتیاتِ جدید کے ماہرین کا خیال ہے کہ سب سے اہم حیاتیاتی تغیر یہ ہے کہ اضطراری عمل مستقل وظیفہ بن جائے، مثلاً بچہ طرح طرح کی بے ترتیب حرکات کرتا ہے جن میں فی نفسہ کوئی معنی نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ اس کی فراواں قوتِ حیات کا اظہار ان سے ہوتا ہے۔ نشوونما، تجربہ، تربیت اور تعلیم سے ربط کی منزلیں طے کرکے یہ حرکتیں مستقل وظائف کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں، یہی حال جماعت کا ہے۔ معاشری زندگی میں بھی بہت سی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو کام میں نہیں آتیں۔ احساسات، جذبات اور خیالات معاشرے کے لئے اہمیت اس وقت حاصل کرتے ہیں۔ جب یہ مربوط ہو کر مجتمع ہو جائیں۔ اس کی ایک مثال دوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ میں سب سے بڑا ظلم غلاموں پر نہیں ہوا، نہ زرخرید کسانوں پر، نہ مزدوروں پر بلکہ سب سے بڑا ظلم پدری نظام والی جماعتوں میں عورتوں پر ہوا ہے لیکن ان عورتوں کی تمام تکالیف اور ان کی ساری ناخوشی و ناراضگی ہزارہا سال تک بے معنی اور غیر اسم رہی، یعنی اُس وقت تک جب تک کہ یہ لاکھوں انفرادی عورتوں کی الگ الگ تکلیفیں تھیں، لیکن ان کی اس بےچینی نے فوراً ایک تخلیقی معاشری اہمیت حاصل کر لی۔ جب سفریجٹ تحریک میں ان تکالیف اور ان جذبات

ناراضی کو مجتمع کر کے ایک مستقل حیثیت دے دی گئی۔ اور اس تحریک نے جدید معاشرے میں عورت کے مقام اور اس کے وظیفے سے متعلق سارے تصورات کو بالکل نئے سرے سے ترتیب دیا۔ اس طرح نیم غلام کسانوں، غلاموں اور مزدوروں کے مظلوم طبقوں کی ناراضگیاں معاشرتی اعتبار سے ناقابل اعتنا رہیں جب تک وہ الگ الگ افراد کی ناراضگیاں اور مصیبتیں تھیں۔ جب یہ جذبات مجتمع ہوئے اور ایک تحریک شروع ہوئی جو صرف تلخی کا اظہار نہ کرتی تھی بلکہ تعمیری تنقید کی ایک نئی بنیاد بھی پیش کرتی تھی کہ یہ بے ترتیب احساسات اور اعمال ایک اجتماعی وظیفے کی شکل میں مبدل ہو گئے۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجتماع اور تفرید کی معین صورتوں میں ہی مخفی قوتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور تخلیقی طور پر انہیں معاشرے کی زندگی میں کارفرما بنایا جا سکتا ہے۔ ہم معاشرے میں نوجوانوں کی اہمیت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو یہ سوال کرنا بہت اہم ہے کہ نوجوان جس قوت کی نشانی ہیں اس کی اہمیت کیا ہے۔ اور اس قوتِ محفوظ کو تفرید کی کن شکلوں کے ذریعہ ایک مستقل وظیفے میں بدلا جا سکتا ہے؟ یا اس کو سہل زبان میں کہیں تو سوال یہ ہے کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ نوجوان تجدید حیات کا ذریعہ ہیں تو اس سے واقعی مراد کیا ہے۔

جواب میں پہلے ہی قدم پر ایک گڑھا سا منے آتا ہے۔ جب میں جوان تھا تو عام طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ نوجوان فطرۃً ترقی پسند ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں یہ خیال دھوکا ثابت ہو چکا ہے اس لئے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ قدامت پسند بلکہ رجعت پسند جماعتیں بھی اپنی اپنی نوجوان تحریکیں منظم کر سکتی ہیں۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ معاشرتی زندگی میں نوجوانوں کا کام تجدید حیات کا کام ہے تو ہمیں صاف طور پر بتانا چاہیئے کہ شباب کے وہ کون عناصر ہیں جنھیں مجتمع کر لیا جائے تو وہ معاشرے کو ایک نئی راہ کھولنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

ہمارے نقطۂ نظر سے نوجوانوں کی جو صفت انھیں معاشرے میں جدت آفرینی کی صلاحیت بخشتی ہے۔ وہ علاوہ ان کی حوصلہ مندی کے یہ ہے کہ وہ ابھی موجودہ نظام معاشرت کے ساتھ پوری طرح وابستہ نہیں ہوئے ہیں، جدید نفسیات نے اور عمرانیات نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ جدید نوجوانوں کی ذہنیت کو سمجھنے کی کنجی صرف ان حیاتیاتی ہیجان میں نہیں مل سکتی جو اس منزلِ نشو ونما کا خاصّہ ہے۔ یہ بات تو بہرحال عام ہے اور زمان و مکان کی حدود سے باہر ہے۔ بلوغ کی عمر کے متعلق فیصلہ کن بات یہ ہے کہ نوجوان

اس وقت عام زندگی کا شریک بنتا ہے اور جدید معاشرے میں یہی دقت ہوتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ متضاد اقدار کے انتشار سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابتدائی قسم کے معاشروں میں ہمارے نوجوانوں کی سی ذہنی کشاکش کا وجود نہیں ہوتا، اس لئے کہ جو قاعدے قانون خاندان نے سکھائے ہیں اور جو قاعدے قانون بڑوں کی دنیا میں رائج ہیں۔ ان میں کوئی بنیادی تفاوت یا تضاد نہیں ہوتا۔ ہمارے نوجوانوں میں تضاد کا جو شعور ہوتا ہے وہ دراصل ہماری عام زندگی کے انتشار کا عکس ہے اور جو پریشانی نوجوان کو ہوتی ہے وہ اس صورت حال میں ایک ناتجربہ کار ذہن کا فطری ردِ عمل ہے ہماری موجودہ بحث کے لئے یہ احساسِ تضاد اس قدر اہم نہیں جتنا کہ اسی چیز کا ایک دوسرا پہلو۔ ہمارے مسائل کے لئے اہم چیز یہ ہے کہ نوجوان ہمارے معاشرے کے تضاد سے جب آگاہ ہوتے ہیں تو گویا باہر سے یہی بات نوجوانوں کو معاشرے میں تبدیلی کا ہراول بناتی ہے۔

شباب فطری طور پر نہ ترقی پسند ہوتا ہے نہ قدامت پرست۔ وہ تو ایک امکان اور ایک صلاحیت ہے جو ہر نئے آغاز کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ بلوغ کی عمر تک بچہ زیادہ تر اپنے خاندان میں رہتا ہے اور اس کے ادیبے پر زیادہ تر وہ ذہنی اور جذباتی روایات اثر انداز ہوتی ہیں جو خاندان میں رائج ہوتی ہیں۔ بلوغ کے زمانے میں وہ اپنے ماحول سے پہلی بار تعلقات پیدا کرتا ہے، یعنی اپنی قوم سے اور اس کی پبلک زندگی کے مختلف شعبوں سے۔ یوں نوجوان یہی نہیں کہ حیاتیاتی طور پر ایک ہیجانی کیفیت میں پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ عمرانی اعتبار سے بھی وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہوتا ہے جس کے رسوم، عادات اور نظام ہائے اقدار ان سے مختلف ہیں جن سے وہ اب تک آشنا تھا اس کے لئے جو ایک نئی چیز ہے وہ بڑوں کے لئے عادت بن چکی ہے۔ ایسے نوجوان نئے فیصلوں پر اکساتی ہے، ان کے لئے معمولی روز مرہ ہے۔ یہ باہر سے، جیسے اجنبی معاشرے میں داخل ہونا نوجوان کے اندر زندہ جماعتی تحریکوں سے ہمدردی پیدا کر دیتا ہے جو کسی وجہ سے، اور اکثر خود اس کی وجہ سے مختلف وجوہ کی بنا پر موجودہ صورت حال سے غیر مطمئن ہوتی ہیں۔ نوجوانوں کے اغراض پہلے سے کسی کے ساتھ خاص طور پر وابستہ نہیں ہوتے، نہ معاشی اعتبار سے نہ عادات و اقدار کے لحاظ سے۔ زیادہ عمر والے لوگ جو پرانے معاشرے میں جم چکے ہیں ان کے اغراض بھی اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔

یہی بات ہو کر زمانۂ بلوغ اور شباب میں ایسے لوگ نہایت جوشیلے انقلابی یا مصلح ہوتے ہیں پھر یہی لوگ جب انہیں کوئی مقررہ کام مل جاتا ہے، نیا خاندان بنا لیتے ہیں تو ان کا رویہ مدافعانہ سا ہو جاتا ہے اور یہ موجودہ صورتِ حال کے مؤید بن جاتے ہیں۔ عمرانیات کی زبان میں جوان ہونے کے معنے ہیں معاشرے میں حاشیے کا انسان ہونا، اکثر اعتبارات سے باہر کا سا آدمی ہونا۔ مدرسے کے اونچے درجوں میں پڑھنے والے لڑکوں اور نوجوان طالب علموں کے رویے میں جو بات سب سے صاف دکھائی دیتی ہے وہ یہی ہے کہ موجودہ نظامِ معاشرت میں اُن کے کوئی وابستہ اغراض نہیں ہوتے اور اس میں انھیں جو حصہ لینا ہے وہ واضح طور پر نہیں ہوتا۔ میری رائے میں یہ باہر والا ہونا جوانی کے حیاتیاتی ہیجان سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس سے نوجوانوں میں ایک کھلا کھلاپن سا ہوتا ہے اور تغیر پذیری بھی۔ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ باہر والا ہونے کی صفت دوسرے باہر والے افراد اور گروہوں کے رویے سے مل جاتی ہے جو کسی اور وجہ سے معاشرے کے حاشیے پر ہوتے ہیں، جیسے اس کے مظلوم طبقے، اس کے اکھڑے ہوئے ذہنی طبقے۔ شاعر، آرٹسٹ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس باہر والا ہونے سے بھی ایک امکانی صلاحیت ہی پیدا ہوتی ہے اور اس بات کا انحصار کہ یہ امکانی صلاحیت دب جاتی ہے یا اسے مجتمع کر کے ایک تحریک بن جاتی ہے۔ اس پر منحصر ہے کہ باہر سے اس کو کسی قسم کی ہدایت اور کیسے اثرات سے سابقہ پڑتا ہے۔

اس عام بحث کے نتائج کا خلاصہ یہ ہے کہ نوجوان اُن مخفی محفوظ قوتوں میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہیں۔ جماعت کی ساخت پر اس کا انحصار ہے کہ یہ محفوظ قوتیں یا ان میں سے کون کون سی بدل کر ایک مستقل حیثیت اختیار کرتی ہیں۔ بالغ کو جو چیز خاص طور پر ایک نئے آغاز کے لئے مفید بناتی ہے وہ ہے کہ اس نے ابھی موجودہ نظام کو قبول نہیں کیا ہے اور معاشی یا روحانی زندگی میں اس کے کوئی اغراض اس سے پوری طرح وابستہ نہیں ہیں۔ جامد یا آہستہ آہستہ بدلنے والی جماعتوں میں ان قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ کبھی کبھی تو ان کو دبانے کی کوشش ہوتی ہے۔ متغیر معاشروں میں جلد یا بدیر یہ قوتیں آگے بڑھتی ہیں اور اکثر ان کو منظم کرنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔

سنگ و خشت

سُنیے ......!

یہ نہ سمجھئے گا کہ میں خطرہ کی گھنٹی بجانے والا ہوں نہیں نہیں۔ آپ جیسے ہوشیار اور جہاندیدہ کے لئے مجھ نحیف کی جانب سے خطرہ کی گھنٹی بھی ویسی ہی ہوگی جیسے "نقار خانہ میں طوطی کی آواز" مختصراً عرض یہ کرنا ہے کہ سنہ ۴۶-۴۷ء میں "تعلیم جدید" اپنے وقت پر نمودار ہوتا رہا۔ مئی جون بالکل غائب۔ جولائی بھی روپے میں چار آنہ گذر گیا...... حضرت! اگر اسال یہی سہولت پسندی کا عالم رہا تو بازار سے ساکھ چلی جائے گی......... ذرا اپنی قسمت کی قدر فرماتے رہیئے ......معاف کیجئے سمجھ میں بھی کچھ آگئی۔ اور آپ کو بلا تکلف لکھ مارا ....

احمد حسین۔ اسلامیہ انٹر کالج۔ ۸ جولائی سنہ ۴۷ء

آپ کی اختراع۔

برادرم سجاد صاحب۔ آپ اپنی اختراعات میں پہلے ہی سے مشہور ہیں "تعلیم جدید" کے صفحات پر نظر پڑی تو جدید کتر بیونت کے نمونے دکھائی دیئے۔ واللہ بھائی بنانا ہو تو جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی" رسالہ پڑھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ خریدنا تو ذرا مشکل ہے اگر ممکن ہو تو دو ایک ماہ بلا قیمت بھیجئے۔ پھر دیکھا جائیگا....... کالج کے ساتھیوں کو بھی دکھاؤں گا۔

قیصر مرزا۔ حلیم ڈگری کالج۔ کانپور

خواجہ صاحب کی روانگی کے اثرات!

عنوان سے آپ گھبرا گئے ہوں گے کہ "اثرات" کا مجمع آپ کو کسی انہونی حادثہ میں نہ ڈال دے ... میں آپ کو اس موضوع پر ایک تفصیلی خط لکھ کر استفسار واقعات چاہتا تھا مگر فی الحال اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ پوچھوں کیا "تعلیم جدید" میں جناب خواجہ غلام السیدین صاحب کے مضامین ہوا کریں گے یا نہیں۔ موصوف کا زور قلم دلکشی اور اسلوب بیان نرالا ہے۔ اس لئے جب تعلیم جدید آتا ہے آنکھیں پہلے ان کے مضمون کو تلاش کرتی ہیں۔

ناصر اسدی۔ سیتاپور

ریاست کی تعلیمی سرگرمیاں

ناقرا اسکول

(مشاغل کا گھنٹہ)

جدت طرازی اور تنوع پسندی بچوں کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ اپنی سیرتِ متبادلہ کی بنا پر ماحول کی یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے طریقہ ہائے تعلیم جن سے بچوں کے دماغوں پر بے جا اثر پڑے یا وہ کسی قسم کے بیرونی اثر سے مرعوب ہوکر با دل ناخواستہ کچھ سیکھنے یا حاصل کرنے پر مجبور کئے جائیں۔ بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں معاون نہیں ہوسکتے۔

بچوں کی نفسیات ان کے رجحانات و میلانات، ماحول اور طریق تعلیم میں کامل یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے بعد ہی ان کی انفرادی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اس لئے ایک کامیاب درس گاہ وہی ہے جہاں معلم اپنے خیالات۔ رجحانات اور ارادوں کی تکمیل کے لئے شعوری اور محسوس طریقوں سے بچوں کو مجبور نہ کریں بلکہ طلبا کے ذاتی تصورات اور نفسی رغبتوں کو ابھارکر ان کی صحیح تکمیل اور کامل نشو و نما کا سامان مہیا کر دیا جائے تاکہ فطرت اور عمل ایک مدارج ارتقا طے کرکے شخصیت کی تعمیر کرسکیں۔

ہم نے تعلیم و تدریس اور تفریحات و کھیل کے اوقات کو علیحدہ علیحدہ کرکے ان کے درمیان حد فاصل قائم نہیں کی بلکہ کھیل ہی کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ اور مناسب طریقوں سے کام لیکر تعلیم و تدریس کو کھیل بت شغل میں اس طرح سمو دیا کہ کم از کم طلبا کے لئے ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ طلبا درجے میں ہوں یا کھیل کے میدان

میں، تقریروں میں مشغول ہوں یا مباحثوں میں مصروف بچوں کی عدالت ہو رہی ہے یا انتظامیہ مجلس کی کارروائی۔ لائبریری میں کتب بینی ہو رہی ہو یا لائبریری سوسائٹی کے مشاغل میں انہماک ہر جگہ کھیل بھی ہے اور تعلیم بھی۔ آپ کو طلباء کے ہنستے چہرے، مسکراتی آنکھیں، خندہ پیشانیاں بھی بتائیں گی کہ وہ اپنے اپنے مخصوص رجحانات، میلانات اور طبعی رغبتوں کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اسی زندہ دل طریق کار کو زیادہ آب و رنگ دینے اور زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم نے ایک اور راہِ عمل بنائی ہے وہ یہ کہ ایک مخصوص وقت میں اسکول کے تمام بچوں کو اُن کے معیار اور رجحانات کے مطابق مختلف پروگراموں پر عمل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ یہ مخصوص وقت یا مقررہ گھنٹہ اسکول کے روزانہ پروگرام کا ایک مستقل جزو ہے جو مشاغل کا گھنٹہ کہلاتا ہے۔ اس گھنٹہ میں اسکول کے تمام درجات کے طلباء اور طالبات اپنے اپنے مجوزہ مقررہ کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں جس کی ترتیب و تنظیم اس طرح کی گئی ہے کہ اسکول کے تمام طلباء کی تعداد کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کرکے ہر گروہ کے لئے روزانہ کا علیحدہ علیحدہ پروگرام بنا دیا ہے تاکہ متنوع حالات اور متبادل مشاغل کی ندرت کے باعث طلباء کے لئے یہ ہر لحظہ دلچسپی کا سامان فراہم ہوتا رہے اور اجتماعی مشاغل میں بھی انفراد کارفرما رہے۔ اس طریقہ سے ہر گروہ کو روزانہ ایک ہی کام نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ ہر روز اس کا مشغلہ پچھلے دن سے علیحدہ اور نیا ہوتا ہے۔ اور ان مشاغل میں حرکت اور زندگی کی تڑپ قائم رہتی ہے۔ ان مشاغل میں اسکول کی تمام تدریسی و غیر تدریسی و ماوراء النصابی مصروفیات و مشغولیات شامل ہیں۔ اور مروجہ تعلیم کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اس طریقہ کار میں جہاں ذہنی تربیت کے ذرائع موجود ہیں وہاں دماغی فروغ کے اسباب بھی مہیا ہیں۔ جسمانی تربیت کے مشاغل ہیں تو اخلاقی تعلیم کے عناصر بھی اور سماجی تعلیم کے مساعی ہیں تو تمدنی اور تہذیبی ترقیاں بھی موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ ان مشاغل میں رنگا رنگی بھی ہے اور ہما ہمی بھی اور دلکشی بھی ہے۔ اور افادیت بھی۔ تفریح بھی ہے اور تعلیم بھی۔ گھنٹہ بجتے ہی اسکول کی مصروف و مشغول زندگی میں ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور بچوں کی ٹولیاں جس ذوق و شوق سے اس گھنٹہ میں کام کرتی ہیں اس کا اندازہ دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے، مسابقت اور مقابلے کے جوش خروش میں ہر ٹولی مسرت اور خوشی کے ساتھ اپنے اپنے مشغلے کی تکمیل کرتی ہے۔ اگر کوئی جماعت اسکول کی زینت و آرائش میں مصروف ہے تو کوئی گروپ اسکول کی صفائی میں لگا ہوا ہے ایک ٹولی سامنے میدان میں کھیل رہی ہے تو دوسری لائبریری میں مصروف مطالعہ ہے

کہیں بیت بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے تو کہیں نظم خوانی جاری ہے، کہیں مکالمہ ہو رہا ہے تو کہیں تقریروں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک طرف انڈور گیمس (فرشی کھیل) ہو رہے ہیں تو دوسری طرف فرسٹ ایڈ (ابتدائی امداد) کی تعلیم ایک جگہ اسکاؤٹنگ کے مشاغل ہیں تو دوسری جگہ ڈرل اور ورزش کے مظاہرے، کہیں باغبانی ہو رہی ہے تو کہیں ریڈ کراس کے کام۔ ایک گروپ سماجی خدمت میں مصروف ہے تو دوسرا اخلاقی تعلیم میں مختصر یہ کہ سرگرمی اور رنگا رنگی ہر صورت میں موجود ہے

یہ مشاغل کا گھنٹہ دراصل اس کی زندگی کو حقیقی اور معیاری زندگی بنانے کی ابتدائی کوشش ہے جس کی افادیت اور اہمیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ حرکت و عمل کے لئے بے چین اور بے تاب عناصر کو کشمکش حیات اور جہد و عمل کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ زندگی کی تڑپ کے ساتھ اپنے قوائے جسمانی و عقلی کو زندہ و متحرک رکھ سکیں۔ عملاً حقیقی زندگی کے مفہوم سے آشنا ہو جائیں اور آئندہ زندگی میں شائستگی و تمدن کے اعلیٰ عناصر بن کر ملک اور قوم کے بہترین افراد ثابت ہوں۔

مذکرۂ بالا اصول کی روشنی میں باقر ماڈل اسکول کو آغاز کار ہی سے ایک رسمی اور روایتی درس گاہ بنانے کے بجائے جوش و عمل کا گہوارہ اور طلباء کی دلچسپی اور مرغوبات نفسی کا مرکز بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اور خداوند تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہم اپنی درس گاہ کو نتائج کے اعتبار سے، جوش عمل سے سرشار اور جد و جہد میں سرگرم طلباء کا میدان عمل بنانے میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے اور ہم نے بچشم ظاہر معائنہ کر لیا کہ باقر اسکول کے تمام طلباء کی نظر میں ایام مشغولیت و تدریس تعطیل اور تفریح کے دنوں سے زیادہ دلچسپ اور مرغوب ہیں۔

ماڈل اسکول کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرف سے شاندار مظاہرہ

زیر صدارت عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر ۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو بوقت ۵ بجے شام ماڈل اسکول خسرو باغ کے بچوں کی ذہنی اور جسمانی ورزش کا ایک مظاہرہ ہوا۔ جس میں محکمۂ تعلیم کے افسران رضا کالج کے پروفیسران اور ٹریننگ اسکول کے پیوپل ٹیچرس کے علاوہ بچوں کے والدین اور سرپرستوں نے بھی حصہ لیا۔ معززین شہر نے بچوں کے علمی مشاغل اور ان کی ورزشوں کا گہری دلچسپی سے مظاہرہ کیا۔ جسمانی ورزشوں کے موقع پر جناب میجر سید ضمیر احمد صاحب نے بحیثیت اسٹارٹر کے اور جناب ڈاکٹر جمیل الرحمٰن خاں صاحب ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ و جناب سید اسرار حسین صاحب انسپکٹر مدارس نے بحیثیت جج کے کام کیا۔ ان حضرات کی عملی دلچسپیوں سے بچوں کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ آخر میں بچوں نے اپنا مخصوص قومی ترانہ سنایا۔ اور عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر نے انعامات تقسیم فرمائے

جناب ڈاکٹر جمیل الرحمٰن خاں صاحب نے مبلغ پچیس روپیہ کا انعام جونیر ریڈ کراس سوسائٹی فنڈ سے بچوں کو مرحمت فرمایا۔

ہیڈ ماسٹر ماڈل اسکول کی رپورٹ کے چند اقتباسات اور صاحب مشیر تعلیمات بہادر کی جوابی تقریر کے چند مخصوص اجزا ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ماڈل اسکول کی تعلیمی نمائشوں کے انعقاد کا مقصد یہ نہیں کہ آپ کو جمع کر کے "واہ" یا "آہ" کا خزینہ لبریز کیا جائے۔ میں نے بچوں کی تعلیم کی طرف سے ہندوستانی والدین کی بے اعتنائیوں کا اکثر جائزہ لیا ہے۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت سے گویا مستغنی نظر آتے ہیں۔ میں بچوں کی جانب سے شادیاں رچا کر مہمانداریوں کے ذریعہ والدین کو مسلسل بیدار رکھنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ بات بات پر ان کو تعلیمی مسائل میں اتحادِ عمل پر مجبور کرتا رہوں۔ میں بڑی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوں اور الحمدللہ میرے طلبا و طالبات کے والدین بالخصوص ان کی مائیں جو اسوقت بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں بچوں کی تعلیمی ترقیوں کا مشاہدہ فرمانے جلسہ میں تشریف لائی ہیں اکی صحیح

تعلیم میں میری رہنمائی فرماتی رہی ہیں۔ واضح ہو کہ مدرسہ سے ان کی دلچسپیوں میں تسلسل ہے اور اس اہم تسلسل کو قائم رکھنا میرا فرض ہے۔

آج کے مظاہروں کا خاکہ میرا تیار کردہ ہے لیکن اس پُر خلوص عمل اور اس کو کامیاب بنانے کا سہرا میرے استادوں کے سر ہے۔ ماڈل اسکول ایک گھر ہے جس گھر کا بقول شخصے سورث اعلیٰ ایں محدث ثانی میرے استاد اور خاندان کے دوسرے ممبر میرے ننھے ننھے معصوم طلباء و طالبات ہیں میرے اور میرے استادوں کے درمیان افسری و ماتحتی کچھ رسمی سی ہے، وہ میرے دکھ درد کے ساتھی اور میں ان کی خوشی و غم کا شریک۔

عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر! .... میں نے بہت سے اسباق زندگی میں سے یہ قیمتی سبق بھی آپ سے سیکھا ہے ....

مجھ سے اکثر والدین کی فرمائش ہے کہ میں حکومت سے اس مدرسہ کو اقامتی مدرسہ بنانے کی درخواست کروں .... میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں کہ جس وقت تک اس مدرسہ کو اقامتی مدرسہ نہ بنایا جائیگا۔ اس کی حقیقی کامیابی مشکل سے ہاتھ آسکے گی۔

.... عالی مرتبت صاحب مشیر تعلیمات بہادر نے ایک جامع تقریر فرمائی جس میں ماڈل اسکول کی تعلیم اور اس کے صحیح نصب العین کی تشریح فرماتے ہوئے فرمایا ......

میں ماڈل اسکول کے بچوں میں زندگی اور بیداری پاتا ہوں۔ ان پر کسی ناجائز دباؤ کا اثر نہیں معلوم ہوتا .... یہ آزاد ہیں اور اپنے کاموں کو خوش سلیقگی سے انجام دینے میں خوش و خرم ہیں۔ ان کے اور استادوں کے درمیان گہرا ربط ہے اور یہ رابطہ محبت و پیار کی حد تک ہے .... لوگوں نے تعلیم کو کتابوں تک محدود سمجھا ہے لیکن صحیح تعلیم وہ ہے جس کے چند نمونے اس وقت ماڈل اسکول کے بچوں نے پیش کئے۔ مجھے امید ہے کہ سجاد صاحب اور ان کے ساتھی تعلیمی کاموں کو گہری دلچسپی کے ساتھ برابر آگے بڑھاتے رہیں گے۔
